ماہنامہ پیام حرم جمداشاہی کے تاریخی، فکری، علمی اور دعوتی
اداریوں کا حسین مجموعہ

از

فروغ احمد اعظمی مصباحی

ایڈیٹر: ماہنامہ "پیام حرم" جمداشاہی
پرنسپل: دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی بستی

ترتیب:

مولانا غلام نبی علیمی

حسب فرمائش:

حضرت مولانا حافظ سراج احمد مصباحی
خطیب وامام مدینہ مسجد کیرلٹن ٹیکساس امریکہ

ناشر
المجمع النورانی (شعبہ تصنیف وتحقیق) دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی بستی یوپی

نام کتاب.......................نشان منزل

مصنف.......................ادیب شہیر حضرت علامہ فروغ احمد اعظمی مصباحی

صفحات.......................۲۱۶

طبع اول.......................ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ دسمبر ۲۰۰۸ء

ترتیب.......................غلام نبی علیمی

تصحیح.......................مولانا محب احمد علیمی قادری

ناشر.......................المجمع النورانی دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی ضلع بستی یوپی

معاون.......................حضرت مولانا حافظ سراج احمد مصباحی امریکہ

قیمت.......................۸۰

کتاب ملنے کے پتے

☆ المجمع النورانی دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی ضلع بستی یوپی

☆ علیمی کتب خانہ جمدا شاہی بستی یوپی

☆ المجمع الاسلامی ملت نگر مبارک پور اعظم گڑھ یوپی

☆ المجمع المصباحی مبارک پور اعظم گڑھ یوپی

☆ حق اکیڈمی مبارک پور اعظم گڑھ یوپی

☆ کتب خانہ امجدیہ پکہ بازار بستی یوپی

باسمہ تعالیٰ

فہرست عنوانات

انتساب

مورخ اسلام علامہ ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی مدظلہ العالی کے.................نام

جن کی درس گاہ فیض میں میں نے سہتا سہتا اردو زبان و ادب کی تعلیم و تربیت حاصل کی اور جنھوں نے بے پناہ شفقت کے ساتھ انگلی پکڑ کر اردو کی جولانگاہ میں چلایا ہی نہیں، بلکہ دوڑا بھی دیا۔

اور

مفکر اسلام، رئیس القلم علامہ یٰس اختر مصباحی مدظلہ العالی کے..................نام

جن کے فکر و قلم نے اہل سنت کے مذہبی ادب میں سنجیدہ فکری و تاریخی طرز تحریر کی بنیاد ڈالی جس کا بھرپور عکس میری ان زیر نظر اداری تحریروں پر بھی واضح طور سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

مولیٰ تعالیٰ میرے ان دونوں محسن اساتذہ کو تا دیر سلامت رکھے اور ان کی جامع اور شگفتہ و سنجیدہ تحریروں سے نو آموز اہل قلم کو زیادہ سے زیادہ فیض یاب کرتا رہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نیاز مند:

فروغ احمد اعظمی مصباحی

عرض مرتب

ادیب شہیر استاذ گرامی حضرت علامہ فروغ احمد اعظمی مصباحی مدظلہ العالی صدر الدرسین دار العلوم علیمیہ جمد اشاہی کی دینی، علمی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، حضرت اپنے گوناگوں دینی و ملی، علمی و فکری، تحریری و تصنیفی تحریکی و تنظیمی خدمات کی بدولت پورے برصغیر کے علمی حلقوں میں کافی مقبول و معتمد ہیں، حضرت کی شخصیت سے متعلق مجھ جیسے کمترو بے مایہ کی رائے زنی اور توصیف آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگی۔

ذیل کی سطور میں کتاب سے متعلق چند نمایاں اور اہم افادی گوشوں کی شعاؤں کو حروف کے آئینے میں قید کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حضرت سنجیدہ، شستہ، سلیس اور شگفتہ اسلوب بیان کے مالک ہیں، آپ کے اسلوب بیان اور طرز نگارش کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ آپ مقصد کی تبلیغ و ترسیل کو اولیت دیتے ہیں اور طرز بیان کو ثانوی حیثیت سے دیکھتے ہیں ،پھر بھی اسلوب بیان کی کشش اور دلربائی دیدنی ہوتی ہے اور بعض مسجع و مقفی جملوں پر الہامی فقروں کا گمان ہوتا ہے۔

"نشان منزل" تاریخ کے اسکالروں کے لیے ایک گراں قدر تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں اسلامی ہندوستان کے عروج وزوال کی تاریخی جھلک پیش کی گئی ہے، اور اسلامی ہند کے تاریخی و تہذیبی ،سیاسی وسماجی کارناموں کے دفاتر بھی وا کیے گئے ہیں، یوں ہی گجرات حکمرانی کے سفر کا عہد بہ عہد تاریخی جائزہ لیا گیا ہے، اور اسلامی گجرات میں دینی و مذہبی رواداری، عوامی امن وامان، تہذیبی و تمدنی بالادستی، سیاسی وسماجی عروج وارتقا کے مظاہر پیش کیے گئے ہیں، مودی کے گجرات کے جلتے اور سلگتے حالات اور اقلیت کش سرکاری دہشت گردانہ کارروائیوں کی صحیح تصویر بھی پیش کی گئی ہے، یوں ہی اداریاتی تحریروں کا یہ مجموعہ علم و تحقیق سمیت احسان و سلوک کا لہلہاتا گلشن، زہد وریاض کے مسافروں کے لیے بھی خضر راہ اور نشان منزل ثابت ہوگا۔

جو حضرات اسفار و مشاہدات کے شوقین ہوتے ہیں، ان کے لیے بھی "نشان منزل" ہر ہر قدم پر جنت ارضی کشمیر کے علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی، سماجی اور تاریخی آثار کے علم وادراک کو بام عروج تک پہنچانے میں بھی نشان منزل کا کام دے گا، اس کتاب کو پڑھ کر کبھی ہم صاحب سفرنامہ کے شانہ بہ شانہ چلتے نظر آئیں گے اور ان کے مشاہدات میں برابر کے شریک نظر ہوں گے، اور کبھی کشمیری عوام کی جہالت ہمیں رلائے گی اور کبھی ان کے خوش آمند دینی و مذہبی

کارناموں سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی، کبھی وہاں موجود اکابر اولیا کے مزارات مقدسہ کی روحانی حاضری سے کیف و سرور محسوس کریں گے، تو کبھی وہاں کے علما کی موجودہ دینی و ملی سرگرمیوں سے دل باغ باغ ہوگا، کبھی وہاں کے جنت نشان مناظر کے دل کش تصوراتی نظاروں سے دل میں گدگدی سی محسوس ہوگی، کبھی وہاں کی برف پوش پہاڑیوں، اور پرشور چشموں اور یخ بستہ جھیلوں کی دید کی تمنائیں دل میں انگڑائی لیتی نظر آئیں گی۔

اس کتاب میں بعض اداریے ماضی قریب کی بعض سرکردہ شخصیات سے متعلق ہیں، جن میں خانوادۂ اعلیٰ حضرت کے گل سرسبد حضرت علامہ تحسین رضا خان بریلوی علیہ الرحمہ، شرف ملت حضرت علامہ عبدالحکیم شرف قادری علیہ الرحمہ، اور علامہ نعمان خان قادری علیہ الرحمہ کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ ان بزرگوں کی شخصیات کے بہت سارے اہم گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے، جس سے ان بزرگوں کی دینی و علمی، سیاسی و سماجی، تبلیغی و دعوتی، تحریری و تصنیفی، تحریکی و تنظیمی سرگرمیوں اور عالمی سطح پر ان کے خوش آئند اثرات و نتائج کی تصویر دیدہ و دل میں اترتی نظر آتی ہے۔

بعض اداریوں میں مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال سے متعلق ایک ادیب اور قلم کار کے دل میں اٹھ رہے درد و کرب کی آواز صاف سنی جا سکتی ہے اور حروف کی زبانی اس غمگسارانہ پیغام کو بھی سنا جا سکتا ہے، جس سے مسلمانوں کی افسوس ناک تعلیمی صورت حال کا علاج کیا جا سکتا ہے۔

بعض اداریے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کے ناپاک منصوبے بند عزائم کے چہرے سے نقاب اٹھا کر ہمیں ان کے ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملانے کے لیے غور و فکر کے ہزاروں دروازے کھولتے نظر آئیں گے، اور مسلمانوں کے وجود و بقا، ترویج و ارتقا کے لیے لائحۂ عمل مرتب کرتے نظر آئیں گے۔

قرطاس و قلم سے ہمارے رشتے ازلا بہت کمزور تھے، جس کا فائدہ اٹھا کر ہمارے مذہبی حریفوں نے کس چابک دستی کے ساتھ سواد اعظم اہل سنت کے دینی و ملی خدمات اور کارناموں کی تصویر مسخ کر کے امت مسلمہ کو گمراہی کے دہانے تک پہنچایا؟ اور کن شاطرانہ چالوں سے ہمیں تاریخ کے دھارے سے موڑنے کی ناپاک کوشش کی؟ "نشانِ منزل" میں غیروں کی ان عیارانہ سرگرمیوں کا منصفانہ جائزہ اور اپنوں کی کوتاہیوں پر بے باکانہ تنقید یہ بھی نشانِ منزل بن کر ہمارے سمندِ قلم کے رخ کو صحیح سمت سفر پر آمادہ کرتی نظر آئیں گی۔

الغرض کتاب "نشانِ منزل" میں شامل اشاعت اداریے دینی و ملی، تاریخی و تہذیبی، سیاسی و سماجی، دعوتی

وتبلیغی رنگ وآہنگ میں ڈھلے ہوئے ہیں اور علما طلبا اور عوام سب کے لیے یکساں مفید ہیں۔ "نشانِ منزل" اردو ادب کے شکول ادبیات میں ایک گراں قدر ادبی شہ پارے کا درجہ رکھتا ہے، جس سے ادبی ذوق رکھنے والے قارئین بھی اپنی ادبی تشنگی بجھا سکتے ہیں، دعوتی نقطۂ نظر سے بھی نشانِ منزل کا مطالعہ بے حد مفید ثابت ہوگا کہ اس میں دعوت وتبلیغ اور تنظیم وتحریک پر بھی اچھا خاصا مواد موجود ہے، یوں ہی معاشرتی فلاح وبہبود سے شغف رکھنے والے قارئین بھی اس کتاب سے کما حقہ فیض پائیں گے۔

حضرت ممدوح کا ہر اداریہ اپنی الگ شان رکھتا ہے اور ہر اداریہ جہانِ حرف ومعنی کا ایک طلسم بن کر ہمارے قلب ونظر کو مسحور کرتا نظر آتا ہے، کتابی صورت میں یکجائی کی وجہ سے ان کی افادیت میں مزید چار چاند لگ گیا ہے، حضرت کے گوناگوں اداریوں کی غیر معمولی افادیت ہی کے پیشِ نظر "پیامِ حرم" میں شائع ہو جانے کے بعد میں انھیں علاحدہ کتابی شکل میں جمع کرتا رہا، جب اس کی ضخامت تقریباً ۲۲۵ صفحات کو پہونچ گئی تو اس کی افادیت کو عام سے عام تر کرنے کے لیے میں اس کی اشاعتی تگ ودو میں سرگرم ہو گیا اور حضرت مولانا محب احمد علیمی کو بھی اس کی اشاعت کی طرف متوجہ کیا، انھوں نے حضرت مولانا حافظ سراج احمد صاحب سے رابطہ کر کے ان سے کتاب کی اشاعت کا ذکر کیا اور مالی تعاون کی بھی درخواست کی، وہ بطیبِ خاطر راضی ہو گئے، اور اس طرح یہ عظیم علمی وتحقیقی سیاسی وسماجی اور دعوتی وتبلیغی شاہکار اداراتی تحریریں زیورِ طباعت سے آراستہ آپ مطالعے کے میز کی زینت بن سکیں۔

مبلغ ایشیا وامریکہ حضرت مولانا حافظ سراج احمد صاحب مصباحی نے اس کی اشاعت کا سامان کر کے اس کی افادیت کا دائرہ علمی حلقوں سے عوام کی محفلوں تک وسیع فرما کر یقیناً بہت بڑا کام کیا ہے، جس پر مصنفِ کتاب اور دیگر علمائے کرام، طلبۂ عظام اور عوام اہلِ سنت، سب کی جانب سے لائقِ صد تکریم وتبریک وتحسین ہیں، اور میری طرف سے لائقِ صد شکر بھی۔

ترتیب واصلاح کے کام میں حضرت مولانا محب احمد علیمی اور حضرت مولانا کمال احمد علیمی اساتذۂ دارالعلوم علیمیہ کی کوششیں قابلِ قدر وستائش ہیں، مولیٰ تعالیٰ انھیں اس کا بہترین اجر عطا فرمائے۔

آمین ثم آمین

غلام نبی علیمی

مینیجنگ ایڈیٹر ماہنامہ "پیامِ حرم" دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی ضلع بستی یوپی

تقدیم

مولانا ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی مصباحی صدر المدرسین دارالعلوم حق الاسلام لال گنج ضلع بستی

''نشان منزل'' ادیب لبیب حضرت علامہ الحاج فروغ احمد اعظمی مصباحی مدظلہ النورانی کے فکر انگیز اور پر مغز اداریوں کا منتخب مجموعہ ہے، جسے فاضل گرامی حضرت مولانا غلام نبی علیمی نے بڑے سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ علامہ فروغ احمد اعظمی کی مقناطیسی اور تابناک شخصیت محتاج تعارف نہیں، قلم وقرطاس اور درس وتدریس کے حوالے سے آپ کی شہرت ہندوستان کی سرحدوں کو تجاوز کر گئی ہے، علم وفضل، زہد وتقویٰ، طہارت قلب، پاکیزگی کردار اور خدمت خلق کے گراں قدر جذبات آپ کی خمیر میں شامل ہیں، دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی میں ایک مدرس پھر منصب صدارت پر فائز ہونے کے بعد پچیس سال سے اس کی خدمات، جس خلوص، لگن، اور جانفشانی سے کر رہے ہیں، یہ نادر المثال اور فقید النظیر ہے، وہ دور طالب علمی ہی سے محنتی اور جفاکش رہے ہیں، اور ان کی محنتیں رنگ لائی ہیں، آج ان کی درسگاہ کے خوشہ چیں اور ان کے فیضان علم سے سرشار افراد ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں، علامہ اعظمی شروع ہی سے نظم اور نثر دونوں میں لکھتے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں، عربی اور اردو میں تراجم وتالیفات کی صورت میں ان کی درجنوں کتابیں جس کا بین ثبوت ہیں، مارچ ۲۰۰۶ء میں دارالعلوم علیمیہ کے علمی، تحقیقی، اور دعوتی رسالہ ماہنامہ ''پیام حرم'' کا اجرا ہوا، جس کی ادارت کا سہرا آپ کے سر رہا، اس رسالے کا قارئین نے دل کھول کر استقبال کیا، اور اس کے علمی وفکری اداریوں کو عوام وخواص نے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا، اور ارباب فضل وکمال جنھیں سراہے بغیر نہ رہ سکے۔

مشہور مفکر اور دانشور حضرت علامہ بدر القادری صاحب مصباحی دامت برکاتہم القدسیہ رقم طراز ہیں:

''دسمبر ۲۰۰۷ء کا اداریہ ''مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال: اسباب وعلاج'' پیش نظر ہے

،اس میں آپ نے تاریخی حقائق کی جھلکیاں دکھا کر مستقبل کی ضرورتوں پر بھر پور روشنی ڈالی ہے ،آپ کے اس اداریہ کے ذریعہ سنی تبلیغی جماعت اور راجستھان کے علاقہ میں اس کی خدمات نیز دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی کے تعلیمی کارناموں اور مساعی جمیلہ سے خود ہمیں نادرونایاب معلومات حاصل ہوئیں" [پیام حرم شمارہ مارچ ۲۰۰۷ء]

علامہ فروغ احمد اعظمی صاحب کا اسلوب تحریر سلیس، سادہ، شگفتہ اور لب ولہجہ انتہائی دل نشیں ہے، اعلیٰ فکر اور بلند خیالات کے اظہار کے لیے اس قدر عام فہم اور شیریں طرز تحریر آپ کا خاصہ ہے، متانت، سنجیدگی اور سادگی کے باوجود آپ کی تحریریں انتہائی سپاٹ اور کھردرے پن سے مبرا ہوتی ہیں، سیدھے سادے الفاظ میں پیچیدہ مضامین کو حسن وخوبی سے بیان کرنے کا آپ ہنر رکھتے ہیں، در حقیقت ان کی سلیس اور عام فہم عبارتوں میں وہ حسن و جمال ملتا ہے جو مقفیٰ اور مسجع عبارتوں میں قطعاً نظر نہیں آتا، ان کی تحریروں میں مقصدیت کے عناصر خوب پائے جاتے ہیں، ان کا مقصد اپنے دل کا درد دوسروں کے دلوں میں اتارنا ہے، تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔

"اخلاص ونیت" کے تعلق سے مندرجہ ذیل عبارت کس قدر دل پذیر ہے:

"اخلاص دل کا وہ فعل ہے، جس سے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مقصود ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ سنت جاریہ ہے کہ جو بھی بندہ اخلاص کے ساتھ محنت ومجاہدہ کرتا رہتا ہے، وہ ضرور کامیاب ہوتا ہے۔

عمل پیہم اور جہد مسلسل، محنت ومشقت، اور ریاضت ومجاہدہ خواہ دین کے کام میں ہو یا دنیا کے کام میں، اس کے ثمرات اور فائدے کبھی نہ کبھی اور کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی شکل میں ضرور ظاہر ہوتے ہیں، اسی محنت کی وجہ سے آج صلیبی یورپ وامریکہ اور صیہونی اسرائیل غالب اور کامیاب ہیں اور پوری دنیا پر اپنی مرضی کی حکومت چلاتے ہیں"۔

کشمیر کے سفرنامہ کی تمہید پڑھیے اور گنگ وجمن کی روانی کا لطف حاصل کیجیے:

"وادی گل وبلبل کشمیر جیسے خوبصورت اور دل کش علاقے کی خوبیاں سننے اور پڑھنے کے بعد فطری طور سے ہر دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ یہاں کی سیر کی جائے اور کچھ دن قیام کر کے

یہاں کے حسین مظاہر قدرت سے لطف اندوز ہوا جائے، اور ایک عرصہ سے اپنے دل میں بھی کچھ ایسی ہی تمنا مچل رہی تھی، جو پوری نہیں ہو پا رہی تھی، لیکن "سیروافی الارض" کے خدائی حکم پر عمل کی توفیق قسمت میں لکھی تھی، لہذا قدرت نے اس سال سیر کشمیر کے اسباب فراہم کر دیے" اس سادہ اور شگفتہ نثر میں کس قدر حلاوت اور خلوص کی مہک پائی جاتی ہے، جسے پڑھ کر دل کیف و سرور سے معمور ہو جاتا ہے۔

علامہ اعظمی صاحب نے اپنی تحریروں میں توانائی، وزن، وقار اور زور پیدا کرنے کے لیے دلائل و براہین کا بھی سہارا لیا ہے، تا کہ بات مستند اور مبرہن ہو جائے اور کسی کو لب کشائی کی ہمت نہ ہو سکے "مسلمانوں کے سالانہ عالمی اجتماع............حج" کے ابتدائی پیراگراف میں لکھتے ہیں:

"کامل ایمان رکھنے اور چاروں اعمال کی مکمل ادائیگی پر خدا کی طرف سے بندوں کو صلے کے طور پر دنیا میں خلافت ارضی اور آخرت میں تمام آسائشوں اور آرائشوں سے بھرپور دائمی نعمت کدے جنت میں اولاً داخل ہونے کا وعدہ ہے" وعد الله الذين آمنوا وعملوا الصلحت ليستخلفنهم فى الارض " [سورۂ نور ۵۵] ترجمہ: وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کو زمین کا خلیفہ بنائے گا" والذين آمنوا وعملوا الصلحت اولئك اصحاب الجنة " [سورۃ البقرۃ ۸۲] ترجمہ: اور وہ لوگ جو ایمان لائے، اور جنھوں نے نیک کام کیے وہی جنت والے ہیں۔

محترم اعظمی صاحب کی انگلیاں قوم کی نبض پر رہتی ہیں، وہ فکری شعور کی تعمیر و تشکیل اور تہذیبی اقدار کی بازیابی کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے ہیں، وہ اپنی صحافت کے ذریعہ قوم کے تن مردہ میں روح پھونکنے کی کوشش کرتے ہیں، مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد اسلامیان ہند کی تعلیمی صورت حال اور زیادہ خراب ہو گئی، سچر کمیٹی کی رپورٹ اگر حقائق پر مبنی جانئے تو مسلمانوں میں تعلیم کی شرح صرف چار فی صد ہے، یہ رپورٹ ہمیں چونکانے اور بیدار کرنے کے لیے کافی ہے، لیکن ابھی بھی ہمارے کانوں پر جوں نہیں رینگ رہی ہے، اور کچھ کرنا تو کجا ہم کچھ سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں، تعلیم کی کمی اور

کمزوری ہی ہماری دینی وروحانی کمزوری اور سیاسی وسماجی بدحالی اور معاشرتی ومعاشی ابتری وپس ماندگی کا سبب ہے۔"

جذبات پر مہمیز لگانے والی اس تحریر اور دل کو جھنجھوڑنے والی اس عبارت کے بعد موصوف نے تعلیمی بیداری کے لیے جو سجھاؤ پیش کیا ہے، اس کا ہر ہر نکتہ بڑے خلوص سے ہمیں دعوتِ عمل دے رہا ہے۔

"تعلیمی بیداری مہم میں ہمارے اہل علم وقلم، خاص طور سے باثر خانقاہوں کے مشائخ اور مقررین وخطباے عظام، ائمۂ مساجد اور سماجی قائدین ودانشوران اپنے اپنے حلقۂ اثر میں موثر کردار ادا کر سکتے ہیں، دینی اجلاسوں، کانفرنسوں اور خصوصی مجالس ومحافل میں تعلیم اور مدارس کی طرف زیادہ سے زیادہ قوم کے صاحب ثروت اہل خیر اور عوام کو توجہ دلائی جائے، اور تعلیم مدارس کی اہمیت بتائی جائے، اور مادی تعاون کے لیے آمادہ کیا جائے، اور سیمینار وسمپوزیم منعقد کر کے موجودہ تعلیمی صورت حال کا جائزہ لے کر کمیوں اور کمزوریوں کو دور کیا جائے، اور منصوبہ بند طریقے سے معیاری مدارس کے قیام اور تعلیم وتربیت کے نظام ونصاب کی اصلاح وتحسین پر مخلصانہ مشورے اور بحثیں ہوں" [پیامِ حرم دسمبر ۲۰۰۷ء]

آپ کے یہاں موضوع اور ہیئت میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، دل کی آواز کو قوم تک پہنچانے کے لیے آپ کے اداریے آلۂ کار کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ قوم کی ملی، سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی پس ماندگی کا جائزہ لیتے ہیں اور اصلاح کا موثر اور مثبت لائحۂ عمل پیش کرتے ہیں، وہ جذباتی اندازِ فکر کی جگہ منطقی اندازِ فکر پر زور دیتے ہیں، جس میں وزن، وقار، اثر ووسعت اور جامعیت کے ساتھ ساتھ عقل کی گیرائی، فکر کی پختگی اور جذبے کا خلوص بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ اپنی جماعت میں ہمیشہ سے درس وتدریس اور جوش خطابت کا بول بالا رہا ہے، قلم وقرطاس سے عدم توجہی کے باعث ہمارا جو جماعتی نقصان ہوا، وہ ناقابل تلافی ہے، علامہ موصوف نے اس جماعتی نقصان پر آنسو بہانے کے بعد نئی نسل کے ہاتھوں میں قلم تھمانے کی جو تجاویز پیش کی ہیں، وہ آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔

"تو سنیے اب کرنا یہ ہے کہ کم از کم ہر بڑے دار العلوم میں زیرِ تعلیم فوقانی درجات کے ہر طالب علم کے ہاتھ میں قرطاس وقلم بھی تھما دیجیے اور کہیے کہ وہ روزانہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھا بھی کرے، مضمون نہیں لکھتا، نہ لکھے، اس سے یہ کہیے کہ روزانہ کے اسباق کی تقریر ہی لکھا کرے، ہر سبق کی نہ سہی، ایک ہی سبق کی سہی، روزانہ، نہ سہی ہفتے میں دو تین دن ہی سہی، مگر لکھے، اور ضرور لکھے...... اگر مسلسل پابندی اور اہتمام کے ساتھ درسی تقریر ہی لکھتا رہے گا، تو پڑھ کر فارغ ہوتے ہوتے ایک باصلاحیت مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منجھا ہوا مصنف وقلم کار بھی بن جائے گا"۔ [ماہنامہ پیام حرم شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء]

انتہائی مسرت کی بات ہے کہ ان فکر انگیز اداریوں کو کتابی شکل دے کر اس کی عمر اور عمومی افادیت میں اضافہ کر دیا گیا ہے، یہ تاریخی، علمی اور فکری مضامین ہمیں دعوت فکر و عمل دے رہے ہیں، اس کتاب میں ہمارے روشن مستقبل کے تابندہ نقوش اور سربستہ راز ہیں، کاش اس پر عمل کر کے ہم اپنے مستقبل کو تابناک بنالیں اور زمانے کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر اسلامی تشخص کے ساتھ جینے کا سلیقہ سیکھ لیں، مبارک باد کے مستحق ہیں برادر مکرم حضرت مولانا حافظ سراج احمد مصباحی مقیم حال امریکہ جن کے تعاون سے یہ گراں قدر کتاب اشاعت پذیر ہوئی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مصنف دامت برکاتہم کا سایۂ شفقت ہم پر دراز فرمائے، مرتب کو ان کی محنتوں کا صلہ عطا فرمائے اور معاونین کو دارین کی سرخروئی بخشے۔ آمین!

شکیل احمد اعظمی مصباحی

صدر المدرسین دار العلوم حق الاسلام لال گنج بازار ضلع بستی۔

مورخہ یکم دسمبر ۲۰۰۸ء

دعائیہ کلمات

شیخ القرآن حضرت علامہ عبداللہ خان عزیزی دام ظلہ النورانی

حضرت مولانا فروغ احمد اعظمی صدرالمدرسین دارالعلوم علیمیہ زیدمجدہ نے اولاً ماہنامہ ''اہل سنت'' ثانیاً ماہنامہ ''پیام حرم'' میں اداریے لکھے، جو اپنے موضوع وعنوان کے لحاظ سے نہ صرف جامع ومانع ہیں، بلکہ ان میں ایک گونہ ندرت پائی جاتی ہے، ان اداریوں کو پڑھنے کے لیے ضعف بصر کی بنا پر وقت نکال نہ سکا، لیکن جستہ جستہ دو تین اداریوں کو ضرور مطالعہ کیا ہے، بڑی مسرت یہ ہوئی کہ اسلوب بیان نہایت شگفتہ اور دل آویز ہے، اور جس عنوان پر قلم اٹھایا بالیقین اس کا حق ادا کردیا ہے، مثلاً ''قرطاس وقلم کی فرماں روائی'' یہ غالباً پہلا اداریہ ہے، اس پر مولانا موصوف کے قلم کی روانی پورے آب وتاب کے ساتھ دیکھی جاسکتی ہے، اتنی عمدہ عبارتیں لکھی ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا، اور اسی طرح کچھ اور اہم اداریے بھی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(۱) باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے (۲) لہولہان فلسطین ولبنان اور یہودی عزائم (۳) مسلمانوں کا سالانہ عالمی اجتماع .... حج (۴) چودہویں صدی ہجری کا ایک صوفی مجاہد (۵) اسلامی ہند: عروج وزوال کی تاریخی جھلک۔

ان عنوانات کو پڑھ کر مدیر اعلیٰ کے اسلوب بیان میں جو ندرت پائی جاتی ہے، اس کا احساس شدت کے ساتھ ہوتا ہے، تخیل کی بلند پروازی، ذہنی طہارت وسلیقہ مندی وغیرہ کی جھلکیاں صاف دیکھی جاسکتی ہیں، مدیر اعلیٰ کے اداریے ایسے نہیں ہیں جن کو وقتی اور ہنگامی کہا جائے، کہ کوئی واقعہ پیش آیا اور اس پر قلم کی جولانی دکھائی گئی ہو، عام طور سے جو اداریے لکھے جاتے ہیں ان میں محض وقتی تقاضوں کی خانہ پری کی جاتی ہے، اس میں دوام واستمرار نہیں ہوتا، لیکن میری اپنی نگاہ میں

جناب مولانا فروغ احمد اعظمی زید مجدہ نے جتنے اداریے تحریر فرمائے ہیں، وہ عرصۂ دراز تک نہ صرف ذہنوں کو متاثر کرتے رہیں گے، بلکہ ادب وصحافت کی دنیا میں ہمیشہ جگمگاتے ہوئے نظر آئیں گے اس لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کے اداریوں کو جو مستقل مقالات کی شکل میں ہیں، ان کو کتابی شکل میں جمع کیا جائے، چنانچہ اس وقت میرے روبرو ان مقالات کا مجموعہ بنام "نشانِ منزل" موجود ہے، جو دینی وعلمی مضامین کا حسین گلدستہ ہے۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقہ وطفیل میں مولانا موصوف کے قلم میں مزید جولانی وروانی مرحمت فرمائے اور زمانے کے حوادثات وآفات سے محفوظ رکھ کر ان کو دین اسلام کی بیش بہا خدمات انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

محمد عبداللہ خان عزیزی

دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی

۳ ر ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ

مصنف ایک نظر میں

از: محب احمد قادری علیمی

استاذ: دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی بستی یوپی

تاریخی نام: محمد فروغ ۱۳۷۸ھ۔

نام ونسب: فروغ احمد اعظمی بن ممتاز احمد بن مولوی محمد قمرالدین اعظمی اشرفی بن محمد شفیع بن دین محمد۔

خاندانی ماحول: مذہبی، دینی، گھر میں کئی علما اور حافظ قرآن، والد گرامی الحاج ممتاز احمد دارالعلوم شمس العلوم گھوسی کے تیئیس [۲۳] سال تک ناظم رہے۔

تاریخ پیدائش: شوال ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۹ء [درج اسناد تاریخ پیدائش ۵ر دسمبر ۱۹۶۲ء]

مولد: محلہ کریم الدین پور گھوسی ضلع مئو۔

اساتذۂ کرام ناظرہ: جناب خدیجہ خاتون صاحبہ۔

اساتذۂ کرام پرائمری: ماسٹر محمد ابوالحسن صاحب، ماسٹر عبدالرزاق صاحب، ماسٹر محمد صوفی صاحب [اساتذۂ کرام پرائمری شمس العلوم]

اساتذۂ کرام عربی، فارسی وغیرہ: ماسٹر محمد ایوب صاحب، مولانا فداء المصطفیٰ صاحب، مولانا سیف الدین صاحب شمسی، مولانا ڈاکٹر محمد عاصم صاحب اعظمی، مولانا عبدالمنان کلیمی صاحب، مولانا ابواللیث صاحب اعظمی مجددی، مولانا قمرالدین صاحب قمر اشرفی، اور مولانا حاجی شفیق احمد صاحب عزیزی [اساتذۂ عربی فارسی شمس العلوم گھوسی]

اساتذۂ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور: مولانا اعجاز احمد صاحب مبارک پوری، مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب، مولانا افتخار احمد صاحب قادری، مولانا نصیرالدین صاحب، مولانا عبدالشکور صاحب، مولانا عبداللہ خان عزیزی صاحب، علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری صاحب، مولانا محمد شفیع صاحب اعظمی علیہ الرحمہ، مفتی عبدالمنان صاحب اعظمی، مفتی محمد شریف الحق صاحب امجدی علیہ الرحمہ۔

سن فراغت: ۱۹۸۳ء الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور۔

اسناد: ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل [جامعہ اردو علی گڑھ] منشی، منشی [ہندی] کامل، مولوی، عالم، فاضل ادب، فاضل دینیات، فاضل طب [امتحانات عربی فارسی بورڈ لکھنؤ] فاضل علوم اسلامیہ [الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور]

عقد مسنون: ۲۸ / مارچ ۱۹۸۶ء ہمراہ حامدہ خاتون بنت انعام الحق صاحب مرحوم گھوسی

اولاد: چار لڑکے: احمد فرحان غازی، محمد کامران انس، ابو قحافہ محمد عفان، محمد احمد حسان

چار لڑکیاں: سعیدہ وہاب، مریم زیبا، آسیہ خاتون، ناجیہ خاتون

تدریس: فراغت کے بعد سے تاہنوز دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی

اعزازات ومناصب: (۱) صدر شعبۂ ادب، دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی۔

(۲) صدر المدرسین، دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی، ۴ / جنوری ۲۰۰۲ء سے تاہنوز۔

(۳) بانی رکن کہکشاں لائبریری شمس العلوم گھوسی۔

(۴) بانی رکن المجمع النورانی جمدا شاہی بستی۔

(۵) چیف ایڈیٹر ماہنامہ "پیام حرم" جمدا شاہی بستی۔

(۶) نگراں ماہنامہ "العلیم" عربی جمدا شاہی بستی۔

(۷) سابق صدر: ٹیچرس ایسوسی ایشن مدارس عربیہ اتر پردیش بستی۔

(۸) رکن: دار المصنفین [مجلس برکات، مبارک پور]

(۹) رکن: نصاب ساز عبوری کمیٹی مبارک پور، اعظم گڑھ۔

(۱۰) ہندوستان کے مختلف نمایاں دینی، تعلیمی اداروں بشمول الجامعۃ الاشرفیہ سے منصب تدریس کی پیش کش۔

علمی وقلمی خدمات: (۱) زمانۂ طالب علمی سے لے کر اب تک ملک کے طول وعرض میں شائع ہونے والے سیکڑوں علمی، فکری اور دینی مضامین۔ (۲) الشمس، سالانہ میگزین شمس العلوم کی ادارت۔

(۳) ترجمہ "تحفۃ الوہابیۃ" غیر مطبوعہ

(۴) ترجمہ ''التوسل بالنبی'' غیر مطبوعہ

(۵) ترجمہ ''صور من حیاۃ الصحابہ'' غیر مطبوعہ

(۶) ''نفیرِ حرم'' [نعتیہ دیوان] غیر مطبوعہ

(۷) شرح عربی ''المعلقات السبع'' غیر مطبوعہ

(۸) تحریک وہابیت مطبوعہ

(۹) قادیانیت اور تحریک تحفظ ختم نبوت مطبوعہ

(۱۰) نشانِ منزل مطبوعہ

(۱۱) فتاویٰ امجدیہ، تذکرہ علمائے گھوسی، اور دیگر کچھ اہم کتب کی تدوین و ترتیب میں خصوصی حصہ وتعاون۔

(۱۲) جامعۃ البنات شمس العلوم گھوسی اور دار العلوم علیمیہ کی نصاب سازی۔

شوق ومشغلہ: تدریس، تصنیف وتالیف، اشاعتی وعلمی اداروں کا تعاون، شعر گوئی اور بزرگوں کے آستانوں پر حاضری۔

شرفِ بیعت: مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حبیب الرحمٰن صاحب قادری علیہ الرحمہ رئیس اڑیسہ

خلافت: فقیہ ملت حضرت علامہ مفتی جلال الدین احمد صاحب امجدی علیہ الرحمہ

اجازتِ حدیث: (۱) مفسر قرآن حضرت علامہ مبین الدین صاحب محدث امروہہ رحمۃ اللہ علیہ

(۲) بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب قبلہ شیخ الحدیث شمس العلوم گھوسی، وسابق شیخ الحدیث الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور۔

(۳) شرف ملت حضرت علامہ عبد الحکیم شرف قادری صاحب علیہ الرحمہ شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور، پاکستان۔

نوٹ: حضرت شرف ملت علیہ الرحمہ نے ان تمام علوم دینیہ تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد وتصوف کی اجازت دی ہے، جن کی اجازت شرف ملت کو مشائخ کرام سے حاصل تھی۔

قرطاس وقلم کی فرماں روائی

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر غار حرا میں سب سے پہلے قرآن مجید کی سورۂ ''اقرأ'' نازل فرمائی، اور اس میں پڑھائی لکھائی اور تعلیم وتعلّم کا ذکر فرمایا، اور نزول قرآن کا آغاز ہی پڑھنے کے تاکیدی حکم سے ہوا، اس سے علم وقلم کی غیر معمولی اہمیت وعظمت وضرورت کا پتہ چلتا ہے۔

[اقرء باسم ربك الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقرء وربك الاكرم الذی علّم بالقلم، علّم الانسان مالم يعلم] (سورۂ علق ۱۔۴)

اپنے رب کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا، انسان کو بستہ خون سے پیدا کیا، پڑھو اور تمہارا رب ہی سب سے بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے لکھنا سکھایا، قلم کے وسیلہ سے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اور سورۂ قلم میں قلم اور تحریر کی قسم یاد فرمائی ہے اور قسم کسی اہم چیز ہی کی کھائی جاتی ہے، لہذا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی تحریر وقلم کی اہمیت قسم یاد فرمانے کی وجہ سے واضح اور مسلم ہے۔

(نٓ، والقلم ومایسطرون)[قلم: ۱۔۲] قلم اور تحریر کی قسم۔

اسی اہمیت وضرورت کے پیش نظر اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قيدوا العلم بالكتابة'' تحریر کے ذریعہ علم کو قید کرلو۔ [مستدرک للحاکم ج ۱ ص ۱۰۶]

درسگاہ صفہ کے نصاب تعلیم کا موضوع قرآن مجید اور احکام دین کی تعلیم تھا، لیکن اس کے علاوہ تحریر وکتابت پر پوری توجہ دی جاتی تھی، معلم کائنات ﷺ نے حضرت عبداللہ بن سعید بن عاص انصاری کو کتابت سکھانے پر مامور فرمایا تھا، غزوۂ بدر میں جو مشرکین قید ہو کر آئے، ان میں جو لوگ کتابت سے واقف تھے، آپ نے ان کا فدیہ یہی مقرر فرمایا کہ وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں، حضور کے زمانہ اور صحابۂ کرام کے دور میں کثیر تعداد میں احادیث کے صحیفے تیار ہوئے، اس کے علاوہ سلاطین کے نام

دعوت نامے، صلح نامے، معاہدے اور امان نامے وغیرہ سب تحریری شکل میں موجود تھے۔

قلم اور تحریر سے بے شمار دینی و دنیوی مفادات وابستہ ہیں، علوم وفنون کی تدوین انھیں سے ہوتی ہے، علم وحکمت کی باتیں وثائق ودستاویزات اور اصول وضوابط اسی سے محفوظ کیے جاتے ہیں، تاریخی حالات وواقعات اور شخصیات کے تذکرے اور ان کے اقوال واحوال بعد کے لوگوں تک بے کم وکاست محفوظ طریقے سے پہنچانے کا یہی ذریعہ ہیں اور بشمول قرآن تمام آسمانی کتابیں اسی ذریعہ سے ہم تک پہونچی ہیں۔

اگر تحریر نہ ہوتی تو دین ودنیا کی بہت ساری معلومات درست اور صحیح حالت میں باقی نہیں رہتیں، اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت پر تحریر وقلم کے علاوہ کوئی اور دلیل نہ ہوتی تو دلیل تحریر وقلم ہی اس کے لیے کافی تھی۔

کارزار حیات کا سب سے مضبوط اور کامیاب ترین ہتھیار قلم ہی ہے، یہ ہتھیار جب سے وجود میں آیا ہے، تب سے آج کے ترقی یافتہ سائنسی دور تک برابر استعمال کیا جارہا ہے، اور ہر ہوشیار اور بیدار قوم ہر فکری محاذ پر اسے کامیاب طریقہ سے استعمال کررہی ہے اور اپنے مقابل کو زیر وپسپا کررہی ہے، مگر اس ہتھیار کی دھار ہے کہ کند ہونے کا نام نہیں لیتی۔

کمپیوٹر (Computer) وی سی آر (V.C.R) سی ڈی (C.D) انٹرنیٹ (Internet) وغیرہ الیکٹرانک میڈیا کی ایجاد اور ان کے بے حد استعمال ومقبولیت کے باوجود قرطاس وقلم کی فرماں روائی میں کوئی نمایاں کمی نہیں آئی ہے، کتابوں، میگزینوں اور اخبارات کی اشاعت پہلے ہی کی طرح جاری ہے اور انھیں پورے ذوق وشوق سے پڑھا جارہا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا بھی تحریر وقلم سے بے نیاز اور اچھوتا نہیں ہے، کمپیوٹر کے خزانہ معلومات میں محفوظ اور اس کے قرطاس (Screen) پر ابھرنے والی تصاویر ومناظر کے ساتھ تحریریں بھی تو ابھرتی ہیں اور ظاہر ہے یہ اسی وقت ابھریں گی، جب انھیں ہماری انگلیاں کمپیوٹر کے الیکٹرانک قلم (Key Board) کو حرکت دے کر خزانہ معلومات میں جمع کردیں گی۔

جدید الیکٹرانک میڈیا اور قدیم پرنٹ میڈیا دونوں یکساں اہمیت رکھتے ہیں، اور دونوں کی

فرماں روائی مسلّم ہے، ہر صحیح وغلط فکر اور ہر حق وباطل تحریک نے اس ہتھیار سے فائدہ اٹھایا ہے، اگر کسی تحریک یا جماعت کے پاس افرادی قوت نہ ہو، یا ہو، مگر اس کے افراد نے قابل ذکر اور لائق فخر کارنامے انجام نہ دیے ہوں، پھر بھی تحریر وقلم کے ذریعہ بے حد خوبصورت مگر بے حقیقت تاریخ گڑھی جا سکتی ہے، بلکہ قابل نفریں کارناموں کے باوجود قلم کے وسیلہ سے تاریخ کے فریم میں اپنے ناکارہ جودھاؤں کی تصویر بڑے قرینہ سے سجائی جاسکتی ہے، اور حقیقی سورماؤں کے زریں کارناموں کو تاریخ کی اسکرین سے یکسر غائب بھی کیا جاسکتا ہے، یا کچھ اور جرأت کی تو مظلوم حقیقی شخصیتوں کے ساتھ جھوٹے اور خودساختہ قابل نفریں کارناموں کو جوڑ کر ان کی انتہائی بھیانک اور گھناؤنی صورت گری بھی کی جاسکتی ہے، اور اس طرح صرف تحریر وقلم کے بل بوتے پر افسانوی اور ظالمانہ تاریخ گری کا غیر دیانتدارانہ فریضہ انجام دینا بڑا آسان کام ہے۔

برصغیر ہندوپاک میں بیسویں عیسوی کے کچھ پہلے ہی سے سواد اعظم اہل سنت کے ساتھ ہمارے فکری حریفوں نے بڑی چالاکی کے ساتھ یہ گھناؤنا کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا، جواب تک برابر جاری ہے، مگر ابھی بھی ہمیں پورا ہوش نہیں آیا، اردو زبان میں مذہبی تاریخ نویسی سے ہمارا رشتہ مکمل طور سے کنارہا، جس کے نتیجہ میں برصغیر کے سواد اعظم اہل سنت کے بزرگوں نے صحیح اور متوارث فکر واعتقاد اور دینی وعلمی کارناموں کی جو شاندار اور زریں تاریخ بنائی تھی، اسے ہمارے چالاک فکری حریفوں نے بڑی چابک دستی سے ملیامیٹ کر دیا ہے، ان تاریخ گروں نے یا تو سرے سے تاریخ دعوت وعزیمت سے ان بزرگوں کا تذکرہ ہی غائب کر دیا ہے یا ذکر کیا ہے تو پھر بڑی مکروہ تصویر پیش کی ہے، مثال کے طور پر ہندوستان میں سب سے پہلے اور سب سے بڑے پیمانہ پر علم حدیث کی اشاعت کرنے والے جلیل القدر محدث محقق علی الاطلاق حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) مفتی عنایت احمد کاکوروی (م ۱۲۷۹ھ) علامہ فضل حق خیرآبادی (م ۱۲۷۸ھ) مفتی شرف الدین رام پوری (م ۱۲۸۵ھ) علامہ فضل رسول بدایونی (م ۱۲۸۹ھ) مولانا سید کفایت علی کافی شہید مرادآبادی (م ۱۲۷۴ھ) مفتی صدر الدین آزردہ (م ۱۲۸۵ھ) مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا عبد القادر بدایونی (۱۳۱۹ھ) امام احمد رضا محدث بریلوی (م ۱۳۴۰ھ) رحمہم اللہ اور ان کے ہم فکر معاصر اور بعد کے اعیان اہل سنت

ہمارے اخیار کی جھوٹی تاریخ گری کا شکار خاص طور سے بنائے جاتے رہے ہیں۔

برصغیر کے علماء ومشائخ کے تذکرے پر مشتمل مولانا علی میاں ندوی کے باپ مولانا عبدالحی لکھنوی کی کتاب "نزہۃ الخواطر" اس کی جیتی جاگتی بدترین مثال ہے، اس میں مفتی شرف الدین رام پوری علیہ الرحمہ کے بارے میں معاند مورخ کا قلم جذبۂ عناد میں اتنا آگے بڑھ گیا کہ اسے تاریخ نویسی کی سنجیدگی کا ہوش بھی نہیں رہا اور سواد اعظم کے ایک بزرگ عالم دین کو قنوجی کی "ابجد العلوم" کے پردہ میں شرف الدین کی بجائے "شرفی الدین" لکھ دیا:

"انہ کان شرّافی الدین، لاشرف الدین، کماسماہ بذلک سیدی الوالد قدس سرہ، وکان ابعدخلق اللہ من السنۃ مع حفظ الحواشی والشروح الکثیرات للکتب الدراسیۃ المتداولۃ، منتصراً للبدعۃ، رادّاعلیٰ الحق بخرافاتہ، محبّاًللدنیا"۔

یعنی دین کے معاملہ میں شر تھے، دین کا شرف نہیں تھے، جیسا کہ انھیں میرے والد نے یہ نام دیا ہے، باوجودیکہ یہ متداول درسی کتابوں کے بہت سارے حواشی اور شروح کے حافظ تھے، خدا کی ساری مخلوق سے زیادہ سنت رسول سے دور تھے، بدعت کے حامی اور اپنے خرافات کے ذریعہ حق کی تردید کرنے والے، دنیاپرست تھے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۱۲)

صورت مسخ کرنے کی یہ ایک معمولی مثال ہے، اسی طرح علامہ فضل رسول بدایونی کے صاحب زادے علامہ عبدالقادر بدایونی کے ذکر میں لکھا ہے:

"کان علی قدم والدہ فی المبادرۃ الیٰ تکفیر المسلمین وتبدیعھم وتفسیقھم"۔

یعنی مولانا عبدالقادر بھی اپنے والد مولانا فضل رسول کے نقش قدم پر چل کر مسلمانوں کو کافر بدعتی اور فاسق کہا کرتے تھے۔ (ایضاج ۸ ص ۲۷۶)

امام احمد رضا قادری کے بارے میں اسی کتاب کے متن اور ضمیمہ میں باپ بیٹے نے جو کچھ لکھا ہے، اسے ہمارے قارئین بارہا پڑھ اور سن چکے ہیں، اسے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

نزہۃ الخواطر، تاریخ دعوت وعزیمت، علمائے ہند کا شاندار ماضی، رود کوثر، آب کوثر اور موج کوثر جیسی تاریخ وتذکرے کی کتابیں پڑھ کر دیکھیے برصغیر کے سواد اعظم اہل سنت کی حقیقی عبقری اور نمائندہ دینی وعلمی شخصیات کے ساتھ کتنا اور کیا کیا ظلم روا رکھا گیا ہے، صرف اتنا ہی نہیں کہ ان شخصیات کو اسلام کی حقیقی تاریخ دعوت وعزیمت سے الگ کر دیا گیا، بلکہ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ انیسویں صدی عیسوی کی پیداوار وہابی تحریک اور ہندوستان میں اس کے بانی اسماعیل دہلوی اور ان کے ناخواندہ پیر سید احمد رائے بریلوی کو تجدید واصلاح اور جہاد کے نام پر برصغیر کی اسلامی تاریخ کا ہیرو بنا کر پیش کیا گیا، اور بڑی خوبصورتی سے دعوت وعزیمت کے تاریخی دھارے کا رخ ان نام نہاد جہادیوں اور مصلحین کی طرف موڑ کر وہابی فکر وتحریک کو اسلامی تاریخ سے جوڑ دیا گیا، وہابی تحریک اور اس کی نمائندہ شخصیات کی صحیح شکل دیکھنی ہو، تو تاریخ تناولیاں، امتیاز حق، حقائق تحریک بالاکوٹ اور خون کے آنسو وغیرہ کا مطالعہ کیجیے آنکھیں کھل جائیں گی۔

علی میاں ندوی کی تاریخ دعوت وعزیمت کی خطرناکی انتہائی دور رس اور ہمہ گیر ہے، یہ اور اسی طرح کی دوسری مبنی بر تعصب وغلط تاریخوں اور تذکروں کا اثر اور تاریخ نویسی سے ہماری غفلت وبے پروائی کا نتیجہ ہے کہ دنیا برصغیر کی صحیح مذہبی تاریخ اور حقیقی شخصیات کے کارناموں سے ناآشنا اور غلط فہمیوں کا شکار ہے، اور عالم استشراق اور دنیائے عرب دونوں میں بڑی آسانی کے ساتھ سواد اعظم اہل سنت کو نئی فکر کا حامل اور نیا فرقہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، "البریلویۃ" نامی کتاب میں مکمل طور پر کھل کر اس چالاکی کا مظاہرہ کیا گیا، عربی لغت کی مشہور اور رائج کتاب "المنجد" میں "بریلوی" فرقہ کے تعارف میں دیکھ لیجیے، ایک مستشرق نے کیا لکھا ہے:

"ھو حزب الاحناف الذی ألفہ أتباع احمد بریلوی، وھو تابع لمذھب أبی حنیفۃ فی الھند، ویعرف بالبریلوی، وھو یختلف عن عامۃ السنۃ بتفاصیل عدیدۃ، وقد سبّب خلافا بین العلماء فی شبہ القارۃ الھندیۃ الباکستانیۃ" [المنجد الاعلام ص ۱۳۰]

پھر اسی کتاب میں ابن عبدالوہاب نجدی اور وہابی تحریک کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی

پڑھ لیجیے:

"مصلح ديني وزعيم الوهابية ،ولد في العيينة (نجد) رباعلى المذهب الحنبلي ،وطاف في الحجاز والعراق وسوريا ،قرّر تنقية الاسلام من الانحرافات عن طريق القرآن والسنة ،احسن محمد بن سعود وفادته في نجد،فناصره وصاهره ،له عدة رسالة ،منهاكتاب التوحيد،كشف الشبهات ،كشف تفسير الفاتحة" (ایضاً ص ۴۵۲)

یہ سب شاخسانہ ہے، تاریخ دعوت وعزیمت جیسی کتابوں کو مصادر و مراجع بنانے کا، افسوس کہ:

ع

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا

لوح وقلم سے بے رخی اور تاریخ نویسی سے بے اعتنائی کے ساتھ ساتھ عالم عرب سے علمی وقلمی رابطے کی کمی کی وجہ سے بھی ایشیا کے عظیم محقق ومصنف امام احمد رضا قادری اور دیگر اکابر اپنے تمام تر علمی وقلمی کارناموں کے باوجود آج تک کما حقہ متعارف نہیں ہو سکے، اور نہ ان کے تحقیقی وعلمی سرمایہ سے عالم عرب اور عالم استشراق آگاہ وفیض یاب ہی ہو سکا۔

قرطاس وقلم کی طرف سواد اعظم اہل سنت کی بے اعتنائی و بے حسی کا شدید احساس رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کو برابر کچوکے لگاتا رہتا تھا، ان ہی کے الفاظ میں قوم کی بے حسی کا ماتم اور تحریر وقلم کی فرماں روائی کی اہمیت وضرورت ملاحظہ فرمائیے، شاید کہ ان کے دردمند دل کی پر خلوص اور پرسوز آواز نئی نسل کے لیے مہمیز کا کام کر جائے:

"ایک عرصہ سے چیخ رہا ہوں کہ زندہ رہنا ہے تو سوچنے اور برتنے کا انداز بدلنا ہوگا، فولاد کی تلوار کا زمانہ ختم ہو گیا، اب قلم کی تلوار سے معرکے سر کیے جا رہے ہیں، پہلے کسی محدود رقبہ میں کفر وضلالت کی اشاعت کے لیے سالہا سال کی مدت درکار ہوتی تھی، اور اب پریس کی بدولت صرف چند گھنٹوں میں شقاوتوں کا ایک عالم گیر سیلاب امنڈ سکتا ہے، ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھئے، آج ہندوستان کا ہر فرقہ قلم کی توانائی اور پریس کے وسائل سے کتنا مسلح ہو چکا ہے، اتنا مسلح کہ اس یلغار سے ہمارے دین کی سلامتی خطرے

سے دوچار ہوتی جارہی ہے۔

بلکہ بعض ایسی بھی جماعتوں کی نشان دہی کرسکتا ہوں، جن کے وجود کا کوئی سررشتہ ماضی میں نہیں ملتا، لیکن اس اجنبیت کے باوجود صرف قلم کے وسائل کے بل پر وہ روئے زمین پر طوفان کی طرح پھیلتی جارہی ہیں، اور ان کا اجنبی لٹریچر سیکڑوں سال سے قابل اعتماد تصنیفات کو نہایت تیزی کے ساتھ پیچھے چھوڑتا جارہا ہے۔

فکری مزاج کی تعمیر میں قلم کو جو اہمیت حاصل ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اور اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ پریس ہی کا یہ کرشمہ ہے کہ فتنہ صبح کو جنم لیتا ہے، دوپہر کو جوان ہوتا ہے اور شام ہوتے ہوتے آبادیوں کے لیے ایک دردناک آزار بن جاتا ہے۔

ان حالات میں جب کہ باطل پرستوں کی یلغار تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے، ہم خفتگان شب کی غفلت کی نیند اور گہری ہوتی جارہی ہے۔

قلم کے ذریعہ دین کی خدمت کے سوال پر سرد مہریوں کا تماشہ قابل دید ہوتا ہے" (پیغام عمل ص ۱۰،۱۱)

سعادت لوح وقلم پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد مجددی کے قلم اعجاز رقم سے بھی ان کے اپنے انوکھے اور دلکش انداز واسلوب میں قلم کی فرماں روائی دیکھئے:

"قرآن کہتا ہے کہ قلم نہ ہو تو جو کچھ جاننا چاہیے یا جاننا چاہتے ہیں، جان نہیں سکتے، خدا نے ہاتھ دیئے...... انسان نے ہتھیار اٹھالیے...... قرآن نے للکارا...... اے ہتھیار اٹھانے والے! ذرا قلم تو اٹھا کر دیکھ...... دیکھ یہ کیسے گل کھلاتا ہے...... تیرے ہتھیار کی لالی چھٹ سکتی ہے لیکن اس کی لالی نہیں چھٹ سکتی ...... وہ انسان جس کو ہتھیار اٹھاتے شرم نہ آتی تھی...... قلم اٹھاتے شرم آتی تھی...... اس کو قلم پکڑنا سکھایا اور ببانگ دہل اعلان کردیا گیا ﴿علّم بالقلم، علّم الانسان مالم یعلم﴾

ہم نے قلم کے وسیلے سے انسان کو وہ کچھ بتادیا جو وہ نہ جانتا تھا۔

یہ اعلان کیا تھا؟ ایک انقلاب تھا...... جس نے صور پھونک دیا اور مردہ پیکروں میں جان

آ گئی۔۔۔۔۔۔قلم نے بہت سے چولے بدلے ہیں۔۔۔۔۔اور نئے نئے روپ دھارے ہیں۔۔۔۔۔کروڑوں بے علموں کو دانائے راز بنادیا ہے“ [ایضاص ۱۷]

لوح وقلم کے حوالے سے مسیحائے لوح وقلم علامہ یس اختر مصباحی کی پراثر سنجیدہ بیانی بھی سن لیجیے:

”پوری دنیا اس حقیقت پر عمل پیرا ہو چکی ہے کہ رزم گہِ حیات کا سب سے کامیاب ہتھیار قلم اور صرف قلم ہے، ہر پڑھا لکھا انسان اس سے بخوبی واقف ہو چکا ہے، کہ جس مکتب فکر کے لٹریچر مارکیٹ میں وافر مقدار میں فراہم ہیں، اس کے فکر وخیال کو قبول عام حاصل ہو رہا ہے، اور اذہان وقلوب اسی کی طرف مائل ہو رہے ہیں“ [ایضاص ۳۳]

پس چہ باید کرد: تو ہمیں اب کرنا یہ ہے کہ کم از کم ہر بڑے دار العلوم میں زیر تعلیم فوقانی درجات کے ہر طالب علم کے ہاتھ میں قرطاس وقلم بھی تھما دیجیے اور کہیے کہ وہ روزانہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھا بھی کرے، مضمون نہیں لکھتا، نہ لکھے، اس سے یہ کہیے کہ روزانہ کے اسباق کی تقریر ہی لکھا کرے، ہر سبق کی نہ سہی، ایک ہی سبق کی سہی، روزانہ، نہ سہی ہفتے میں دو تین دن ہی سہی، مگر لکھے، اور ضرور لکھے۔۔۔۔۔۔اگر مسلسل پابندی اور اہتمام کے ساتھ درسی تقریر ہی لکھتا رہے گا، تو پڑھ کر فارغ ہوتے ہوتے ایک باصلاحیت مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منجھا ہوا مصنف وقلم کار بھی بن جائے گا۔

اور تدریس وتقریر کے ساتھ ساتھ تحریر وتصنیف سے بھی دین کا پائیدار کام کرے گا، اس مجوزہ تربیتی اسکیم پر عمل پیرا ہونے سے، اسے مزید کچھ اور فائدے بھی حاصل ہو جائیں گے:

(۱) زود نویسی آجائے گی (۲) املا درست ہو جائے گا (۳) بہت آسانی سے باتیں ذہن نشیں اور یاد ہو جائیں گی (۴) حسن تفہیم پیدا ہو جائے گا۔

ہم شیدائے اعلیٰ حضرت ہونے کا صرف نعرہ لگاتے ہیں، اور ان کے معمولات وفرمودات پر عمل نہیں کرتے، اعلیٰ حضرت اسٹیج پر سال بھر میں صرف دو تین مرتبہ ہی آتے تھے، آپ نے زندگی بھر صرف اور صرف لکھنے کا کام کیا ہے، بحر العلوم علامہ مفتی عبد المنان اعظمی مدظلہ العالی کی زبانی اعلیٰ حضرت کا حال سنیے:

''مکمل چون سال تک آپ نے فتاویٰ تحریر فرمائے.....آپ خود فرماتے ہیں،ایک وقت میں چار چار سو فتاویٰ جمع ہو جاتے ہیں......ابتدائی بارہ سال کے فتاویٰ کی نقل آپ نے محفوظ نہیں رکھی،بعد کے فتاویٰ کا بھی (صرف) دسواں حصہ محفوظ رہ سکا،جو ۱۳۲۷ھ تک سات خریطوں میں جمع ہوا تھا،سائز ۲۶×۲۰ کے چار صفحہ اور ہر خریطہ کے کل صفحات کی تعداد چودہ سو سے سولہ سو تک تھی،جلد کی ضخامت کا خیال کر کے احباب اور علما کے مشورے سے اس کو بارہ جلدوں میں تقسیم کیا،اس کے بعد آپ نے تیرہ سال تک فتاویٰ تحریر فرمائے [مقدمہ فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۲ رضا اکیڈمی]

اگر اتنے سے بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو اور سنئے اور دسویں صدی ہجری کی دہلی چلیے،یہ ہیں شیخ عبد الحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ جن کی چورانوے سالہ زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف وتالیف میں گذرا تھا،ان کا سوانح نگار لکھتا ہے:

''خود شیخ عبد الحق نے لکھا ہے کہ باوجود مطالعہ اور بحث وتکرار میں بیشتر وقت منہمک رہنے کے میں جو کتابیں پڑھتا،ان کے علاوہ شروح وحواشی جو نظر سے گذرتے تھے،ان کے لیے وقت نکالنے کے بعد لکھنے کی مشق کو ضروریات وقت میں سے شمار کرتا تھا،اور رات کا زیادہ حصہ اور دن کا تھوڑا حصہ مطالعے میں اور رات کا کم اور دن کا زیادہ حصہ لکھنے میں صرف کرتا تھا'' [حیات وخدمات شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۲۱،از ڈاکٹر سلیم اشرف خان]

یہی وجہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے جتنا بڑا تحریری سرمایہ چھوڑا اس کی مثال کم ہی ملتی ہے مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ان دونوں سے اپنی گہری عقیدت ومحبت جتانے کے باوجود ان کے اسوے پر نہیں چلتے،جب کہ ع

''ان المحب لمن یحب یطیع''

آدمی جس کی محبت کا دم بھرتا ہے،اس کی بات مانا کرتا ہے،اور اس کی اداؤں کی نقل بھی کرتا ہے،تو پھر ہماری طرف سے یہ کیسا دعویٰ محبت اور کیسا دعویٰ عقیدت ہے؟

آیئے!اور اب سے عزم کیجیے کہ ہم اپنے بزرگوں کی سنت پر چل کر اپنے نونہالوں کے ہاتھوں میں قلم کا ہتھیار دیں گے اور تحریر وقلم کے ذریعہ دعوت وتبلیغ اور علم وفن کے میدان میں ایک خوشگوار انقلاب

پیدا کردیں گے۔

خدا ہمیں کسی طوفاں سے آشنا کردے
ہمارے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

ہندو پاک کے گنے چنے مدارس میں پرورش لوح وقلم کی طرف توجہ ہے، اور وہ بھی بہت معمولی، باضابطہ اور منظم انداز سے کام شروع کرنے کی ضرورت ہے، فی الحال طلبہ سے درج ذیل طریقوں سے تحریری مشق کرائی جاسکتی ہے (۱) طلبہ سے درسی تقریر لکھوائی جائے (۲) اساتذہ اپنی نگرانی میں طلبہ سے ہفتہ وار یا پندرہ روزہ یا ماہانہ (جداریے) وال میگزین نکلوائیں، (۳) ان جداریوں کے منتخب اور معیاری مضامین پر مشتمل سالانہ میگزین شائع ہوا کرے (۴) وقتاً فوقتاً سال میں کسی عرس یا دیگر مناسب مواقع پر انعامی تحریری مقابلے منعقد کرائے جائیں (۵) تحریر کے تربیتی کیمپوں اور ورکشاپوں میں طلبہ کو تیار کرکے بھیجا جائے، فارغ التحصیل طلبہ کو تصنیفی ٹریننگ کے مراکز میں بھیج کر ٹریننگ کرائی جائے (۷) ڈیلی اور ویکلی اخبارات میں آرٹیکلس اور مراسلات بھجوائے جائیں (۸) کم از کم فراغت کے سال کسی موضوع پر ہر فارغ ہونے والے طالب علم پر ایک تحقیقی مقالہ لکھنا لازم کردیا جائے۔

ان چند تجاویز پر عمل کرکے سال بھر کے اندر ان کے فوائد وثمرات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، الحمد للہ! دارالعلوم علیمیہ جمد اشاہی مسلسل ومکمل نہ سہی، لگا ہے گاہے اور بعض طریقوں پر عمل پیرا ہو کر اپنے طلبہ کے اندر تحریر کے میدان میں ایک خوش گوار پیش قدمی محسوس کررہا ہے۔

۱۹۹۴ء میں یہاں کے طلبہ نے اساتذہ کی تحریک پر "الشباب الاسلامی" کے نام سے عربی سالنامے کا آغاز کیا تھا، جواب تک جاری ہے، اور اب یہی سالنامہ عربی اور اردو میں دو الگ الگ ماہناموں "العلیم" اور "پیام حرم" کے اجرا کا پیش خیمہ ثابت ہو رہا ہے۔ عربی ماہنامہ ادب عربی کے استاذ مولانا احمد رضا صاحب بغدادی کی ادارت میں ان کی غیر معمولی لگن اور محنت سے شائع ہو رہا ہے، اور اس کی اشاعت میں طلبہ کی تنظیم مجلس ثقافت ومعارف کا بنیادی کردار ہے۔

[پیام حرم مارچ ۲۰۰۶ء]

اہانت رسول کیوں؟...... پس منظر وپیش منظر

انسان کامل، محسن انسانیت، رحمۃ للعالمین، شفیع المذنبین، خاتم النبیین، معلم کائنات، پیغمبر اسلام، جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں کی ہدایت کے لیے سب سے اخیر میں خدائی پیغام لے کر دنیا میں تشریف لائے، آپ سے پہلے بنی اسرائیل یعنی قوم یہود میں اسی قوم سے بہت سے نبی اور رسول آتے رہے، یہودی قوم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی نسل سے ہے اور ہمارے نبی کا نسبی تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ہے۔

جب یہودی قوم نے رشد وہدایت اور تبلیغ ودعوت کی اہلیت کھودی اور اللہ کے نبیوں اور رسولوں کی ناقدری کی، ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، حتی کہ ناقدری اور احسان فراموشی کی حد کردی، اور نبیوں کے قتل کے درپے ہوگئے، اور بہتوں کو قتل بھی کردیا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری اور ابدی پیغام ہدایت کے لیے بنی اسماعیل سے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا انتخاب فرمایا، اور آپ کو نبی آخر الزماں بنا کر بھیجا۔

منصب نبوت کے لیے بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل سے الٰہی انتخاب، یہود کو بہت برا لگا، اور ان کے دلوں میں نسلی عصبیت، بغض وحسد، عداوت ومخالفت اور کفر وعناد کی آگ بھڑکنے لگی، اور تورات وانجیل میں مذکور ڈھیر ساری واضح اور کھلی ہوئی نشانیوں اور پیش گوئیوں کے باوجود اور آپ کو سچا نبی جانتے ہوئے بھی یہود آپ کی نبوت ورسالت کے منکر ہوگئے اور آپ کی نعت وصفات پر پردہ ڈالنے لگے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿الذین اٰتینٰھم الکتٰب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم﴾ (البقرہ، ۱۴۶) ترجمہ: جنھیں ہم نے کتاب عطا فرمائی، وہ اس نبی کو ایسے ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔

بنی اسرائیل ہی کی ایک شاخ نصاریٰ بھی ہیں، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے امتی ہیں تورات وانجیل کی بشارتوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہود ونصاریٰ نبی آخر الزماں کو نبی برحق جان کر ان پر ایمان

بھی لاتے، اور ان کی عظمت و محبت کے قائل ہو کر ان کی اطاعت بھی کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاے سابقین سے وعدہ لیا تھا کہ جب میں تمھیں کتاب اور حکمت عطا کروں، پھر تمھارے پاس رسول آجائے، جو تمھاری کتاب کی تصدیق کرے تو تمھیں اس پر ضرور ایمان لانا ہوگا، اور اس کی مدد ضرور کرنی ہوگی۔

علامہ سبکی فرماتے ہیں:

''رسول سے مراد محمد ﷺ ہی ہیں، اور کوئی نبی ایسا نہیں گزرا، جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی نصرت و تائید اور آپ پر ایمان لانے کا عہد نہ لیا ہو اور کوئی بھی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے اپنی امت کو آپ پر ایمان لانے اور تائید و نصرت کی تاکید نہ کی ہو، لیکن یہود و نصاریٰ کو اپنے نبیوں کی اس تاکید و نصیحت کا بھی پاس نہیں رہا، حضور کی نبوت و رسالت زمان و مکان کی اس قید سے بالاتر، ہر دور، ہر جگہ اور ہر قوم کے لیے عام ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

''بعثت الی الناس کافۃ'': یعنی میں سارے لوگوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں، اور خداوند قدوس نے بھی کھلا اعلان فرما دیا کہ اسلام ہی اللہ کا پسندیدہ دین ہے اور سارے ادیان اور تمام شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں۔

ہر نبی اور ہر رسول کی نبوت و رسالت کی تصدیق کے لیے حسی اور معنوی معجزات دیے جاتے ہیں، قرآن ہمارے نبی کا سب سے بڑا معجزہ ہے، جو اپنے مفاہیم و معانی، تعلیمات و ارشادات اور اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بے مثل و بے مثال ہے، جس کا جواب آج تک کسی بھی انسان سے نہ بن پڑا، قرآن نے جہاں پوری فصاحت و بلاغت کے ساتھ کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو بار بار انتہائی حکیمانہ انداز سے خدائے واحد کی وحدت و قدرت پر ایمان کی دعوت دی، وہیں نبی آخر الزماں کی نبوت کی تصدیق اور ان کی محبت و تعظیم اور اطاعت کی بھی دعوت دی، مگر بحیثیت قوم، یہود و نصاریٰ پر اس کا بھی اثر نہیں ہوا۔

بجائے تصدیق و تعظیم اور بجائے محبت و طاعت کے الٹے اس قوم نے کفر و انکار، عداوت و مخالفت، بغض و عناد اور تحقیر و توہین کا راستہ اختیار کیا اور اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ آپ کی ذات اور آپ کے

مشن کے خلاف اول روز ہی سے ایذا رسانی، فتنہ پروری اور سازشوں کا جال بچھانے میں کبھی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔

طاعت ومحبت کے بہت سے اسباب ومحرکات ہوتے ہیں، انھیں میں انسان کی کچھ ذاتی خوبیاں اور صفات بھی شامل ہیں، بلاشبہ ہمارے نبی ظاہری وباطنی انسانی خوبیوں کے اعتبار سے کائنات کے سب سے اعلیٰ وارفع اور کامل واکمل انسان ہیں، اتنی ساری خوبیاں اللہ تعالیٰ نے کسی بھی انسان میں جمع نہیں فرمائیں، سردست دیگر انسانی خوبیوں کو چھوڑ دیجیے، صرف حسن وجمال ہی کو لے لیجیے، تو اس خوبی کے لحاظ سے بھی ہمارے نبی اس لائق ہیں کہ اپنے حسن بے پناہ اور جمال لازوال کی وجہ سے ان سے محبت اور ان کی اطاعت کی جائے۔

ہمارے نبی ایسے حسین وجمیل کہ جن کے چہرۂ زیبا سے سورج بھی حسن ونور کی خیرات مانگے، ہمارے نبی ایسے حسین وجمیل کہ جن کے رخساروں کے غازے کو چاند اپنی مانگوں کا سیندور بنائے، ہمارے نبی ایسے حسین وجمیل کہ جن کے دانتوں کی ترتیب وتنویر سے مہرۂ یمانی، دلکشی کا ہنر حاصل کرے، ہمارے نبی ایسے حسین وجمیل کہ جن کے لبوں کی نزاکت کو غنچہ وگل لاکھوں سلام بھیجیں، ہمارے نبی ایسے حسین وجمیل کہ جن کے ماتھے کے نور سے بھٹکی ہوئی انسانیت راستہ پا جائے، ہمارے نبی ایسے حسین وجمیل کہ جن کے گیسو کی لہک سے کائنات حسن وجمال سنورنے کا سلیقہ سیکھے، ہمارے نبی ایسے حسین وجمیل کہ جن کی آنکھوں سے کلیاں شرمانا سیکھیں، ہمارے نبی ایسے حسین وجمیل کہ جن کے تبسم سے قوس قزح کو رنگ بکھیرنا اور باد نسیم کو چلنا آجائے، ہمارے نبی ایسے حسین وجمیل کہ جن کے نشان قدم سے انسانیت کو منزل کا پتہ مل جائے، ہمارے نبی ایسے حسین وجمیل کہ جن کے حسن گفتار سے بلبلوں کو نغمگی کا طریقہ معلوم ہو، ہمارے نبی ایسے حسین وجمیل کہ جن کے خمیدہ ابرووں سے ہلال اپنی صورت تراشے، .... ایسے حسین وجمیل ہیں ہمارے نبی...... تو کیا اے تن کے گورے من کے کالے انسانو! اب بھی تمھارا دل ہمارے پیارے نبی کی اتنی دلآویز شخصیت کی محبت سے محروم ہی رہے گا...... دیکھو! ایک بار اور دیکھو! ایسا سراپا نہ تمھیں کہیں ملا ہے، نہ کہیں ملے گا تم نے اگر ہمارے پیارے نبی کے سراپا سے زبردستی آنکھیں موندرکھی ہیں، تو کب تک موندے رہوگے، ایک نہ ایک دن قدرت

تمھاری آنکھیں ضرور کھول دے گی۔

آج دنیا میں تم حقوق انسانی کے سب سے بڑے علم بردار بنتے ہو اور اقوام متحدہ کے خود ساختہ آئین کی آڑ میں جب چاہتے ہو شاد و آباد دنیا کو تباہ و برباد کر دیتے ہو

دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا
سراسر موم ہی یا سنگ ہو جا

کیا تم نے ہمارے نبی کی تعلیمات اور کردار کا مطالعہ نہیں کیا؟ جنھوں نے جاہلیت کے ماحول میں سب سے پہلے انسانی حقوق کی صدا بلند کی.......جنھوں نے انسانیت کو امن و سلامتی اور بقائے باہم کا بین الاقوامی مساویانہ اور منصفانہ منشور عطا کیا......جنھوں نے انسانیت کو ایک انٹرنیشنل عدالتی نظام مہیا فرمایا.......جنھوں نے نیچ اونچ، رنگ و نسل اور علاقائیت وطبقاتیت کے تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا......جنھوں نے عربی، عجمی، گورے کالے اور محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا، جنھوں نے ظلم وستم کے پنجے مروڑ دیے......جنھوں نے یتیموں، بیواؤں کو سینے سے لگایا......جنھوں نے غلاموں اور لونڈیوں کو آزادی کا پروانہ عطا فرمایا......جنھوں نے بے نواؤں اور کمزوروں کو قوت و حمایت دے کر طاقت وروں اور استحصالی قوتوں کے مقابل لا کھڑا کیا......جنھوں نے صنف نازک کو ذلت و نکبت کے گڑھے سے نکال کر عزت و عصمت کی ضمانت بخشی......جنھوں نے محنت کشوں کو سماج میں ان کا حق اور وقار دلایا......جنھوں نے جہالت کی شب دیجور میں علم و عرفان کی شمعیں جلائیں......جنھوں نے ہر مرد و زن پر علم سیکھنا لازم قرار دیا...... جنھوں نے اپنی جان کے دشمنوں کے ساتھ بھی بے مثال عفو و درگذر کا مظاہرہ کر کے امن و سلامتی کا پیغام دیا......جنھوں نے دہشت گردی کے سفیروں کو صلح و آشتی کا دوست بنا دیا......جنھوں نے گمراہ و بے راہ انسانیت کا رشتہ رب کائنات سے جوڑ دیا......جنھوں نے بے وفا دنیا کو وفاداری کا عملی سبق دیا......جنھوں نے بے شمار جھوٹے خداؤں کی بساط لپیٹ کر انسانوں کو خدائے واحد کے سامنے جھکا دیا۔

مذہب اسلام، بانی اسلام اور بحیثیت مسلمان، مسلمانوں کا ابتدا سے آج تک کبھی بھی تنگ نظری، جانب داری، ظلم وستم، بے انصافی، مذہبی پیشواؤں کی توہین و تذلیل، انتہا پسندی اور دہشت گردی

سے نظریاتی یا عملی تعلق نہیں رہا، یہ ایک ایسی زندہ حقیقت ہے، جس کا اعتراف ہر حقیقت پسند انسان ہمیشہ کرتا آرہا ہے، دین اور دنیا دونوں محاذوں پر ہمارے نبی کا اصول و کردار بے مثل و بے مثال اور سب سے زیادہ مفید و کامیاب اصول و کردار رہا ہے، آپ نے اپنے اصول و کردار سے دنیا کو سب سے زیادہ متاثر کیا، ایک عیسائی مصنف مائیکل ہارٹ جب عداوت و عصبیت کی عینک اتار کر حقیقت بیں نگاہ سے ہمارے نبی کی سیرت کا مطالعہ کرتا ہے تو اپنی کتاب ''سو عظیم آدمی'' میں برملا بول پڑتا ہے کہ ''یہ واحد تاریخی ہستی ہے جو مذہبی اور دنیاوی دونوں محاذوں پر یکساں طور پر کامیاب رہی، ہم جانتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی میں عرب فتوحات کے انسانی تاریخ پر اثرات ہنوز موجود ہیں، یہ
دینی اور دنیاوی اثرات کا ایسا بے نظیر اشتراک ہے، جو میرے خیال میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ متاثر کن شخصیت کا درجہ دینے کا جواز بنتا ہے۔

یہ عیسائی مصنف دنیا کی منتخب سو شخصیات کی فہرست میں سب سے اوپر ہمارے نبی کا نام رکھنے پر مجبور ہے یہ مصنف خود اپنے نبی عیسیٰ علیہ السلام پر ہمارے نبی کے بلند رتبہ ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''میرا اپنا عقیدہ کہ عیسائیت کی ہیئت سازی میں عیسیٰ مسیح کے کردار کی بہ نسبت اسلام کی تشکیل میں حضرت محمد کا ذاتی اثر کہیں زیادہ نمایاں ہے''۔

اسلام دین فطرت ہے اور انسان کی فطری صلاحیت و ضرورت کے مطابق حقوق و اختیارات دیتا ہے، اور فطری صلاحیت کے مطابق ہی فرائض اور ذمہ داریاں بھی نافذ کرتا ہے، اسلام پوری انسانیت کا خیر خواہ ہے اور بلا تفریق ہر انسان کے لیے مبدا و معاد کی بہتری کا خواہاں ہے اور ہر موقع پر بہی خواہانہ اصول و ہدایات جاری کرتا ہے، اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے، اور رہتی دنیا تک کے لیے پیغام ہدایت ہے، اسلام نفرت کے بجائے محبت کی دعوت دیتا ہے، بے ادبی و اہانت کی جگہ آداب و احترام پر زور دیتا ہے، حق تلفی کی بہ نسبت ادائیگی حقوق کی تعلیم دیتا ہے، تمسخر و استہزا کے برخلاف تعظیم و توقیر سکھاتا ہے، اسلام وہمی دین نہیں، بلکہ اذعان و ایقان کا حامل ہے، اور دلائل کے ذریعہ شکوک و شبہات کا ازالہ کرتا ہے، اسلام حقیقت و واقعیت پر مبنی دین ہے اور اسی کا پرچار کرتا ہے، تخلیت و مصنوعیت سے اس کا

کوئی تعلق نہیں ہے، اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، اس کے پاس عقائد و عبادات کا ایک قابل عمل مستقل اور جامع نظام ہے، اسلام اخلاقی اصول و اقدار کا ایک شاندار اور بھر پور ریکارڈ رکھتا ہے، اسلام ہر دور کے لیے معیشت و اقتصادیات اور حکومت و جہاں بانی کا ایک کامیاب اور مفید ترین دائمی عالمی دستور کا حامل ہے، اسلام کا دامن، جرائم و جنایات کی روک تھام، فتنوں کے سد باب اور ادائیگی حقوق کے لیے قصاص وحدود اور تعزیرات کے ایک مناسب و فطری اور موثر نظام سے مالا مال ہے، اسلام رنگ و نسل، صنف و علاقہ اور ہر قسم کی طبقاتیت اور نیچ اونچ کی تفریق کے بغیر حسب مراتب تمام انسانوں کے ضروری اور جائز حقوق کی ضمانت دینے کے ساتھ خدا کے حقوق کی ادائیگی کی بھی دعوت دیتا ہے، اسلام انسان کو انسان سے جوڑتا ہے، اور پھر تمام انسانوں کو خدا سے جوڑ دیتا ہے، اسلام اپنی ان ہی تعلیمات و ہدایات اور اصول و اقدار کے باعث بڑی تیزی کے ساتھ دنیا پر اثر انداز ہوا اور انسانیت نے اسے قبول کر لیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا پر چھا گیا، اور بانی اسلام ﷺ کا مثالی کردار پوری دنیا کے لیے بے پناہ مقبول آئیڈیل بن گیا۔

دین اسلام چونکہ پوری دنیا کے لیے آخری اور جامع مکمل ترین دین ہے اور بانی اسلام پوری انسانیت کے سب سے زیادہ کامل و جامع اوصاف و کمالات کے حامل انسان اور مثالی داعی اور پیغمبر ہیں، اس لیے اسلام کے آنے کے بعد تمام ادیان و مذاہب اور ساری شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں، اب اگر کوئی قابل اتباع دین ہے تو وہ اسلام ہے اور کوئی لائق تقلید نمونۂ عمل ذات ہے تو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے۔ عقل سلیم کا فیصلہ ہے کہ اب ہر دین و مذہب اور ہر دھرم و ازم سے ناطہ توڑ کر اسلام اور بانی اسلام سے رشتہ جوڑ لیا جائے، اور انسان کامل نبی آخر الزماں کو سب سے زیادہ لائق تعظیم و احترام سمجھا جائے اور ان سے محبت کی جائے اور ان کی اطاعت بھی۔

مگر برا ہو عصبیت اور بغض و حسد کا کہ یہی وہ چیز ہے جو آنکھوں اور دلوں پر پردہ ڈال دیتی ہے، اور انھیں روحانی بیماریوں کے باعث یہود و نصاریٰ نے کبھی بھی بحیثیت مجموعی شروع ہی سے اسلام اور بانی اسلام کو صحیح تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی، اور بجائے محبت و طاعت کے اسلام اور بانی اسلام کے تئیں انکار و طغیان، مخالفت و عداوت، سازش و فتنہ پروری، تذلیل و تحقیر اور ایذا رسانی میں سب

سے آگے رہے ہیں ،اور مسلمانوں کی ذہنی وفکری ،عملی واخلاقی ،مادی وروحانی ،تہذیبی وروایتی ،تعلیمی وتربیتی ،دفاعی وتجارتی ،نسلی وانفرادی ،اقتصادی ومعاشی اور سیاسی وسماجی پسماندگی وبربادی اور انحطاط وزوال کے لیے ہر ممکن تدابیر کرتی آئی ہیں ،اور کررہی ہیں ،مسلمانوں کے ایمان وعقیدے ،ان کی عزت وآبرو اور ان کی جان ومال غارت کرنا ،یہود ونصاریٰ کا سب سے بڑا ٹارگیٹ ہے ،اب چونکہ دنیا ہوشیار ہوچکی ہے ،اس لیے یورپ وامریکہ اور صیہونیت ومسیحیت نے دشمنی کے انداز بھی بدل لیے ہیں ،طب وصحت ،تحقیق وتعلیم ،عالمی تحفظ ودفاع ،انسداد دہشت گردی ،امن عالم ،تجارت ومعیشت ،عدل وانصاف ،مساوات وبرابری ،آزادی رائے ،حقوق انسانی اور حقوق نسواں کے نام پر اقوام متحدہ کے مختلف ذیلی اداروں اور تنظیموں ،سلامتی کونسل ،.W.H.O جنیوا کنونشن ،عالمی بینک ،عالمی عدالت انصاف ،ایمنسٹی انٹرنیشنل اور دیگر تجارتی واقتصادی اور دفاعی عالمی تنظیموں ،اداروں کے چارٹروں اور معاہدوں کا سہارا لے کر ترقی پذیر اور تیسری دنیا اور عرب ممالک کے ساتھ یہودیت وصیہونیت کے قلیل المدتی اور طویل المدتی پروٹوکول اور مسیحی چارٹر کے مطابق منصوبہ بند اور منظم طریقے سے یہود ونصاریٰ انتہائی ذلیل اور گھناؤنا کھیل کھیل رہے ہیں اور اصول کے پردے میں مکمل طور سے بے اصولی کی سیاست کررہے ہیں۔

لیبیا اور عراق کی ناکہ بندی ،پھر دو دو مرتبہ عراق پر حملوں کے ذریعہ اقتصادی ودفاعی حیثیت سے عالمی منظرنامے پر ابھرتے ہوئے عراق کی تباہی اور افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادینا ،پھر ایران وشام کی تباہی کے لیے ناکہ بندی اور حملے کی دھمکیاں دینا اور گاہے گاہے پاکستان اور سعودی عرب کو آنکھ دکھانا ،یہ سب یہود ونصاریٰ کی منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔

یہود ونصاریٰ مسلمانوں کو ان کی شامت اعمال کے سبب مادی طور سے پسماندہ اور تباہ وبرباد کرنے کی کوششوں میں ایک حد تک کامیاب ضرور ہیں ،مگر انھیں اتنے پر اطمینان وقناعت ہرگز حاصل نہیں ہے ،لہٰذا شروع ہی سے ان کی یہ بھی کوشش رہی ہے کہ نبی آخرالزماں کے کردار اور ان کی شخصیت کو مسخ کیا جائے ،اور ان کی شبیہ داغدار بنادی جائے ،اور دنیا کی نظر میں انھیں جسمانی وروحانی حیثیت سے ناپسندیدہ وغیر معقول بنا کر ان کے ماننے والوں کو ان سے دور اور غیروں کو نفور کردیا جائے ،اسی لیے

انھیں کبھی شاعر، کبھی ساحر، اور کبھی مرگی کا مریض کہا گیا، اور مسلمانوں کو رجعت پسند، بنیاد پرست، بنا کر پیش کرنے کی قواعد شروع ہو چکی ہے۔

حال ہی میں یورپی ملک ڈنمارک کے ڈینش زبان کے اخبار "شیلانڈ پوسٹن" (Jylland Posten) کے شمارہ ۳۰ ستمبر ۲۰۰۵ء میں ایک توہین آمیز مضمون کے تحت ایک کارٹون چھاپا گیا ہے، مضمون کی مناسبت سے اس کارٹون میں پیغمبر اسلام اپنے ہاتھوں میں ایک چھری لیے ہوئے ہیں، اور آپ کے سر پر ایک پگڑی ہے، جس کے اوپر بم رکھا ہوا ہے، اس شمارے میں ایک نہیں ۱۲ عدد کارٹون ایک ساتھ شائع ہوئے ہیں، اس کارٹون کی اشاعت کے بعد پوری دنیا میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور پورا عالم اسلام سراپا احتجاج بن گیا ہے، جگہ جگہ مظاہرے ہو رہے ہیں، ملعون کارٹونسٹ اخبار کے مدیر اور ڈنمارک کے وزیر اعظم، نیز حکومت کے خلاف مذمت کی قراردادیں پاس ہو رہی ہیں، مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اہانت رسول کے مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے، اور ایک بین الاقوامی قانون بنایا جائے، کہ آئندہ پھر کوئی اہانت رسول کی جرأت و ہمت نہ کر سکے۔

عالمی خبروں کے مطابق سیکڑوں مسلمان اپنی جانوں کے نذرانے بھی پیش کر چکے ہیں، اہانت رسول ایک ایسا جرم ہے، جو پوری انسانیت کے لیے انتہائی شرمناک بات ہے، اور ہر سنجیدہ شہری اور حکومت کو اس کی مذمت کرنی چاہیے، اور جلد از جلد اس پر روک لگانے کی (بشمول قانون سازی) ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، کیوں کہ رسول کی توہین پوری انسانی برادری کی توہین ہے، مسلمان چاہے کتنا ہی گیا گذرا ہو، لیکن وہ اپنے رسول کی اہانت ہرگز برداشت نہیں کر سکتا، خوش آئند بات یہ ہے کہ دنیا کے تمام مسلمان بے شمار فرقوں میں بٹے ہوئے ہونے کے باوجود ایک آواز ہو کر اہانت رسول کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اور بے مثال اتحاد کا مظاہرہ کر رہے ہیں، خدا کرے اہانت رسول کے شر کی کوکھ سے اسلام کے خیر کا سویرا جنم لے، سارے مسلمان محبت و تعظیم کے نام پر ایک ہو جائیں، سچی بات یہ ہے کہ یہی ایک پوائنٹ ہے، جس پر بکھرے ہوئے مسلمانوں کو پھر سے متحد کیا جا سکتا ہے، اس سے پہلے کسی بھی ایشو پر عالمی سطح پر مسلمانوں میں اتنی مذہبی حساسیت و بیداری، ایمانی حرارت اور اتحاد و یکجہتی کا مظاہرہ کبھی بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

حد تو یہ ہے کہ جزیرۃ العرب اور برصغیر کا وہابی طبقہ بھی حکومتی، تنظیمی اور شخصی حیثیت سے عام خوش عقیدہ مسلمانوں کے ساتھ آنے پر مجبور ہو گیا جب کہ یہ وہ طبقہ ہے جس کی خمیر اہانت رسول سے گوندھی گئی ہے۔

اہانت رسول پوری انسانی برادری کے لیے سب سے زیادہ حساس اور قابل توجہ معاملہ ہے لیکن مغربی دنیا اپنے کانوں میں تیل ڈالے ہوئے، اس طرف سے انتہائی بے اعتنائی برت رہی ہے، شاید امریکہ اور یورپ ایک بار پھر مسلمانوں کی ایمانی حرارت ناپنا اور دینی غیرت و حمیت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ان سے اسی حساب سے نپٹا جا سکے، یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ اور کسی بھی دوسری عالمی تنظیم کے چارٹر میں یا کسی بھی مغربی ملک کے آئین میں اس طرح کا کوئی قانون موجود نہیں ہے، جس کی رو سے اہانت رسول قابل مذمت اور لائق سزا جرم ہو، جب کہ ان کے آئین میں اہانت عیسیٰ کی سزا کا قانون موجود ہے، آخر اسے دوہرا معیار نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟ آخر اپنے نبی کے لیے الگ پیمانہ اور نبی آخر الزماں کے واسطے الگ پیمانہ کیوں ہے؟ اس کی بنیادی وجہ اور اس کا اساسی محرک رسول دشمنی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اسلام کسی بھی نبی کی توہین کی قطعاً اجازت نہیں دیتا، وہ سب کا احترام سکھاتا ہے اور مسلمان بحیثیت نبی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ پر بھی ایمان رکھتا ہے اور انھیں خدا کا سچا نبی مانتا ہے۔

موجودہ کارٹون تنازعہ اور پیغمبر اسلام کی کردار کشی مغربی میڈیا کی پرانی عادت ہے، مسلمانوں کے خلاف یوروپی تعصب و عناد کی تاریخ بڑی پرانی ہے، اور اب یہ نسل در نسل آگے بڑھ رہی ہے، مغرب نے ہمارے نبی کو کبھی اللہ تعالیٰ کا برحق نبی نہیں مانا، اور نہ مسلمانوں کو مسلمان دیکھنا پسند کیا، انھوں نے حضور کو عیسائیت کے بدترین دشمن کے طور پر پیش کیا ہے، مغرب کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کے دل سے حب و اطاعت رسول کا وہ جذبہ نکال باہر کردے، جس جذبے کی بدولت وہ عیسائیت کے لیے خطرہ بنے رہتے ہیں، اور اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی بھی پروا نہیں کرتے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد اس کے بدن سے نکال دو

اسلام اور عیسائیت کے درمیان لڑی جانے والی جنگوں میں عیسائیت کی ہزیمت اور پسپائی کے

بعد مغربی دنیا کو اسلام سے جو شدید خطرہ لاحق ہوا، اس خوف نے مغرب کے عیسائیوں کے لیے معقولیت پسندی کی ذرا بھی گنجائش نہیں رکھی، اور اسی خوف نے انھیں اہانت رسول، اسلام دشمنی، اور مسلمانوں کی فکری و اعتقادی پسپائی اور سیاسی و اقتصادی زوال و انحطاط کی منصوبہ بند پالیسی اپنانے پر مجبور کر دیا ان کا یہی مدفون غم و غصہ کبھی کبھی ابال کھا جاتا ہے، اور کارٹون سازی جیسی احمقانہ اور اوچھی حرکت کا سبب بن جاتا ہے، حالیہ واقعہ اہانت کا ایک پس منظر بقول ایک معروف روسی رکن پارلیمانی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امریکہ کا منصوبہ ہے کہ ایران پر حملہ کرنے سے پہلے اس مقصد کے حصول کے لیے مسلمانوں کو غصہ دلایا جائے، اور جب وہ مشتعل ہو کر احتجاجی مظاہرے کریں، تو دنیا کو باور کرایا جائے کہ مسلمان دہشت گرد، جارح، شدت پسند، جذباتی، غیر مہذب، آزادی رائے کے دشمن اور عالمی امن و سلامتی کے لیے خطرہ ہیں، اور اس طرح ایران پر حملے کے لیے رائے عامہ ہموار ہو جائے اور امریکی جارحیت کو سند جواز مل جائے۔

حالانکہ ایران پر امریکہ کی لشکر کشی مہنگی پڑ سکتی ہے، بہر حال ایران کو افغانستان اور عراق پر نہیں قیاس کیا جا سکتا، اس وقت کی داخلی اور خارجی حقیقت عراق و افغانستان پر حملے سے پہلے کی حقیقت سے کئی معنوں میں مختلف ہے۔

مغربی دنیا کارٹون بنانے اور چھاپنے کو آزادی اظہار رائے کے نام پر جائز ٹھہرا رہی ہے، اور اس کی صفائی دے کر دنیا کو مطمئن کرنا چاہتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس میں نہ تو سنجیدہ ہے اور نہ معقولیت پسند، عالم اسلام اور سنجیدہ دنیا کی بے چینی اس سے دور ہونے والی نہیں، وہ اس وکالت کے ذریعے حقیقت پسند دنیا کو مطمئن نہیں کر سکتی، پوری دنیا باور کر چکی ہے کہ یہ ایک شر انگیز کارروائی ہے مشہور صحافی رابرٹ فرسک یورپی حکمرانوں کے دعووں کی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، یورپی سیاست دانوں کے ان لمبے چوڑے دعووں پر مجھے بہت ہنسی آئی کہ وہ لوگوں کی اظہار کی آزادی یا اخبارات پر کنٹرول نہیں کر سکتے، یہ پوری طرح بکواس ہے، اگر ان کارٹونوں میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی جگہ یہودیوں کے کسی مذہبی پیشوا کو بم کی ساخت کا ہیٹ پہنے دکھایا گیا ہوتا، تو ہمیں دھواں دھار مخالفت کا شور سنائی دیتا۔

ڈنمارک کے ڈینش اخبار کے متعلق اس طرح کی بھی خبریں آرہی ہیں کہ اس نے اپنی اشاعت کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دینے کے لیے یہ کارٹون شائع کیا ہے، اردو کے مشہور صحافی حسن کمال لکھتے ہیں کہ آزادی تقریر کے کسی مغربی یا مشرقی حامی نے یہ احتجاج نہیں کیا کہ اشاعت بڑھانے کے لیے ایسے اوچھے طریقے آزادی اظہار اور صحافتی دیانتداری دونوں اصولوں کے خلاف ہیں، یہی نہیں بلکہ جس آرٹسٹ نے یہ کارٹون بنائے تھے، اس کا بیان سامنے آیا ہے کہ اس نے کچھ عرصہ قبل حضرت مسیح کے کچھ کارٹون بنا کر شیلانڈ پوسٹین کے ایڈیٹر کو بذریعۂ ای میل ارسال کیے تھے، لیکن اخبار کے انتظامیہ نے ای میل ہی پر اس کو جواب دیا کہ اگر یہ کارٹون شائع کیے گئے تو بہت سے لوگوں کے جذبات مجروح ہوں گے، کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اخبار مذکور آزادی اظہار کا علم بردار نہیں، بلکہ بدترین فرقہ پرست ہے، جس اخبار کو عیسائیوں کے جذبات مجروح ہونے کا تو خیال ہو، لیکن جو مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے میں نہایت دریا دلی کا مظاہرہ کرے، اسے دوغلا پن نہیں تو اور کیا کہیں گے؟

ان تمام حقائق کی روشنی میں اب بجا طور سے کہا جا سکتا ہے کہ کارٹون بنانا اور چھاپنا دونوں کام مغرب کے دوہرے معیار کی پالیسی پر مبنی ہے، اور اس میں سراسر بدنیتی، خود غرضی، اسلام دشمنی، بلکہ دہشت گردی کے مذموم عناصر پوشیدہ ہیں، اور یہ ایک سوچی سمجھی سازش ہے، اس جیسے گھناؤنے عمل پر جس قدر بھی شدید ردعمل ظاہر کیا جائے، وہ بجا ہے، ردعمل کی شدت، عمل کی شدت وشناعت ہی کا نتیجہ ہے، لہذا کوفی عنان اور عیسائی دنیا اور وحید الدین خان جیسے اس کے مشرقی ہمنواؤں کو مسلمانوں کو ردعمل میں صبر وضبط اور اعتدال ورواداری کی تلقین کرتے وقت عمل کی شناعت پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے، اور کارٹونسٹ اور اخبار کے مدیر کو بھی لوگوں کے جذبات کا احترام اور رواداری کا درس دینا چاہیے، بلکہ پہلے انھیں کو دینا چاہیے، نہ یہ کہ ان کی وکالت کرنی چاہیے، اور عالم اسلام کو چاہیے کہ وہ مغرب کی سازشوں کو سمجھنے اور ردعمل میں ایسا کوئی اقدام نہ کرے، جو بجائے فائدے کے نقصان کا باعث ہو، اور اس کے ردعمل میں نہایت حکیمانہ اور منصوبہ بند موثر طریقے اپنائے جائیں، جس سے تحریک شاتمت رسول اپنے منطقی انجام تک پہونچ جائے، اور پھر آئندہ کوئی بھی شخص اہانت رسول کی جرأت وہمت نہ کر سکے۔

[پیام حرم اپریل ۲۰۰۶ء]

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے

[فیورک کے تناظر میں]

ہر مسلمان کا بنیادی عقیدہ ہے کہ صرف اسلام ہی سچا، قابلِ احترام اور خدا کا پسندیدہ دین ہے اور دوسرے تمام ادیان و مذاہب باطل و ناقابلِ تسلیم ہیں اور اسلام کے سوا کسی اور مذہب کے احترام اور اس سے اتحاد و وداد کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ایک سچے مسلمان کے دل میں صرف دینِ اسلام ہی کا احترام ہوتا ہے، ہاں مگر اس کا دین دوسرے مذہب اور مذہبی رہنماؤں کو گالی دینا نہیں سکھاتا ، کیوں کہ ردِ عمل میں اس کے مذہب اور مذہبی رہنماؤں کو بھی گالی دی جاسکتی ہے، اسلام حکیمانہ اور مبنی بر موعظت تبلیغ کا حامی ہے، اور جبر و اکراہ اور زور زبردستی کا قائل نہیں ہے۔

اسلام کے پاس مکمل نظامِ حیات اور زندگی کے ہر ہر گوشے کے لئے ضروری قوانین و ضوابط اور احکام و تعلیمات موجود ہیں جو کامیاب دنیوی اور دینی و روحانی زندگی کے لئے اتنے بھرپور اور کافی ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی اور دین و مذہب کی کسی کتاب یا صحیفے کی طرف دیکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے بنیادی دونوں سرچشموں یعنی قرآن و حدیث کو پوری سنجیدگی اور کامل غور و خوض کے ساتھ پڑھا جائے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے، غیر سنجیدہ، سرسری اور غیر حقیقت پسندانہ مطالعہ کبھی بھی اسلام کو سمجھنے میں معین و مددگار نہیں ہوسکتا۔

عناد و عصبیت، جہالت و کم عقلی اور کسی قسم کی مادی منفعت، مال و دولت، نام نہاد عزت و شہرت اور جاہ و حشمت کا حصول اسلام کو صحیح طور سے سمجھنے سے یا سمجھ لینے کے بعد ماننے سے بہت بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے، اور جو انسان بہترین خاندانی، دینی، علمی اور روحانی پس منظر رکھتا ہو اور اسی ماحول میں پرورش پانے اور اسی کی روایات پر ایک زمانے تک عامل ہی نہیں بلکہ داعی رہنے کے بعد اگر اسلامی تعلیمات کو ناقص و ناکافی سمجھ کر اتحادِ مذاہب، احترامِ مذاہب اور تسلیمِ مذاہب کا وکیل اور سرگرم داعی بن جائے اور مادیت کے حصول کے لئے روحانیت کے نام پر عالمی پیمانے پر کاروبار کرنے لگے، تو بھی

کہا جائے گا کہ وہ توفیقِ الٰہی سے محروم ہو گیا ہے اور یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ ایک دیدہ ور اور ذمہ دار عالمِ دین کے لفظوں میں:

"سچی بات یہ ہے کہ دینِ اسلام کا ادیانِ باطلہ سے کسی معنی میں بھی کسی طرح کا کوئی اتحاد ممکن نہیں ہے، اتحادِ مذاہب اور وحدتِ ادیان کا نظریہ ہر صورت میں ایک کفری اور باطل نظریہ ہی رہے گا اور جو بھی اس نظریے کو اپنائے گا وہ ضرور بالضرور کافر و مرتد خارج از اسلام اور نارِ جہنم کا حقدار ہو گا۔

اسی طرح ادیانِ باطلہ کا احترام و تسلیم ہر حال میں اور ہر معنی میں کفر ہے "ایسا احترام و تسلیم ویسا احترام و تسلیم" یہ سب لغو و باطل تقسیم ہے، ادیانِ باطلہ جو (عین کفر ہیں) کا پاس و لحاظ اور اس کی رعایت، کفر کا پاس و لحاظ اور کفر کی رو رعایت ہے اور ظاہر ہے کہ کفر کا پاس و لحاظ اور کفر کی رعایت بھی کفر ہی ہے، اس مقام پر کوئی ایسی تاویل و توجیہ قبول نہیں کی جا سکتی جو زبان و بیان کے معروف و متعارف اصولوں کے خلاف ہو" (صحیفۂ ہدایت ص ۱۰۹، ۱۱۰)

باطل مذاہب سے اتحاد، ان کے احترام اور ان کی تسلیم کو ایک ہی کفر نہیں بلکہ مستقل اور تین الگ کفر قرار دیتے ہوئے علامہ موصوف آگے رقمطراز ہیں:

"نظریۂ وحدتِ ادیان" ہو یا احترامِ ادیانِ باطلہ یا تسلیمِ ادیانِ باطلہ یہ سب مل کر ایک کفر نہیں، بلکہ یہ تینوں، تین کفر الگ الگ ہیں...... کسی کو کافر بنانے کے لئے ایک ہی کفر کافی ہے، چہ جائے کہ تین تین کفر ہوں"

علامہ موصوف "عقیدۂ احترامِ ادیان" پر انتہائی عالمانہ اور معقولی انداز میں جرح و نقد کرتے ہیں اور اس عقیدے کو دینِ حق کی بے حرمتی اور کفر قرار دیتے ہیں:

"اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ احترامِ ادیان و تسلیمِ ادیان دونوں جگہ ادیان کے مفہوم میں ادیانِ باطلہ کے ساتھ دینِ حق بھی شامل ہے، یعنی ہر ہر دین کا احترام و تسلیم مقصود ہے، خواہ وہ دینِ حق ہو ۔۔۔ یا ۔۔۔ دینِ باطل، تو اگر احترام کے مفہوم میں جو عزت و توقیر کا معنی ہے، اس کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے احترامِ ادیان کو مقصد قرار دیا جائے تو پھر ادیانِ باطلہ کا احترام لازم آتا ہے، جو شرعاً کفر ہے اور اگر احترام کا کوئی ایسا مفہوم گڑھ لیا جائے، جس میں عزت و توقیر کا کوئی گوشہ ہی نہ ہو اور اسی معنی

میں احترام ادیان کہنے کو فرض کر لیا جائے، تو پھر ہر طرح کی حرمت وعزت کے معنی سے خالی لفظ احترام کی نسبت جس طرح ادیان باطلہ کی طرف ہو رہی ہے، بالکل اسی طرح اس کی نسبت دین حق کی طرف بھی ہو جائے گی، اور ظاہر ہے کہ احترام کے نام پر دین حق کی یہ بے حرمتی بھی کفر ہے، ایسے لفظ کی اضافت دین حق کی طرف کیسے ہو سکتی ہے؟ جس میں کوئی عزت وحرمت ہی نہ ہو" (ایضاً ص ۱۱۲،۱۱۳)

علامہ موصوف مزید آگے "عقیدۂ تسلم ادیان" کو ایمان کے منافی اور اس کی معقولیت پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں، نیز اس نظریے کی داعی تنظیم کو عجوبۂ روزگار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر "تسلیم ادیان" میں مذکور تسلیم سے اس کا وہی لغوی اور حقیقی معنی مراد لیا جائے، جس کا مراد لینا زبان و بیان اور مقصد "فیورک" دونوں کے لحاظ سے معقول ہے، پھر تو ادیان باطلہ کو بھی ماننا اور قبول کرنا، تسلیم ادیان کے دائرے میں آ جاتا ہے، جو یقیناً اسلامی نقطۂ نظر سے کفر ہے... اور... اگر تسلیم مذکور کا ایسا معنی لے لیا جائے، جس میں مان لینے اور قبول کر لینے کا مفہوم ہی نہ ہو، تو اس صورت میں "تسلیم دین حق" کے لئے بھی دین حق کو مان لینا اور قبول کر لینا ضروری نہ رہ جائے گا، اور ظاہر ہے کہ دین حق کی ایسی تسلیم جس میں دین حق کو قبول کر لینا اور مان لینا نہ ہو، وہ کفر نہیں تو کیا ایمان ہے؟ وہ تنظیم بھی عجائب روزگار میں سے ایک عجوبہ ہوگی، جس میں لفظ تو ایک ہی استعمال کیا گیا ہو، مگر اس کے معانی تنظیم کے ہر رکن کے اعتبار سے الگ الگ ہوں۔

مثلاً فلاں رکن مسلمان ہے، تو اس کے لئے احترام ادیان میں مذکور احترام کا معنی کچھ اور ہوگا، فلاں رکن سوامی وویکانند کا ہم خیال ہے، تو اس کے لئے اس احترام ادیان میں مذکور احترام کا معنی دوسرا ہوگا، اب اگر بالفرض ۲۱ ر رکن اکیس نقطہ ہائے نظر کے ہوں تو اس ایک لفظ احترام کے معنی اکیس ہو جائیں گے اور سب کے سب ایک ہی ساتھ مراد ہوں گے، کیا اس مذکورہ بالا مفروضہ عجوبہ کو معقولیت کے کسی خانے میں رکھا جا سکتا ہے؟ (ایضاً ۱۱۳،۱۱۴)

اتحاد مذاہب کا نظریہ انتہائی نامعقول، غیر فطری، نا قابل تسلیم وعمل اور باطل نظریہ ہے، جو ماضی میں بھی کبھی مقبول اور رائج نہ ہو سکا اور نہ آئندہ ہی اس کا امکان ہے، اتحاد مذاہب اور وحدت ادیان کی تحریکیں ماضی میں بھی اٹھتی رہی ہیں اور ہمیشہ انھیں ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا ہے، اس کی مشہور مثال

اکبر کا ''دین الٰہی'' ہے، جو حکومتی سرپرستی بلکہ جبر واکراہ کے باوجود زیادہ دنوں تک نہ چل سکا اور جتنے دن چلا، ان میں بھی اس کے ماننے والوں کی تعداد چند دنیادار اور مفاد پرست افراد سے تجاوز نہیں کرسکی، اور علمائے حق بالخصوص مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور ان کے معاصرین واخلاف کی خارجی حکیمانہ ترغیب وتبلیغ اور اکبر کی اولاد کے باطنی وقلبی انکار وبغاوت کے باعث بہت جلد ہی غیر فطری ہونے کے باعث اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا اور عام ہندوں اور مسلمانوں میں جگہ نہ پاسکا۔

اکبر کے تلخ تجربے کے بعد شاہ جہاں کے بیٹے دارا شکوہ نے ایک بار پھر ہندو مذہب اور اسلام کو ملا کر ایک نئے متحدہ مذہب کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی تھی، جس سے بدظن ہوکر راسخ العقیدہ مسلمان اس کے بھائی اورنگ زیب کی طرف مائل ہوگئے تھے اور اورنگ زیب مسلمانوں کا ہیرو بن گیا تھا، جس کو متعصب ہندو مورخین آج تک کسی حال میں اچھا حکمراں تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

اس طرح ہندوں اور مسلمانوں کو ملے جلے مذہب کے ذریعہ ملانے کی ناکام کوششیں انفرادی حکومتی اور تنظیمی سطح پر آج تک جاری ہیں، ''فیورک'' تنظیم، اسی کوشش کی پیداوار ہے۔

اسے حسن اتفاق ہی کہیے کہ وحدت ادیان کی تحریکوں کو اور تو اور خود ان کے بانیوں اور داعیوں کے اہل خانہ ہی کی طرف سے سخت مزاحمت اور عدم قبول کا سامنا کرنا پڑا ہے: مثلا خود شہزادہ سلیم یعنی جہانگیر اپنے باپ اکبر کے دین الٰہی کے تئیں آزردہ خاطر اور نفور تھا،

مآثر الکرام میں لکھا ہے: جہانگیر اس دین الٰہی کے اعتقاد سے برگشتہ ہوگیا۔ (ج۲ص ۲۶۷)

اسی طرح دارا شکوہ کے ''نظریہ وحدت ادیان'' کی مخالفت خود اس کے بھائی اورنگ زیب کی طرف سے ہوئی، اورنگ زیب نے تو ''دین الٰہی'' کے بانی اپنے پردادا اکبر کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا تھا:

جد من اکبر نہ بود، اکفر بود یعنی میرا پردادا اکبر (بڑا آدمی) نہیں تھا، بلکہ بہت بڑا کافر تھا

خوشی کی بات ہے کہ وحدت ادیان کی موجودہ تحریک ''فیورک'' کا تعاقب بھی اولاً گھر ہی کے لوگوں کے ذریعہ ہورہا ہے، لہذا اس ناطے ہمارا فرض بنتا ہے کہ تعاقب کرنیوالے کی آواز سے آواز ملا کر تائید کی جائے۔

داراشکوہ نے اپنی کتاب "مجمع البحرین" میں وحدت ادیان کا نظریہ پیش کیا ہے، اس نے یہ کتاب لکھی تو علماء میں ہلچل سی مچ گئی، داراشکوہ ہندو مسلم مذہبی نظریات کی یکسانیت دکھاتے ہوئے لکھتا ہے:

"برہما، بشن اور مہیش۔ جبرئیل، میکائیل اور اسرافیل ہیں۔ روح اور آتما۔ ابوالارواح اور پرماتما۔ ناسوت اور جاگرت۔ ملکوت اور سپن۔ جبروت اور سکھوپت۔ لاہوت اور تریا۔ اسم اعظم اور بید مکھ۔ اللہ اور اوم۔ فرشتہ اور دیوتا۔ مظہر اتم اور اوتار۔ فردوس اعلیٰ اور بیکنٹھ۔ قیامت اور مہاپر لے...... وغیرہ ایک ہیں" (ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ ص ۲۰۸)

داراشکوہ یہ سب ذکر کر کے یہ بتانا چاہتا ہے کہ مراد ایک ہے، لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان کے نام الگ الگ رکھ لیے ہیں اور "اسلامی تصوف" اور "فلسفہ ویدانت" دونوں ایک ہی ہیں، اختلاف محض نام اور تعبیر کا ہے، اہل توحید ان دونوں میں سے چاہے جس کو بھی مانیں، حقانیت تک پہونچانے کی صلاحیت دونوں میں ہے۔

داراشکوہ یہ بھی لکھتا ہے:

اسے قرآن پاک سے بھی تسلی نہ ہو سکی، اس لیے اس نے اپنشد کا مطالعہ شروع کیا، بقول اس کے، توحید کی ساری باتیں اس میں مل گئیں، کیوں کہ قرآن کی ساری باتیں رمزی ہیں اور توریت، انجیل اور زبور میں توحید کا بیان مجمل ہے۔

اس نے اپنشد کے کئی ابواب کا فارسی ترجمہ بھی کیا ہے، وہ اس سے اس قدر متاثر تھا کہ اسے کتاب قدیم، پہلی آسمانی کتاب، بحر توحید کا سرچشمہ، حتی کہ قرآن مجید کی اصل اور کتاب مکنون قرار دیتا ہے، داراشکوہ رام کی روحانیت کا بھی قائل تھا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فاؤنڈیشن برائے اتحاد مذاہب "فیورک" کے کچھ اغراض و مقاصد اور اہداف و نظریات ذکر کر دیے جائیں، تاکہ اس نئی تحریک اور ماضی کی اس طرح کی دوسری تحریکوں کی نظریاتی مماثلت واضح ہو جائے:

(۱) روحانی و معاشی بہبود کی خاطر عدم تشدد کے نظریات پر مبنی سورت روحانی اعلامیہ کے فروغ اور

اس کے نفاذ کی کوشش کرنا، جس کی بنیاد تمام مذاہب کے تسلیم واحترام پر ہے۔

(۲) متعدد مذاہب کے مذہبی تہواروں کا انعقاد، یک جماعتی لنگر، مخلوط مذہبی دعاؤں کے ذریعہ پروگرام کو مقبول عام بنانا۔

(۳) مذہبی ہم آہنگی، نیز سماجی و معاشی بہبود، بین العقائد مکالمات کے لیے مخلوط پلیٹ فارم کی فراہمی۔

(۴) عالمی پیمانے پر اسلام اور تمام مذاہب کی اعلیٰ قدروں کی تشہیر۔ (دستور اساسی نیویارک)

(۵) مختلف نظریات کی قدردانی کی روش کا فروغ۔

(۶) ہر مذہب میں ناقابل انکار حقائق موجود ہیں اور ان میں کافی یکسانیت ہے۔

(۷) اتحاد مذاہب کے دائرے میں رہ کر تعلیمی فروغ۔

(۸) اتحاد مذاہب کو طلبہ کے ذہنوں میں مضبوطی سے بیٹھانا

(۹) لوگوں کو مختلف مذاہب کے متعدد لازمی گوشوں کی تربیت دینا۔ (سورت روحانی اسلامیہ)

(۱۰) دراصل زیادہ تر قدامت پسند مسلمان صوفی نظریے کو ہندو اور عیسائی مذہب سے متاثر مانتے ہیں، ایک صوفی معمولات میں وحدۃ الوجود کو ہندوستنت گورکھناتھ کے نظریے سے متاثر مانا جاتا ہے، کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ صوفی نظریے کی اساس "ہمہ اوست" بھگوت گیتا کے نظریے کا ہی اظہار ہے۔

(انڈیا ٹوڈے ہندی، ۸ مارچ ۲۰۰۰ء)

وحدت ادیان کا نظریہ، ترقی پسندی کے نام پر ترقی معکوس، روشن خیالی کے نام پر فکری ظلمت اور وسیع المشربی کے نام پر دین حق سے انحراف وارتداد کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، مولیٰ تعالیٰ امت مرحومہ کو ایسے اتحاد سے محفوظ رکھے، جو سراسر فتنہ انتشار ہے۔ آمین ثم آمین!!!!

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانِ باطل و حق تو نہ کر قبول

[پیام حرم جون ۲۰۰۶ء]

دینی مدارس کا ارتقائی جائزہ اور حافظ ملت کا کردار

تعلیم خدا سے بندے کا رشتہ مضبوط کرتی ہے، تعلیم طاعت خداوندی کا صحیح اور کامل عرفان عطا کرتی ہے، تعلیم ہی سے خدا کا خوف اور تقویٰ پیدا ہوتا ہے، اور تقویٰ سے بندہ راہ یاب اور دنیا و آخرت میں کامیاب ہوتا ہے، تعلیم ہی سے تہذیب اور سلیقہ مندی آتی ہے، تعلیم ہی عقائد و افکار کی تبلیغ و ترسیل کا ذریعہ ہے اور تعلیم کے بغیر کوئی بھی تحریک و تنظیم یا دین و مذہب نہ محفوظ و باقی رہ سکتا ہے اور نہ ہی ترقی کر سکتا ہے۔

اس لیے اسلام اور بانی اسلام ﷺ نے تعلیم کو غیر معمولی اہمیت دی ہے، حضور خود معلم بنا کر بھیجے گئے اور قرآن میں ہمارے نبی کا خصوصی وصف، تعلیم کتاب و حکمت کو بتایا گیا: "یعلمهم الکتاب والحکمة" تعلیم و تدریس کو سب سے زیادہ معزز پیشہ کہا گیا ہے، حضور نے فرمایا: تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں، جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں، ایک موقع پر اور ارشاد فرمایا: میرے بعد سب سے زیادہ سخی وہ ہے جو علم دین سیکھ کر لوگوں تک پہونچاتا ہے۔

حضور علیہ السلام اور آپ کے خلفا نے اپنے دور میں متعدد صحابۂ کرام کو کتاب و حکمت کی تعلیم کے لیے مختلف علاقوں میں روانہ فرمایا، اور دیکھتے دیکھتے آپ کے "مدرسۂ صفہ" کے تعلیم یافتہ صحابۂ کرام اشاعت علم کے لیے بہت سے خطوں میں پھیل گئے، جنھوں نے نبوی تعلیم کو عام کیا، خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے گورنروں کو فرمان جاری کیا تھا کہ فقہا اور علما کو حکم دیا جائے کہ وہ اپنی مجالس و مساجد میں علم کی اشاعت کریں۔

تعلیم کے لیے مدرسے کا وجود ضروری ہے، ابتدائے اسلام ہی میں صفہ کی شکل میں پہلی دینی درسگاہ اور پہلے اسلامی مدرسے کی بنیاد خود حضور علیہ السلام نے رکھی، جو دن میں آپ کے طالب علم صحابہ کی درسگاہ اور رات میں ان کا دار الاقامہ ہوا کرتا تھا۔

مدرسۂ صفہ آج کے ترقی یافتہ دور کے مدارس کی طرح کا کوئی بہت منظم، باضابطہ تدریسی و اقامتی لوازم سے آراستہ مدرسہ تو نہیں تھا، مگر اپنے مقصود کے اعتبار سے موجودہ باضابطہ روایتی مدارس کی

ابتدائی شکل اور خشت اول ضرور کہا جاسکتا ہے۔

دور صحابہ و تابعین تو کیا ،صدیوں تک بے ضابطہ اور غیر روایتی انداز کے مدارس ذاتی مکانوں اور مساجد میں تعلیم وتدریس کا کام ایک یا چند معلمین کے ذریعہ انجام دیتے رہے ،دنیائے اسلام میں پہلے باضابطہ اسلامی مدرسے کے قیام پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ تقی الدین مقریزی [متوفی ۸۴۵ھ] اپنی تحقیق یوں پیش کرتے ہیں:

"باضابطہ اسلامی مدارس چوتھی صدی ہجری کے بعد وجود میں آئے ،اور سب سے پہلا باضابطہ اسلامی مدرسہ اہل نیشاپور نے "مدرسۂ بیہقیہ" کے نام سے نیشاپور میں قائم کیا"۔[دینی مدارس اور عصر حاضر کے تقاضے ص ۴۲،ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم]

اموی دور میں مکہ معظمہ ،مدینہ منورہ ،کوفہ ،بصرہ ،دمشق اور فسطاط وغیرہ اسلامی شہروں میں دینی تعلیم کے مراکز کام کرنے لگے تھے ،اموی دور اور ابتدائی عباسی دور میں تعلیم وتدریس کا انداز یہ تھا کہ استاذ درسی تقریر کرتا ،طلبہ تقریر کا نوٹ تیار کر لیتے تھے ،پھر بعد میں عباسی دور میں کتابی تدریس کا دور بھی شروع ہوا ،اموی دور تک مدرسے کے لیے کوئی مخصوص عمارت نہیں ہوتی تھی ،دور عباسی میں مسلم امرا ورؤسا کی علمی دلچسپیوں اور دینی و دنیوی ضرورتوں کے سبب شاہی محلوں ،سرایوں ،اور دیگر تاریخی عمارتوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ مدارس کی تعمیر بھی شروع ہوگئی ،ہاں اموی خلیفہ عبد الرحمٰن سوئم نے اسپین میں جامعہ قرطبہ کی بنا ڈالی ،اور اس کے جانشینوں نے صرف شہر قرطبہ میں مزید ۲۳ مدارس قائم کیے۔

پانچویں صدی ہجری میں بغداد میں ملک شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک نے ۴۵۸ھ میں "مدرسہ نظامیہ" قائم کیا ،چھٹی صدی ہجری میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے قاہرہ ،دمشق ،اور موصل میں کئی مدرسے قائم کیے ،ساتویں صدی ہجری میں عثمانی سلطنت کے بانی بنائے سلطنت کے ساتھ ہی مدرسہ بھی قائم کیا ،دیگر عثمانی خلفا مثلاً سلطان محمد فاتح ،سلطان سلیمان ،سلطان سلیم ،اور سلطان عبد الحمید نے اپنے وسیع اسلامی قلمرو میں مدارس اور تعلیمی مراکز کا جال بچھا دیا ،جن میں قیام وطعام کی سہولیات کے ساتھ ،مفت تعلیم اور تعلیمی وظائف کا انتظام تھا۔

عباسی دور میں بغداد کے "مدرسہ مستنصریہ" اور آج کے "جامعہ مستنصریہ" میں اس وقت

چاروں فقہی مذاہب کی تعلیم ہوتی تھی، اس میں ہر مذہب کے ۶۲ رفقیہ تعلیم دیتے تھے۔

الغرض مسلم عثمانی سلاطین نے بے شمار روایتی مدارس قائم کر کے علاحدہ عمارتیں تعمیر کرائیں۔

جب ماوراء النہر اور عراق کے علما نے سیاسی مجبوریوں، اشاعت علم کے جذبوں اور دیگر اسباب کی بنا پر برصغیر ہند کا رخ کیا تو انھوں نے مسلم سلاطین کے تعاون سے ان کی سرپرستی میں سندھ اور ملتان میں مدارس قائم کرنے شروع کیے، پھر دھیرے دھیرے لاہور اور دہلی میں بہت سے مدرسے قائم ہوئے، دہلی اجڑنے کے بعد شیراز ہند جونپور علما کا مرکز بنا اور ایک زمانے تک لودھی و شرقی سلاطین کی سرپرستی میں مدارس قائم ہوتے رہے، پھر یہ سلسلہ مغل دور میں اور زیادہ آگے بڑھا، اور پھیلا۔

فاتح سندھ و ہند محمد بن قاسم کے عہد سے ۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے مسلمان سلاطین نے بھرپور کوششیں کیں، لیکن پھر بھی ۱۸۵۷ء تک باضابطہ مدارس کی تعداد خاطر خواہ نہیں رہی، جن عمارتوں میں تعلیم کا کام ہوتا تھا، ان میں مساجد و مقابر اور خانقاہیں شامل تھیں، اس نہج پر اسلامی ہند کے اوائل سے مغلوں کے دور تک دہلی، آگرہ، جونپور، احمد آباد، اور گجرات میں مشہور اسلامی درسگاہیں قائم ہوئیں۔

روحانی سلاسل کے مشہور بزرگوں نے بھی تعلیم گاہوں کے قیام میں زبردست رول ادا کیا ہے سلسلۂ سہروردیہ کے مشہور بزرگ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مدرسۂ بہائیہ'' کے نام سے ایک شاندار مدرسہ قائم کیا، تا کہ یہاں کے فارغین بحسن وخوبی اسلام کی تبلیغ واشاعت کر سکیں۔

بقول ڈاکٹر غلام یحیٰ انجم ہندوستان میں باضابطہ دینی مدارس کا آغاز محمود غزنوی کے دور (چوتھی صدی ہجری) سے سمجھنا چاہیے......... علما کی صحبت کی بدولت ترویج علم کے سلسلے میں اسے مدارس و مساجد کی تعمیر کا شوق دامن گیر ہوا، تاریخوں میں ملتا ہے کہ ۴۰۹ھ/۱۰۱۸ء میں فتح قنوج سے غزنی واپسی کے بعد انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ اس نے مسجد و مدرسہ کی بنیاد ڈالی، تاریخ فرشتہ کا مصنف لکھتا ہے:

''سلطان محمود غزنوی نے اس مسجد کو اس قدر حسین بنوایا تھا کہ حسن وخوبصورتی کی وجہ سے اسے ''عروس فلک'' کہا جانے لگا تھا، اور اسی مسجد کے کنارے مدرسہ قائم کیا تھا، جس میں عمدہ اور نادر کتابوں کے نسخے فراہم کیے تھے۔ [تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۲۳]

سلطان محمود غزنوی کے بیٹے شہاب الدین مسعود نے بھی اپنے حدود مملکت میں کثرت سے مدارس قائم کیے، محمد تغلق کے عہد میں صرف دہلی میں ایک ہزار مکاتب ومدارس تھے، فیروز شاہ نے انھیں مدارس میں ایک بڑے مدرسے "مدرسہ فیروز شاہی" کا ذکر کیا ہے، جس میں طلبہ کی تعلیم کے ساتھ اقامت کا انتظام بھی تھا، سلطان شمس الدین التمش نے دہلی میں ساتویں صدی ہجری میں "مدرسہ معزیہ" قائم کیا تھا، یہاں کا ایک دوسرا بڑا اور مشہور تعلیمی ادارہ سلطان ناصر الدین بن سلطان شمس الدین التمش کے نام سے منسوب "مدرسہ ناصریہ" بھی تھا، سلطان سکندر لودھی نے آگرہ کے قریب ایک شہر میں کئی عالیشان اسکول اور مدرسے بنوائے، جہاں عرب، ایران اور بخارا سے علما وفضلا آتے تھے، ہندوستان میں مغلوں کی آمد کے بعد مدارس کے قیام وحسن انتظام کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی، شیر شاہ سوری نے بھی مدارس کے قیام سے خصوصی دلچسپی دکھائی، بختیار خلجی نے جب بنگال فتح کیا، تو اس نے اور دیگر امرا نے جگہ جگہ مدرسے بنائے۔

اکبر کے عہد میں آگرہ اور فتح پور سیکری میں بڑی بڑی درسگاہیں کام کر رہی تھیں، شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ) کی تعلیم دہلی کے ایک بڑے مدرسے میں ہوئی تھی، جو پرانے قلعے کے پاس تھا۔

حضرت اورنگ زیب عالم گیر جو خاص دینی مزاج کے مالک تھے، انھوں نے اپنے دور حکومت میں بہت سے مدرسے بنائے اور علما کو مفت خوری سے دور کر کے یا تنخواہ مدرس رکھا، اور سہولتیں فراہم کیں، جونپور کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں، جہاں محمد شاہ کے دور حکومت میں شہر کے اندر بیس مدرسے تھے، اورنگ زیب عالم گیر کے دور ہی میں لکھنؤ کی قدیم بافیض درسگاہ "مدرسہ نظامیہ" فرنگی محل کی بنیاد ڈالی گئی، احمد نگر، بیجاپور اور گنڈہ کی ریاستوں میں بھی یہاں کے حکمرانوں نے کافی مدارس کھولے۔

مغل امپائر کے خاتمے تک اجمیر، دہلی، سندھ، لاہور، آگرہ اور بنگال کے مختلف علاقے بشمول مالدہ، بدایوں، اودھ، بہار، ملتان، کشمیر، لکھنؤ، گجرات، سورت، جونپور، اور دوسرے علاقوں میں کئی سو مدارس کام کر رہے تھے۔

۱۸۵۷ء جسے غدر کا سال کہا جاتا ہے، اس میں اگرچہ سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہو گیا اور دہلی وغیرہ

پر انگریز قابض ہو گئے تھے، لیکن مدارس سسکیاں لے لے کر کسی نہ کسی طرح اپنے وجود و بقا کی جنگ لڑ رہے تھے، اور بہت حد تک نئے مدارس کا قیام رک گیا تھا، یہیں سے مسلمانوں میں تعلیمی انحطاط اور مدارس کے زوال کا دور شروع ہوا، اور دینی درسگاہیں اجڑنے اور برباد ہونے لگیں، مسلم والیان حکومت نہیں رہے، جو مدارس کی مالی سرپرستی کیا کرتے تھے، بہت سے مدارس بند ہو گئے، اب مدارس کا سہارا صرف علما اور مسلم عوام ہی رہ گئے ہیں، ہندوستان پر انگریز حکومت کا پورا دور اسلامی تہذیب اور اسلامی تشخص کے تحفظ و بقا کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوا، آزادی ہند ۱۹۴۷ء سے پہلے ناگفتہ بہ حالات ہونے کے باوجود سماجی تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ دینی ضرورتوں کے پیش نظر علما اور مسلم عوام اور کچھ علاقوں کے بچے کھچے نواب، مدارس کی سرپرستی اور ان کے انتظام کی ذمہ داری جیسے تیسے نبھاتے رہے، اور کچھ نئے مدارس بھی قائم ہوئے، جن میں بریلی کے دار العلوم منظر اسلام، مرادآباد کے جامعہ نعیمیہ، جامعہ اشرفیہ کچھوچھہ، مدرسہ قادریہ بدایوں، اور دار العلوم اشرفیہ مبارک پور کا قیام مدارس اہل سنت میں سرفہرست ہے۔

تقسیم ہند کے وقت مدارس کا حال اور زیادہ برا ہو گیا، بہت سے خوش عقیدہ علما و مشائخ اور خوشحال مسلمانوں کے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے جو مدارس کام کر رہے تھے، ان میں سے بہت سے مدارس بند ہو گئے، بلکہ بعض مدارس برادران وطن کی چیرہ دستیوں کی بنا پر ان کے قبضے میں چلے گئے، اور جو رہ گئے گئے، تو وہ مالی پوزیشن انتہائی خستہ ہونے کی وجہ سے ٹھیک سے کام نہیں کر پا رہے تھے، امن و سلامتی کے خطرے اور معاشی تنگی کے سبب سسک سسک کر دم توڑ رہے تھے، خود دہلی کے اندر بے شمار مدارس تھے، جو بند ہو چکے تھے، یا ہندو فرقہ پرستی کی مار کے ساتھ وہابیت کی یلغار کا شکار ہو گئے تھے، خاص طور سے اہل سنت کے مدارس کا بہت بڑا نقصان ہوا، ہمارے علما و مشائخ نے (خدا معاف کرے) اپنے مدارس و مقابر اور مساجد کا کچھ کم ہی خیال کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی میں صرف ایک "مدرسہ نعمانیہ" کے سوا اہل سنت کا کوئی بھی مدرسہ نہیں رہ گیا، اہل سنت کے سارے بچے کھچے مدارس وہابیوں کے قبضے میں چلے گئے، جن میں دہلی کی شاہی مسجد، فتح پوری کا "مدرسہ عالیہ" بھی ہے، نیز دہلی کی جامع مسجد کے نیا محل علاقے میں آج بھی "مدرسہ حسین بخش" نام کا ایک ایسا مدرسہ بھی موجود ہے، جو دیوبندیوں کے قبضے میں

ہے۔اس مدرسے کا نام ہی پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں اہل سنت کی درسگاہ ہوں، میں جن لوگوں کے قبضے میں ہوں، وہ میرے نام کی روح کے دشمن ہیں، ان کے عقیدے میں میرا نام مشرکانہ ہے، لہذا مجھے ان کے تسلط سے نکالو......راقم نے چند سال پہلے اس مدرسے میں جا کر خود اس مدرسے اور ملحقہ مسجد کا مشاہدہ کیا ہے، مشاہدے کے وقت کی دلی کیفیت کا حال خدا ہی بہتر طور پر جانتا ہے، مجھے بہت سخت حیرانی اور افسوس ہوا کہ کیا یہ وہی مدرسہ ہے، جس میں ہندوستان کے اپنے وقت میں بہت بڑے محدث اور صدر الشریعہ کے استاذ حضرت علامہ وصی احمد محدث سورتی علیہ الرحمہ نے بھی تعلیم پائی تھی؟

اس سے کم ابتر حال دہلی کے علاوہ دوسرے شہروں اور قصبوں کے مدارس ومکاتب اور مقابر ومساجد کا نہیں تھا، بدایوں، لکھنؤ، پٹنہ، پنجاب سب اپنے مرحوم اسلامی آثار اور مساجد ومدارس پر خون کے آنسو بہا رہے تھے۔

اہل سنت کے علما ومشائخ کی غیر معمولی بے اعتنائی سے سیکڑوں مدارس جو بچائے جا سکتے تھے نہیں بچ سکے۔

اس کے برخلاف ہمارے مذہبی حریف بہرحال کسی حد تک اپنی چابک دستی اور بیداری کا ثبوت دیتے رہے، انھوں نے کچھ اپنے مدارس کو بچایا بھی اور کچھ اہل سنت کے مدارس پر قبضہ بھی کیا اور الگ سے بہت سے نئے مدارس قائم کیے، اس لیے آزادی کے بعد کی اجڑی ہوئی دہلی میں ان کے مدارس ومساجد کی کمی نہیں ہے اور ہماری بے حسی اور بے اعتنائی سے پرانی دہلی میں دو چند مساجد کے سوا کچھ بھی نہیں بچا۔

بانیان مسلک دیوبند نے اس معاملے میں غفلت سے کام نہیں لیا، انھوں نے پورے بھارت میں اپنی آنکھیں کھلی رکھیں، حالات کا جائزہ لیتے رہے اور ہر ممکن طور سے اپنا کام کرتے رہے، اور اپنا بہت کچھ بچا کر، ہمارا بہت کچھ لے بھی لیا، جب کہ اس وقت اہل سنت کے پاس ابتدائی شکل میں دار العلوم اشرفیہ مبارک اور بڑے ادارے کی شکل میں دار العلوم منظر اسلام اور شاید کچھ اور دو ایک نمایاں مدارس رہے ہوں، وہابیوں کی طرح ہم نے نہ تو اپنے مدارس کو بچایا اور نہ جو بچے تھے انھیں ٹھکانے سے منظم انداز سے اور اعلی معیار کے ساتھ چلایا، حسب ضرورت نئے چھوٹے مدارس کا قیام تو دور کی

بات ہے آزادی کے بعد بھی بہت دنوں تک یہی حال باقی رہا، اب حالات کچھ کروٹ لے رہے ہیں۔
بات تلخ ضرور ہے مگر حقیقت یہی ہے، ممکن ہے بعض لوگوں کی عقیدتوں کے آبگینوں کو ٹھیس پہنچ رہی ہو۔

آزادی سے بہت پہلے انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں دارالعلوم دیوبند کی انتہائی ابتر حالات میں ایک خوش عقیدہ صوفی عالم دین حاجی عابد حسین صاحب مرحوم نے قائم کیا تھا، جس پر بعد میں کسی وجہ سے مولوی قاسم نانوتوی کا قبضہ ہو گیا تھا، یہ ہندوستان کے آزاد ہونے سے بہت پہلے ہی دیوبندیت کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز اور مسلک دیوبند کا مرجع بن چکا تھا، یہاں انتہائی درجات تک کی تعلیم کا باضابطہ معقول انتظام تھا، اتنا بڑا تعلیمی انتظام شاید برصغیر میں کہیں اور نہیں تھا، اور ہر شہر و قریہ کے عوام کیا، عام علما بھی ان کی بدعقیدگی سے کما حقہ واقف نہیں تھے، اس لیے پورے پورے برصغیر سے طلبہ دیوبند کے دارالعلوم کی طرف کھنچ کھنچ کر جا رہے تھے، اور تعلیم کے ساتھ بدعقیدگی لے کر فوج در فوج نکل رہے تھے، اور دیوبندی اکابر انھیں دہلی کی درسگاہوں کے ساتھ پورے ملک کے مدارس و مکاتب میں داخل کر رہے تھے، نتیجۃً دیکھتے دیکھتے اکثر شہروں اور قصبوں کے پرانے مدارس و مکاتب سمیت نئے قائم شدہ مدارس میں تعلیم اور مدارس کے واسطے وہابیت کا زہر تیزی کے ساتھ پھیلتا گیا اور آبادیاں کی آبادیاں لاشعوری میں اپنے متوارث دین و عقیدے سے دور ہوتی چلی گئیں، اور ان کا کام آج بھی اسی تندہی اور محنت کے ساتھ جاری ہے۔

دوسری طرف تبلیغی جماعت نے پوری چالاکی کے ساتھ روزہ، نماز، اور دین سکھانے کے نام پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں، اس جماعت کی تبلیغی مساعی نے بھی مسلک دیوبند کے فروغ میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔

تعلیم اور مدارس کی طرف خاطر خواہ توجہ کی کمی ہماری روز افزوں عددی قلت کا باعث ہے، تعلیم اور مدارس کے فیضان ہی سے تبلیغی نظام اور جماعتی تنظیم کے لیے باصلاحیت افراد فراہم ہوتے ہیں، اور قوم کے تحفظ و بقا اور تعمیر و ترقی سوچنے والی دور بیں نظر پیدا ہوتی ہے، اور انھیں مدارس سے مساجد اور خانقاہیں بھی آباد رہ سکتی ہیں۔

چودہویں صدی ہجری کے مجدد اعظم اور ملت کے سچے محافظ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قادری علیہ الرحمہ والرضوان کا خدا بھلا کرے، کہ انھوں نے بریلی میں بیٹھ کر جہاں لوح وقلم کے ذریعہ برصغیر کے مسلمانوں کے ایمان وعقیدے کی حفاظت میں اہم ترین کردار ادا کیا، وہیں انھوں نے اپنے خلفا اور تلامذہ کی شکل میں ہر فیلڈ کے افراد بھی پیدا کیے، جنھوں نے تعلیم وتدریس، ارشاد وتبلیغ، تحریر وتصنیف اور جماعت وتنظیم کے لائق اور کارآمد ایسے مخلص افراد بھی پیدا کیے، جنھوں نے خود یا ان کے خلفا وتلامذہ نے کسی حد تک اہل سنت کی لاج رکھ لی اور تعلیم وتنظیم، تبلیغ وارشاد اور تحریر وتصنیف کے میدان میں اہل سنت کی کمان سنبھال لی۔

تعلیم وتدریس اور تحریر وتصنیف کے تعلق سے اعلیٰ حضرت کے خلفا وتلامذہ میں برصغیر کے مدرس علی الاطلاق صدر الشریعہ علامہ مفتی امجد علی اعظمی اور صدر الافاضل علامہ سید نعیم الدین مرادآبادی کا کردار خصوصیت کا حامل ہے، جنھیں دن بدن پست ہوتی ہوئی اہل سنت کی تعلیمی حالت اور وہابی اکابر مثلاً مولوی اشرف علی تھانوی اور خلفائے تھانوی وغیرہ کی پرزور وہابیت ساز دعوتی مساعی کے نتیجے میں اہل سنت کی عددی قلت اور کام کے افراد کی کمی کا بروقت زبردست احساس ہو گیا اور ان دونوں شخصیتوں نے بریلی، مرادآباد، اور دیگر شہروں کے مدارس میں ٹوٹی چٹائیوں پر بیٹھ کر بڑی محنت کے ساتھ مدتوں تعلیمی وتدریسی فریضہ انجام دیا اور پورے اخلاص اور سخت محنت کے ذریعہ بہت سے لائق اور کارآمد افراد پیدا کیے، جنھوں نے ان دونوں ہستیوں کے بعد انھیں کو نمونۂ عمل بنا کر خود بھی درسگاہیں سنبھالیں اور دوسری نئی معیاری درسگاہیں بھی قائم کیں، انھیں دونوں نابغۂ روزگار اور اعلیٰ حضرت کے فیض یافتہ علما سے شرف تلمذ رکھنے والی ایک ذات معمار قوم حافظ ملت علامہ شاہ عبدالعزیز مرادآبادی ثم مبارک پوری بھی ہیں، مدرسہ اشرفیہ مبارک پور کے مربی صدر الشریعہ علیہ الرحمہ نے اپنے شاگرد حافظ ملت علیہ الرحمہ کو یہ کہہ کر مبارک پور بلایا کہ میرا ضلع خراب ہو رہا ہے، تم دارالعلوم اشرفیہ کی خدمت کے لیے مبارک پور چلے آؤ، چنانچہ حافظ ملت نے اپنے استاذ کے حکم پر سو روپے مشاہرہ کی امامت کی ملازمت چھوڑ کر آگرہ سے مبارک پور کا رخ کیا۔

حافظ ملت نے خاص طور سے صدر الشریعہ کے تعلیمی مشن کو اپنی محنت وجانفشانی اور اخلاص کے

ذریعہ بڑی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا، حافظ ملت نے اہل سنت کے تحفظ و بقا اور ملی تعمیر و ترقی کے لیے اپنے استاذ صدر الشریعہ کے خصوصی حکم پر تعلیم کا محاذ سنبھالا اور تعلیم کو تحریک کی شکل دی، اسی تعلیمی تحریک کے نتیجے میں اہل سنت کے پاس سب سے بڑا مرکزی تعلیمی ادارہ "الجامعۃ الاشرفیہ" کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے، جس کی ہمہ گیر تعلیمی کارکردگی کے معترف اپنے اور غیر، مخلص اور معاند بھی ہیں۔

حافظ ملت کی تعلیمی تحریک کے فیض سے برصغیر میں بے شمار نئے چھوٹے بڑے تعلیمی ادارے بھی قائم ہوئے، جو الجامعۃ الاشرفیہ کو آئیڈیل بنا کر معیاری اور اعلیٰ تعلیمی فریضہ انجام دے رہے ہیں اور ان اداروں کے فیض یافتہ علما ہر میدان میں سب سے زیادہ نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

حافظ ملت نے مبارک پور قدم رنجہ فرما کر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا پورے اخلاص و للٰہیت ، استقلال و پامردی اور محنت کے ساتھ استعمال کیا اور اہل سنت کی تعلیمی صورت حال میں ایک خوش گوار، پائیدار، اور تاریخی انقلاب پیدا فرمایا، جو اہل سنت کے تحفظ و بقا، سلامتی و دفاع اور تعمیر و ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ بنا، اگر حافظ ملت نے یہ تعلیمی انقلاب برپا نہ کیا ہوتا تو آج اہل سنت کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی، اس لیے اگر کوئی یہ کہے کہ تعلیمی تحریک اور علمی انقلاب کے ذریعہ حافظ ملت اپنے دور کے سب سے بڑے ملی محسن، معمار قوم، اور میرے سب سے بڑے مرجع عقیدت ہیں تو اس پر چیں بجبیں ہونے کی کوئی وجہ نہیں، یہاں میں حافظ ملت کی تاریخ ساز شخصیت اور ان کے تعلیمی مشن اور کارنامے سے متعلق شارح بخاری علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی کی تحریر کا ایک قدرے بسیط مگر جامع اور فکر انگیز اقتباس پیش کرنا ضروری اور مفید سمجھتا ہوں، جس کی روشنی میں حافظ ملت کی انفرادیت اور ان کی ملی بصیرت سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔

"حافظ ملت قدس سرہ العزیز ایک تاریخی ہی نہیں، تاریخ ساز انقلاب آفریں شخصیت کے مالک تھے، جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر دنیائے سنیت میں نئی روح پھونک کر انقلاب عظیم برپا فرمادیا ہے، اور اہل سنت کے مردہ جسم میں نئی جان ڈال دی ہے۔

اس کی مختصر تشریح یہ ہے: انگریزوں کی شہ اور ان کے تعاون سے ہندوستان میں وہابیت کی بنیاد پڑی وہابیت کے شاطر بانیوں نے اس کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ کسی نئی تحریک کو پروان چڑھانے کے لیے تحریک چلانے والے افراد کی ضرورت ہوتی ہے، سب لوگ نہ پڑھے ہوئے ہیں کہ کتابیں پڑھ کر کسی کسی چیز کو سمجھیں اور نہ پڑھا لکھا آدمی ہر قسم کی کتابیں پڑھتا ہے، جلسوں سے صرف جلسوں کے سامعین متاثر ہو سکتے ہیں، مشائخ صرف اپنے نیاز مند مریدین میں تبلیغ وارشاد کے عادی ہو چکے ہیں، لیکن اگر کسی تحریک کے لیے کچھ افراد ہوں تو وہ افراد تحریک کو گھر گھر پہنچا سکتے ہیں، اس نکتے کو وہابیوں نے خوب اچھی طرح سمجھا، انھوں نے تصنیف وتالیف اور جلسہ وجلوس پر کم توجہ دی، اور اپنی ساری صلاحیت مدارس قائم کرنے پر صرف کر دی، جس کے نتیجے میں وہابیوں کے مدارس کا جال بچھ گیا۔

عوام بے چارے جو وہابیت سے واقف نہیں تھے، اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے لیے وہابیوں کے مدارس میں بھیجنے لگے، جس کے نتیجے میں سنیوں کے بچے وہابی مدارس میں جا کر وہابی ہو گئے، اور انھوں نے نہ صرف اپنے گھر بلکہ خاندان اور دوسرے رشتہ داروں اور اپنی آبادی کے لوگوں کو وہابی بنا دیا جس کی نظیر ایک دو نہیں، سیکڑوں پیش کی جا سکتی ہے، اس سلسلے میں چند اشارے سنتے چلیے:

ایک وقت وہ تھا کہ جب کسی کو تعلیم کا شوق ہوتا تو وہ تن بہ تقدیر دہلی چلا جاتا ابتداء کسی سرائے میں ٹھہرتا، پھر دہلی کے مشہور علما کے گھروں پہ جاتا، ان کے درس میں شریک ہوتا، ہفتہ دو ہفتہ کے بعد وہ ایک یا چند علما کو منتخب کر لیتا، اگر ان عالم صاحب کی نگاہ عنایت ہو گئی تو کہیں اس غریب کا کھانا مقرر ہو گیا، اس میں مزید دشواری یہ تھی کہ صرف ونحو کا مدرس کہیں اور ہوتا، منطق وفلسفہ کا کسی اور محلے میں، فقہ کا کہیں اور، تفسیر وحدیث کا کہیں اور، اس کے برخلاف جب دار العلوم دیوبند قائم ہوا تو وہاں ایک ہی جگہ ہر فن کے مدرس مل جاتے اور آسانی سے قیام وطعام کا انتظام ہو جاتا، جس کے نتیجے میں طلبہ کا عام رجحان دار العلوم دیوبند کی طرف ہو گیا، اس کے برخلاف جب دار العلوم دیوبند قائم ہوا، دہلی اجڑ چکی تھی، خال خال کہیں کہیں نوابوں کے کچھ مدرسے تھے، مگر منتظمین کی بدولت وہ بھی چراغ سحری ہو رہے تھے...... بات بہت لمبی ہو جائے گی، اس کو یہیں ختم کر کے میں اس دور کی بات کروں، جس دور میں حافظ ملت مبارک پور تشریف لائے ہیں، اس وقت پورے ضلع اعظم گڑھ میں اہل سنت کا کوئی مدرسہ نہیں

تھا، مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور میں تھا، مگر اس کی حیثیت ایک معمولی مکتب کی تھی، اس کے برخلاف وہابیوں کے اس ضلع میں آٹھ دس مدرسے تھے، جن کی حیثیت دار العلوم کی تھی، کئی میں دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی تھی، اور شرح جامی تک تو ہر مدرسے میں، ضلع سے ہٹ کر صوبے میں نظر ڈالیے تو بھی بہت دل شکن حالات تھے، بریلی شریف میں منظر اسلام اور مراد آباد میں جامعہ نعیمیہ، کانپور میں احسن المدارس قدیم اور جدید، مدرسہ حنفیہ امروہہ یہ پانچ مدرسے تھے، مدرسہ حنفیہ جونپور آخری ہچکیاں لے رہا تھا، مدرسہ عالیہ رام پور ایک رسمی درسگاہ رہ گئی تھی، لے دے کے منظر اسلام بریلی شریف اور جامعہ نعیمیہ مراد آباد اہل سنت کے طلبہ کے لیے ملجا وماویٰ تھے، ان دونوں مدارس کا نظام یہ تھا کہ طلبہ مسجدوں میں رہتے اور مدرسہ کے وقت میں آکر پڑھتے، اب اگر کوئی طالب علم مسجد نہ پاسکا تو وہ محروم رہ جاتا، اب آپ اس ماحول میں سوچیے کہ کسی کو علم دین کا شوق ہو، لیکن اسے بریلی شریف اور مراد آباد جانے کی وسعت نہیں تو وہ علم سے محروم رہ جاتا، یا اگر کوئی وہاں پہنچا اور اسے مسجد نہیں ملی تو وہ کہیں کا بھی نہیں ہوتا، اسی میں کتنے سادہ لوح سنیوں کے بچے وہابیوں کے ہتھے چڑھ گئے

اس نظام میں ایک خرابی یہ بھی تھی کہ معززین اور شرفا کے بچے ان مدارس میں نہیں جاسکتے تھے، جس کے نتیجے میں کتنے ایسے افراد ہیں، جو سنی خانوادے کے تھے، مگر تعلیم انھوں نے وہابی مدارس میں حاصل کی۔

میں خود اپنی بات بتا رہا ہوں کہ اگر حافظ ملت مبارک پور نہ آئے ہوتے تو میں علم دین حاصل نہیں کر پاتا۔

اس اہم نکتے کو حافظ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کما حقہ محسوس فرمایا کہ جب تک اہل سنت کے مدارس نہیں ہوں گے اور ان مدارس میں طلبہ کے لیے باعزت اور سہولت کے ساتھ تعلیم کا انتظام نہیں ہوگا، وہابیت کی یلغار کو ہم روک نہیں سکتے، ایک اپنی نجی مجلس میں مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی نے وہابیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

''مولانا احمد رضا خان صاحب نے بہت اہم اور مفید دلائل وبراہین سے مضبوط کتابیں تصنیف کیں، اور وہابیوں نے کثرت سے مولوی پیدا کیے، مولانا احمد رضا خان صاحب نے میگزین تیار

کی سپاہی نہیں پیدا کیے، اور وہابیوں نے زیادہ سے زیادہ سپاہی پیدا کیے"۔

یعنی اہل سنت کے پاس عمدہ ہتھیار تھے، مگر ان کو استعمال کرنے کے لیے ضرورت کے مطابق سپاہی یعنی علما نہیں تھے، اور وہابیوں کے پاس سپاہیوں کی وافر مقدار تھی"۔ [حافظ ملت، افکار وکارنامے ص ۱۲/۱۱]

بحمدہ تعالیٰ حافظ ملت نے الجامعۃ الاشرفیہ کے توسط سے اور اپنے فیض یافتہ افراد کے ذریعے بے شمار اچھے معیاری مدارس قائم کر کے کثرت سے باصلاحیت افراد پیدا کیے۔

حافظ ملت کی سیرت سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہر ہر بستی اور ہر ہر شہر میں حسب ضرورت مدارس ومکاتب قائم کیے جائیں اور انھیں پورے اخلاص واتحاد، ایثار وقربانی، اور محنت ولگن کے ساتھ مقررہ نصاب اور متعینہ نظام کے تحت چلایا جائے، اساتذہ وطلبہ پابند ہو کر پڑھیں، پڑھائیں، اور منتظمین ان کی قدر دانی کریں اور ان کی تمام جائز ضروریات اور تعلیمی سہولیات کا مخلصانہ انتظام کریں، اور قوم کے دیگر افراد ہر ممکن تعاون کے ذریعہ مدارس کا خیال رکھیں، کہ تعلیم وتعلم میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو اور مدارس سے کار آمد اور باصلاحیت علما پیدا ہوں اسی میں ہماری بقا اور ترقی ہے، اور مدارس کی خدمت کو دین کی سب سے بڑی خدمت اور فرائض کے بعد سب سے عظیم اور ہمہ جہت نیکی اور سب سے بڑا کار ثواب سمجھیں۔ (وفقنا اللہ تعالیٰ)

[پیام حرم جولائی ۲۰۰۶ء]

لہولہان فلسطین ولبنان اور یہودی عزائم

امریکہ و برطانیہ اور مغربی ممالک کی حمایت سے مختصر سی یہودی مملکت اسرائیل کے ہاتھوں بے رحمانہ اور غیر انسانی بمباری کے سبب ایک کمزور ملک لبنان لہولہان اور مظلوم فلسطین کا غزہ شہر کھلا ہوا قبرستان بن گیا ہے۔

دو ہفتے سے زیادہ عرصے سے لبنان کی حزب اللہ تنظیم اور فلسطین کی منتخب حکمراں تحریک حماس کی سرکوبی اور صفائے کے نام پر خواتین بچوں اور بوڑھوں سمیت بے گناہ رہائشی آبادیوں، اسکولوں ،اسپتالوں، کارخانوں، پلوں اور سڑکوں کو تباہ و برباد کیا جارہا ہے، اس اندھا دھند طاقت کے استعمال کے نتیجے میں اب تک سیکڑوں جانیں جا چکی ہیں، اور پورا شہری ڈھانچہ تباہ ہو چکا ہے، پوری دنیا اسرائیل کی اس منصوبہ بند انسانیت کش اور ظالمانہ دہشت گردی اور انسانی المیے پر خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔

دہشت گردی خواہ طالبان اور القاعدہ کی طرف سے ہو یا کسی اور ملک یا تنظیم یا فرد کی طرف سے، دہشت گردی بہر حال یکساں طور سے قابل مذمت ہے اور ایک جٹ ہو کر اس کی مخالفت اور اس کا مقابلہ ہونا چاہیے، دہشت گردی کا شکار چاہے کوئی بھی قوم یا ملک یا فرد و علاقہ ہو، انسانیت کے ناطے سب مظلوم اور حمایت و دادرسی کے لائق ہیں، دہشت گرد اور دہشت گردی کے شکار لوگوں کے درمیان فرق و امتیاز بجائے خود ایک بہت بڑا جرم ہے، لیکن لبنان اور فلسطین کے معاملہ میں امریکہ و برطانیہ اور دنیا کے اکثر ممالک کی طرف سے پراسرار مجرمانہ خاموشی اور خانہ پری کے طور پر رسمی تشویش کا اظہار انتہائی معنی خیز تفریق اور بے حسی کا مظہر ہے، کیا اسے یہ سمجھا جائے کہ یہاں دہشت گردی کا شکار مسلمان ہیں؟ پوری انسانی دنیا اور خاص طور سے مسلم امہ کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے جمہوری ملک ہندوستان کی پارلیمنٹ نے بیک زبان قرارداد مذمت پاس کی ہے، جو انسانیت دوستی کی ایک روشن مثال ہے، اس کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے، ہم اپنے ملک کی پارلیمنٹ کو اس کے لیے دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں قرارداد سے آگے بڑھ کر اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے کچھ عملی اقدامات بھی کیے جائیں گے تاکہ بے لگام

اسرائیلی حکومت کی دہشت گردی اور ظلم و بربریت کو روکا جاسکے۔

یہود ایک انتہائی قدیم قوم ہے، اس قوم میں اللہ تعالیٰ نے بے شمار پیغمبر بھیجے، یہودیت کی تاریخ پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بے حساب انعامات واحسانات کے باوجود یہ قوم ہمیشہ ناشکری وسرکشی اور الٰہی احکام کی نافرمانی کرتی رہی ہے، جس کی پاداش میں اس قوم پر ذلت ومسکنت مسلط کر دی گئی اور ان پر خدائی غضب نازل ہوتا رہا ہے، ان سب کے باوجود یہ قوم اپنے کو خدا کی محبوب اور عالمی سطح پر دینی وسیاسی ریاست وبادشاہت کا تنہا مستحق سمجھتی رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہود نے کبھی کسی بھی مذہب یا مذہبی رہنما کی بالادستی وحکمرانی دل سے قبول نہیں کی ہے، خواہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دین عیسائیت ہو یا نبی آخر الزماں حضرت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ اور دین اسلام ہو، عیسائی مذہب کے بنیادی عقیدۂ صلیب اور خود قوم یہود کی دانست کے مطابق اسی قوم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی دے کر قتل کیا تھا۔

اور بانی اسلام کے خلاف ہمیشہ یہ قوم سازشیں رچتی رہی ہے، میرے نزدیک یہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے کہ عیسائی عقیدہ پر مشتمل طاقت ور ترین مغربی دنیا اور دنیا کے دوسرے عیسائی ایک طرف یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے نبی کو یہودیوں نے قتل کیا ہے اور پھر یہی عیسائی اور اہل مغرب یہودیوں اور ان کی حکومت اسرائیل کے سب سے بڑے بہی خواہ وہمدرد اور حامی وپشت پناہ بھی ہیں، مجھے آج تک یہ فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا۔

یہودی قوم صرف اسلام اور عیسائیت ہی کی دشمن نہیں، بلکہ یہ خدا دشمن اور انسانیت دشمن بھی ہے۔

یہودیوں کے جدید ترین ترجمہ کتب مقدسہ The Holy Sepulchre شائع کردہ جیوش پبلی کیشنز سوسائٹی آف امریکہ ۱۹۵۴ء میں اسرائیل کے لفظی معنی خدا سے کشتی کرنے والا بتایا گیا ہے۔

اور انسائیکلوپیڈیا آف ببلیکل لٹریچر میں عیسائی علما نے اسرائیل کے معنی "Wrestler With God" یعنی خدا سے کشتی لڑنے والا لکھے ہیں۔

بے وفائی گویا یہود کی سرشت میں داخل ہے، یہ کبھی بھی کسی کے وفادار نہیں رہے، مگر عیاری ومکاری میں بھی ان کا جواب نہیں کہ عیسائی دنیا اور امریکہ وبرطانیہ کو بھی انھوں نے بارہا اپنی چالاکی ومکاری سے ڈسا ہے اور آج بھی ڈس رہے ہیں، لیکن عیسائیت نے ہوش کے ناخون نہیں لیے، اور صرف اسلام دشمنی میں یہودی عزائم کی تکمیل کے لیے آج بھی کوشاں ہے، بقول محمد یحییٰ خان مترجم وثائق یہودیت امریکہ وبرطانیہ اسرائیل کو کسی خطرہ سے بچانا ہی نہیں چاہتے بلکہ صیہونی ریاست کی پارلیامنٹ کی پیشانی پر جو کچھ لکھا ہوا ہے، اس جارحانہ اعلان کو عملی جامہ پہنانا مقصود ہے، اس صیہونی منصوبہ کو انسانی حقوق وآزادی کے لیے فکرمند کسی بھی شخص کے لیے سمجھنا بے حد ضروری ہے۔

۱۸۹۶ء میں سویزرلینڈ کے شہر بال میں صیہونی رہنما تھیوڈور ہرزل کی صدارت میں خفیہ کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے تین سو صیہونی رہنماؤں اور تمیں خفیہ اور عوامی یہودی تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی، اس کانفرنس میں انھوں نے تمام دنیا پر اپنی بالادستی مسلط کرنے کے لائحہ عمل پر غور کیا۔

انھوں نے Zionist Sages Protocols کے نام سے چوبیس نکاتی تجاویز منظور کیں، یہ تجاویز نہایت خفیہ طریقہ سے ترتیب دی گئیں، اور کسی کو بھی جو کانفرنس میں شریک نہیں تھا، ان تجاویز کی ہوا نہیں لگنے دی گئی، لیکن بال کانفرنس کے بعد ایک صیہونی لیڈر کے ساتھ ایک فرانسیسی عورت نے ایک میٹنگ میں رسائی حاصل کرلی، اس نے مذکورہ تجاویز کی دستاویز چرا کر مشرقی روس کے ایک لیڈر تک پہنچادیا، جس نے اپنے سائنس داں دوست نائلس کو وہ دستاویز فراہم کی، نائلس مشرق ومغرب کو مغلوب کرنے کے یہودیوں کے اس سازشی منصوبے کو دیکھ کر بہت زیادہ بے چین ہوگیا، اس نے اس خفیہ صیہونی منصوبے کو ۱۹۰۱ء میں روسی زبان میں شائع کردیا، نتیجۃً روس میں یہودیوں کے خلاف سخت ردعمل ہوا، بہت سے یہودی مارے گئے، لیکن بڑی ہوشیاری سے یہودیوں نے تمام کاپیاں بازار سے غائب کردیں، اس کے بعد جب بھی کسی زبان میں صیہونی پروٹوکولز (وثائق) کی اشاعت ہوئی یہودیوں نے اسے بازار سے غائب کردیا۔ (وثائق یہودیت ص ۱۰،۱۱)

سویت یونین اور امریکہ ایک دوسرے کے خلاف کئی دہائیوں تک سرد جنگ میں مصروف رہے

لیکن ۱۹۱۷ء میں برطانوی وزیر خارجہ لارڈ بالفور نے جو صحرائے فلسطین کو یہودیوں کے قومی وطن بنانے کا اعلان کیا تھا، اس کے مطابق جوں ہی ۱۹۴۸ء میں برطانیہ نے یہودی ریاست کے قیام کا اعلان کیا فوراً ہی ان دونوں سپر طاقتوں نے اسے تسلیم کرلیا، اس صیہونی ریاست اسرائیل کی پارلیامنٹ کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے "اے اسرائیل تیری سرحدیں نیل سے لے کر فرات تک ہیں"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مصر، اردن، شام، لبنان، عراق کا بڑا حصہ ترکی کا جنوبی حصہ اور مدینہ منورہ تک حجاز کا پورا بالائی علاقہ شامل ہے، لہذا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہیں کہ عراق پر امریکی وبرطانوی حملہ اور موجودہ لبنان پر اٹیک اسی عظیم صیہونی ریاست کی توسیع کا حصہ ہے، ۱۹۲۱ء میں ہی ایک انگریز مفکر نے کہا تھا کہ موجودہ دور کے حالات دیکھ کر مجھے پروٹوکولز کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ صورت حال صیہونی منصوبوں کے بالکل مطابق ہورہی ہے، یہ سولہ سال پہلے شائع ہوئے تھے، یہ نا صرف موجودہ حالات پر صادق اترتے رہے ہیں بلکہ آج بھی ویسے ہی اتر رہے ہیں، سوال یہ ہے کہ جب یہودیوں کا منصوبہ یہ ہے کہ دنیا پر حکمرانی کا خواب دیکھ رہے ہیں، جس میں امریکہ اور یورپین ممالک بھی یقیناً شامل ہیں، تو کیا یہ اپنے آپ کو یہودی تسلط اور بالادستی سے بچالے جائیں گے، اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر اسرائیل کی اندھی حمایت اور اس کے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل میں امریکہ وبرطانیہ کی حصہ داری اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے یا اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے؟

بریں عقل ودانش بباید گریست

یا یہ کہا جائے کہ یہودی سازشی ذہن سے دق ہوکر اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے لبنان وفلسطین کے بے گناہوں کا ناحق خون بہانے کی امریکہ ویورپ کی طرف سے اسرائیل کو چھوٹ دے دی گئی ہے، اور دہشت گردی کی سرکوبی کے نام پر اس کی خاموش یا دبے لفظوں میں حمایت بھی کی جارہی ہے۔ یہی پروٹوکولز کی عبارات سے صاف طور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی قوم پوری دنیا اور خاص طور سے یورپ پر حکومت وبادشاہت کا خواب دیکھ رہی ہے، درج ذیل اقتباسات پڑھیے، اور یہودی عزائم کو سمجھنے کی کوشش کیجیے، نیز مغربی دنیا کے عقل پر ماتم کیجیے:

(۱) جب اسرائیل کا بادشاہ اپنے مقدس سر پر یورپ کا تاج رکھے گا، تو دنیا کا قابل احترام

باپ اور حکمراں بن جائے گا۔ (سولہواں وثیقہ)

(۲) جب ہماری بادشاہت قائم ہو جائے گی، ہم اس لفظ (آزادی) کو لغت زندگانی سے خارج کر دیں گے۔ (تیسرا وثیقہ)

(۳) ہمارا مقصد عوام کو معاشی مشکلات سے نجات دلانا نہیں، اور نہ ہی ہمیں اس سے کوئی دل چسپی ہے، ہمیں جس چیز سے دل چسپی ہے وہ اس کے قطعی متضاد ہے، ہمیں ان کی تحقیر و تذلیل سے غرض ہے، کیوں کہ ہم غیر یہود کا صرف خاتمہ چاہتے ہیں، جس کی واحد صورت انھیں ایک دوسرے کے خلاف گتھم گتھا کرانا ہے، ہم عوام میں احتیاجات، ضروریات، نفرت و دشمنی کے جذبات و احساسات ابھار کر اس راہ پر گامزن کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے ہاتھوں ان تمام رکاوٹوں کو دور کر دیں، جو ہماری فتح کی راہ میں حائل ہو رہی ہیں۔ (ایضاً)

(۴) ہمارے بین الاقوامی روابط اور حقوق در حقیقت مقامی حقوق کا صفایا کر دیں گے، ان غیر یہود قوموں پر صحیح معنوں میں ہماری حکمرانی ہوگی۔ (دوسرا وثیقہ)

(۵) (غیر یہود) عوامی نمائندوں کو ہٹانے کے لیے اسی امکان (آزادی کے مجرد تصور) نے ہمیں مختلف ممالک کی عوام کو اپنے ہاتھ میں لینے کا موقع فراہم کیا ہے، چنانچہ ہمیں عہدوں پر تقرر کرانے کا اختیار حاصل ہو چکا ہے۔ (پہلا وثیقہ)

(۶) ہم تمام حکومتوں کو اعلیٰ حکومت (یہودی سپر گورنمنٹ) کے تحت لائیں گے، غیر یہودیوں پر اچھی طرح واضح کر دیا جانا چاہیے، کہ ہم ہر گستاخی و بے ادبی کا سر کچلنے کو روا رکھتے ہیں، اس معاملے میں ہم سخت بے رحم ثابت ہوں گے۔ (ایضاً)

(۷) طاقت اور فریب کاری، سیاسی میدان میں خصوصی طور پر کار آمد چیزیں ہیں، ان کے ذریعے دوسروں کو ہمنوا بنانے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے، لہذا ہمیں قوت و طاقت کا بھرپور استعمال کرنا چاہیے، سیاسی امور میں طاقت ایک کارگر حربہ ہے، بشرطیکہ اسے ہوشیاری سے دبیز پردوں میں ملفوف کر کے استعمال کیا جائے، ان غیر یہودی حکمرانوں کے لیے جو اپنے تاج شاہی کو کسی نئی طاقت (یہود) کے ایجنٹوں کے قدموں میں نہیں ڈالنا چاہتے، دہشت و بربریت، مکر و ریا، کے ذریعے اپنی راہ

پر لایا جا سکتا ہے، دوسروں (غیر یہودیوں) کو دغا دینے اور بیوقوف بنانے میں بھی کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے، اگرچہ یہ حربے سراسر شر ہیں، لیکن اصل مقصد مطلب برآری ہے، اور موثر طریقۂ کار ہے، اگر رشوت، دغا، فریب نیز غداری و بے وفائی کے حربوں سے کامیابی ہو سکے تو ان کے استعمال سے قطعاً گریز نہیں کرنا چاہیے، اگر کسی کی جائداد چھین کر کے اسے اطاعت و فرمانبرداری پر مجبور کیا جا سکتا ہو اور اقتدار اعلیٰ پر قبضہ کرنا ممکن ہو تو کسی پس و پیش کے بغیر ایسا کرنا چاہیے۔ (ایضاً)

(۸) تمام عوامی قوتوں کو ہاتھ میں رکھنے کے لیے ہم شدید مرکزیت پیدا کریں گے، اور نئے قوانین وضوابط کے ذریعہ اپنے محکوموں کی تمام سیاسی سرگرمیوں کو میکانکی انداز میں ایک نئے موڑ پر ڈالیں گے، ہمارے قوانین یکے بعد دیگرے تمام آزادیوں، مراعات اور سہولتوں کو سلب کر لیں گے، جو غیر یہود نے فراہم کر رکھی ہیں، اس طرح مطلق العنانی ہماری سلطنت کا طرۂ امتیاز ہوگی، یہ مطلق العنانی ہر جگہ اور ہر لمحہ اس غیر یہود قوت کا خاتمہ کرنے پر قادر ہوگی، جو ہماری راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرے گی۔ (پانچواں وثیقہ)

(۹) ہماری (یہودیوں کی پوری دنیا پر حکومت کی) منزل اب صرف چند قدم دور رہ گئی ہے جس راہ پر ہم چل رہے ہیں، اس کا بہت ہی کم حصہ طے ہونا باقی رہ گیا ہے، اور ہمارے اس علامتی سانپ کا حلقہ مکمل ہونے والا ہے، جس سے ہم اپنی قوم کے افراد کو تشبیہ دیتے ہیں، جس روز یہ حلقہ مکمل ہو جائے گا، اس روز یورپ کی تمام مملکتیں ایک مضبوط ترین شکنجے کی لپیٹ میں آ جائیں گی۔ (تیسرا وثیقہ)

(۱۰) غیر یہودی اقوام بھیڑ بکریوں کا ایک گلہ ہے، اور ہم ان کا شکار کرنے والے بھیڑیے ہیں۔ (گیارہواں وثیقہ)

(۱۱) جب ہم اپنی سلطنت پر مکمل اقتدار حاصل کر لیں گے تو ہمارے مقررین ان تمام عظیم مسائل کی تفصیلات بیان کریں گے، جو عالم انسانیت کو درہم برہم کر کے بالآخر اسے ہماری تحکیم اور پر امن حکومت کے تحت لانے کا سبب بنے، کیا کوئی شخص کبھی یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس سارے ڈرامے میں دنیا کے تمام اقوام کو ہم اپنے سیاسی منصوبے کے مطابق استعمال کرتے رہے اور کئی صدیاں گذر جانے پر بھی لوگ اس کا اندازہ نہ کر سکے؟ (تیرہواں وثیقہ)

(۱۲) جب ہم اپنی سلطنت میں داخل ہوں گے تو ہم اپنے ''توحیدی'' مذہب کے علاوہ کسی مذہب کو برداشت نہیں کریں گے، خدا کی محبوب قوم کی حیثیت سے ہمارا مقدر خدائے واحد کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے۔ (چودہواں وثیقہ)

(۱۳) غیر یہودی معاشروں میں ہم نے بے چینی، اضطراب، انتشار، مذہب سے بیگانگی اور بغاوت کے بیج بو کر ان کی جڑیں مضبوط کر دی ہیں، اس لیے نظم ونسق کو بحال کرنے اور لوگوں کے دلوں پر حکومت کی قوت کا سکہ جمانے کے لیے ہمیں بے رحمانہ اقدامات کرنا پڑیں گے، اس تشدد کا شکار ہونے والوں پر کوئی ترس نہیں کھائے گا، کیوں کہ سختی پر ہی مستقبل کی فلاح وبہبود اور استحکام مملکت کا انحصار ہوگا، خواہ اس کے لیے ہمیں کتنی ہی قربانیاں دینی پڑیں۔ (چودہواں وثیقہ)

عیسائی یورپ اور امریکہ کی طرف سے ۱۹۴۸ء میں فلسطین کی سرزمین پر مذہبی بنیادوں پر فلسطینیوں کو بے دخل اور جلاوطن کر کے یہودی مملکت اسرائیل کا قیام، اور اس کے توسیع پسندانہ عزائم کی مسلسل کورانہ یا مجبورانہ حمایت سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ یورپ وامریکہ کی تمام مملکتیں یہود کے مضبوط ترین شکنجے کی لپیٹ میں آچکی ہیں، یہودیوں نے بیسویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں ہی یورپ اور امریکہ پر اپنا اس قدر اخلاقی، سیاسی، معاشرتی، ابلاغی اور معاشی دباؤ حاصل کر لیا تھا کہ یہودی خوشنودی حاصل کیے بغیر یہاں کی حکومتوں کے لیے کوئی قدم اٹھانا ناممکن ہو گیا تھا، اور اس کے اس دباؤ میں دن بہ دن برابر اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے، یہاں تک کہ انگلینڈ اور امریکہ میں یہودی لابی کے دباؤ کی وجہ سے اسے کنگ میکر کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کسی وقت میں امریکہ کے صدارتی انتخاب کے ۲۷۰ ووٹوں میں سے ۱۶۹ ووٹ یہودیوں کے رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ امریکی صدارت کے کسی بھی امیدوار کے لیے یہود کو نظر انداز کرنا اپنی شکست کو کھلی دعوت دینا ہے، آج بھی کچھ ایسی ہی صورت حال ہے۔

یہودیوں کے عالمی حکمرانی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے یہودی مفکرین نے ۱۸۹۸ء اور ۱۹۰۵ء کے درمیان کئی خفیہ کانفرنسیں کیں اور ان میں مندرجہ ذیل سہ نکاتی منصوبہ تیار

کیا گیا، جس کی نقل آج بھی برٹش میوزیم کی لائبریری میں محفوظ ہے، اس کے مطابق یہودیوں نے فیصلہ کیا کہ:

(۱) ان کے لیے ایک مستقل وطن کا انتظام کیا جائے (۲) دنیا کے اقتصادی اور مالیاتی نظام پر قبضہ کیا جائے (۳) اسلامی ممالک کا خاتمہ کر دیا جائے۔

پہلا منصوبہ یعنی ایک مستقل یہودی مملکت کا قیام ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی شکل میں پورا ہو چکا ہے، اور دوسرا منصوبہ بھی تقریباً مکمل ہے، اور تیسرے منصوبے اسلامی ممالک کے خاتمے کے لیے یہودی بھرپور کوشاں ہیں، اور جزئی طور سے دھیرے دھیرے شام، مصر، اردن، اور لبنان اور فلسطین کے ایک بڑے حصے پر ۱۹۶۷ء اور بعد میں اسرائیلی قبضے سے یہودیوں کے حوصلے بلند ہوتے جارہے ہیں۔

لبنان پر جاری اسرائیلی یلغار کو بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھا جارہا ہے، لیکن کیا یہودیوں کا عظیم تر اسرائیل کا خواب جلد ہی شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا، اور تمام اسلامی ممالک کا خاتمہ ہو جائے گا؟ ابھی اس کا فیصلہ کرنا جلد بازی ہوگی۔

[پیامِ حرم اگست ۲۰۰۶ء]

روزہ اور مسلمان

عقیدۂ توحید ورسالت کی درستگی کے بعد مسلمانوں پر چار اعمال یعنی، نماز، روزہ، حج، اور زکوۃ کی ادائیگی فرض ہے، ایک مسلمان کے لیے دین اور دنیا میں ہر کام سے زیادہ اہم ضروری یہی چار کام ہیں، ہر کام پر ان چار کی ادائیگی کو ترجیح حاصل ہے، ان کے بغیر کوئی بھی شخص نہ کامل مسلمان ہو سکتا ہے، اور نہ اللہ تعالیٰ کا قریب ومحبوب بن سکتا ہے۔

اسی لیے قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے بار ہا اور جگہ جگہ ان کی تاکید فرمائی ہے، اور ان چار کاموں میں کوتاہی کرنے پر انتہائی سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں اور ان کی ادائیگی پر طرح طرح کے انعامات کی خوشخبریاں سنائی گئی ہیں۔

حق یہ ہے کہ انسان وجن کی پیدائش کا مقصد یہی چار کام ہیں، ان کے بغیر انسان کی زندگی بالکل بے مقصد اور بیکار ہے، اور بے عمل انسان جانور سے بھی بدتر ہے، انھیں چار کاموں میں ایک روزہ بھی ہے، یہ ایک بدنی عبادت ہے اور سال بھر کے انسانی زندگی کے نظام بندگی کو درست کرنے اور کنٹرول میں رکھنے کے لیے مہینے بھر کی ایک روحانی تربیت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر لازم کی ہے۔

روزہ ہجرت مدینہ کے بعد ۲ھ میں فرض ہوا، روزہ دیگر عبادتوں کی بہ نسبت اس حیثیت سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ ایک حدیث قدسی میں مولیٰ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "الصوم لی وانا اجزی بہ" روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دیتا ہوں، اور ایک روایت میں "اجزی بہ" معروف کے صیغہ کے بجائے مجہول کا صیغہ "اجزی بہ" آیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ کی جزا میں ہی ہوں، بندے کے لیے اس سے بڑھ کر انعام اور کیا ہو سکتا ہے کہ مولیٰ کہے: کہ میں ہی جزا ہوں، یعنی رمضان کے روزوں کی وجہ سے مولیٰ تعالیٰ روزہ دار بندے کا ہو جاتا ہے، اور مولیٰ تعالیٰ جس بندے کا ہو جائے دو اس کے لیے اس کی کل نعمتیں ہو جاتی ہیں، بڑے خوش قسمت ہیں، وہ بندے جنھیں رمضان کے روزوں کی توفیق ملتی ہے۔

روزہ کی یہ بھی ایک خوبی ہے کہ نماز حج اور زکوۃ ادا کرنے والوں کے مقابلے روزہ داروں کا تناسب ہمیشہ زیادہ رہا ہے اور روزہ کے معاملے میں خاص طور سے عورتیں بہت حساس اور بیدار ہوتی ہیں ،روزہ دار مردوں کی بہ نسبت روزہ دار عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے ،امید کہ روزہ سے دل چسپی ہی مغفرت کا ذریعہ بن جائے گی ،مولیٰ تعالیٰ روزہ کے صدقہ میں روزہ کی طرح اور دیگر عبادات یعنی نماز ،حج ،اور زکوۃ کی ادائیگی کے تئیں بھی مسلمانوں میں احساس ذمہ داری اور بیداری پیدا فرمائے کہ ان سے بھی کسی کو مفر نہیں ہے ، بلکہ یہ عبادتیں روزے سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہیں۔

روزہ طلوع فجر صادق سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور جنسی تعلقات سے باز رہنے کا نام ہے ،روزہ کی یہی ظاہری شکل ہے ،لیکن روزہ کی روح یہ ہے کہ مذکورہ تینوں چیزوں کے ساتھ ان تمام چیزوں سے بھی باز رہا جائے ، جو روزہ کے مقاصد اور اس کی تکمیل ، حکمتوں اور اخلاقی وروحانی فوائد کے منافی ہیں ، حقیقی اور کامل روزہ وہ ہے جس میں روزہ دار اپنے دل کو غلط خیالات اور فحش احساسات سے دور رکھے اور زبان کو کثرت گفتگو ، بک کلامی ، بکواس ، شور وشغف ، گالی گلوچ ، جھوٹ ، غیبت ، چغلی اور لڑائی جھگڑے کی باتوں سے بچائے اور کان ، آنکھ کو بھی ناجائز وحرام باتوں اور مناظر سے محفوظ رکھے ، گویا وہ روزہ جو دل کے تقویٰ اور زبان ، کان ، آنکھ ، اور دیگر اعضا کی عفت و پاکدامنی کی روسے خالی ہو وہ ظاہری روزہ تو کہا جاسکتا ہے ، مگر روحانی اور حقیقی روزہ نہیں کہا جاسکتا ہے ، جو دین اسلام کا مطلوب ہے اور جس پر اجر ئی بہ جیسے زبردست اجر کی خوشخبری دی گئی ہے۔

روزہ کا ایک مقصد اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ بندہ خورد ونوش کے اس عادی نظام سے آزاد ہو کر سال میں مہینہ بھر زندگی کے کچھ ایسے لمحات گذارے ، جن میں لذت کام ودہن کا سامان دسترس میں ہونے کے باوجود بھوک اور پیاس کا مزہ چکھے ، اور اس میں ایسی روحانی لذت محسوس کرے ، جو نوع بہ نوع پر تکلف اور لذیذ اشیاے خورد ونوش میں بھی محسوس نہیں ہوتی ، اور اسے خلوے معدہ کی حالت میں خلوے خواہش نفسانی سے آزادی ، روحانی لطافت وبالیدگی ، سکون خاطر اور صفائے قلب حاصل ہو۔

لیکن آج کا مسلمان روزہ کے اس عظیم روحانی مقصود کے ساتھ بڑی بے انصافی سے کام لینے لگا ہے ، افطار میں انواع واقسام کے پر تکلف اور لذیذ کھانوں کی ایسی فراوانی اور اس قدر غیر ضروری

اہتمام ہونے لگا ہے کہ روزہ کی مقصدیت ہی فوت ہوگئی ہے، دن بھر بھوکا رہنے کے بعد جب روزہ دار ایسا بھرا پرا اور پر تکلف دستر خوان اپنے سامنے پاتا ہے تو اذانِ مغرب ہوتے ہی ان کھانوں پر ٹوٹ پڑتا ہے، حتی کہ وہ کھانے کی اس لپک اور جھپٹ میں دعائے افطار پڑھنا اور وقت مستحب میں نمازِ مغرب ادا کرنا بھی بھول جاتا ہے اور کھانے کی محویت اسے اتنا بے حس بنا دیتی ہے کہ جب تک حلق تک پیٹ نہیں بھر لیتا، کھانے سے ہاتھ نہیں کھینچتا، ایسی بسیار خوری کے نتیجہ میں جس نے دن بھر کھانے کی تلافی کر دی ہے، روزہ دار اپنے دشمن نفس شیطان پر غالب آنے اور شہوت دبانے کے بجائے مغلوب ہو کر شہوت کو مزید برانگیختہ کر لیتا ہے اور پھر صفائے قلب اور دیگر روحانی فوائد کا حصول تو کہا؟ معدے کے بوجھ سے وہ اتنا سست ہو جاتا ہے کہ عام دنوں جیسی چستی باقی ہیں رہ جاتی اور قیام اللیل یعنی تراویح و تہجد کو بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے۔

بعض لوگ تو ہوس میں معدہ اتنا زیادہ بھر لیتے ہیں کہ اگر سال بھر پیٹ صحیح رہتا ہو تو رمضان میں کثرتِ طعام کی وجہ سے معدہ خراب کر لیتے ہیں، اور صبح سے دوپہر تک نفخ شکم، کچی ڈکار، خروج ریاح اور صعود ریاح کی شکایت کرتے ہیں اور سر درد، الجھن اور چڑچڑاپن میں مبتلا ہو کر انتہائی بے کیفی کا دن گذارتے ہیں، ذرا غور تو کیجیے کیا روزہ کا یہی مقصد اور یہی فائدہ ہے؟

امام غزالی علیہ الرحمہ افطار کی کھانے میں بے احتیاطی پر تنبیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''(روزہ کا) پانچواں ادب یہ ہے کہ افطار کے وقت حلال غذا میں بھی احتیاط سے کام لے، اور اتنا نہ کھائے کہ اس کے بعد گنجائش ہی نہ رہے، اس لیے کہ حلق تک بھرے پیٹ سے بڑھ کر مبغوض، اللہ کے نزدیک کوئی بھری جانے والی چیز نہیں ہے، اگر روزہ افطار کے وقت دن بھر کی تلافی کر دے اور جو دن بھر کھانے والا تھا، وہ اس ایک وقت میں کھالے تو دشمن خدا پر غالب آنے اور شہوت ختم کرنے میں روزہ سے کیا مدد مل سکے گی؟

یہ عادتیں مسلمانوں میں اتنی راسخ اور عام ہو چکی ہیں کہ رمضان کے لیے پہلے سے سامان خوراک جمع کیا جاتا ہے اور رمضان کے دنوں میں اتنا اچھا اور نفیس کھانا کھایا جاتا ہے جو اور دنوں میں نہیں کھایا جاتا، روزہ کا مقصود تو خالی پیٹ رہنا اور خواہشات کو دبانا ہے، تا کہ تقویٰ کی صلاحیت پیدا ہو سکے

،اب اگر معدہ کو صبح و شام تک کھانے پینے سے محروم رکھا جائے اور شہوت اور بھوک کو خوب امتحان میں ڈالنے کے بعد انواع واقسام کے کھانوں سے پیٹ بھر لیا جائے تو نفس کی خواہشات اور لذتیں کم نہ ہوں گی اور بڑھ جائیں گی، بلکہ ممکن ہے کہ بہت سی ایسی خواہشیں جو ابھی تک خوابیدہ تھیں وہ بھی بیدار ہو جائیں۔

رمضان کی روح اور اس کا راز ان طاقتوں کو کمزور کرنا ہے جن کو شیاطین اپنے وسائل کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور یہ بات تقلیل غذا ہی سے حاصل ہوگی، یعنی یہ کہ شام کو اتنا ہی کھائے جتنا اور دنوں میں کھاتا تھا اگر کوئی دن بھر حساب لگا کر ایک وقت میں کھالے تو اس سے روزہ کا فائدہ حاصل نہ ہوگا۔(احیاء العلوم ج ۵ص ۲۱۱)

بعض حضرات روزہ کے دنوں میں وقت گذاری اور بھوک پیاس کے احساس سے بچنے کے لیے اور دنوں کی بہ نسبت زیادہ سوتے ہیں امام غزالی علیہ الرحمہ لوگوں کو تنبیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"(روزہ کے) آداب میں یہ بات بھی داخل ہے کہ دن میں زیادہ نہ سوئے، تاکہ بھوک پیاس کا کچھ مزہ معلوم ہو، قویٰ کا ضعف کا احساس ہو، قلب میں صفائی پیدا ہو، اسی طرح ہر شب کو اپنے معدہ کو اتنا ہلکا رکھے کہ تہجد اور اوراد میں مشغولی آسان ہو، اور شیطان اس کے دل کے پاس منڈلا نہ سکے، اور اس صفائی قلب کی وجہ سے عالم قدس کا دیدار اس کے لیے ممکن ہو" (ایضا)

خلاصہ یہ ہے کہ روزہ میں کم کھائے، کم بولے، اور کم سوئے، ہر انسان روح او جسم سے مرکب ہے، اور اس کے اندر روحانیت اور جسمانیت کی کشمکش ہمیشہ جاری رہتی ہے، ہر انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کا مکلف بنایا گیا ہے کہ وہ اپنی روحانیت کو جسمانیت پر غالب رکھنے کی کوشش کرے، اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں انسان کی مدد اور تعاون کے لیے محض اپنے فضل وکرم سے دو مددگار بھی عنایت فرمایا ہے:

ایک داخلی مددگار، یعنی عقل، اور ایک خارجی مددگار یعنی شریعت، انسان کے یہ دونوں قدرتی مددگار ہر وقت انسان کو ایسے اقدامات اور طور طریقوں سے روکتے رہتے ہیں، جو انسان کی جسمانیت اور حیوانی جبلت کے غلبے اور روحانیت کی مغلوبیت کا سبب ہوتے ہیں، لیکن اکثر حالات میں عقل و شریعت

کی رہبری اور تعاون سے فائدہ نہیں اٹھاتے، اور عقل وشریعت کے احکامات کو نظر انداز کرتے رہتے ہیں، اور ہوتا یہ ہے کہ جب انسان عقل وشریعت کی بندشوں اور قدغنوں سے بالکل بے پروا ہو جاتا ہے، تو اس بے قدری کے نتیجہ میں رحمت الٰہی اس بندے سے روٹھ جاتی ہے، اور اس انسان کی روحانیت اور حیوانی جبلت ایک دن اتنی زیادہ طاقت ور اور زبردست ہو جاتی ہے کہ وہ انسان کی روحانیت کو مغلوب کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی عقل اور شریعت کے تقاضوں کو بھی مغلوب کر دیتی ہے، اور پھر انسان کے جسمانی رجحانات اور اس کی نفسانی خواہشات کو عقل وشریعت، اخلاق وروحانیت، صالح فطری جذبات واحساسات اور اعصاب پر مکمل بالادستی حاصل ہو جاتی ہے، اور انسان کی سرگرمیوں کا پورا نظام معدے اور مادہ کی تسکین کی خاطر نفسانی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے، اور اسے بالکل یہ احساس نہیں رہ جاتا کہ وہ بندۂ شیطان ہے، یا بندۂ رحمٰن؟ اور اس انسان سے خیر وشر اور نفع ونقصان اور حرام وحلال کی تمیز اس حد تک اٹھ جاتی ہے کہ وہ سانڈ بن جاتا ہے اور خواہشات کی تکمیل میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں رہ جاتی، اور ہر ممنوع وغیر ممنوع چراگاہ میں منہ مارنے لگتا ہے، اور اس کے نفس کو اب ہر وہ چیز گراں معلوم ہونے لگتی ہے، جو اس کی راہ میں مزاحم ہو اور وہ انسان آخرت کے احتساب اور جزا وسزا کا تصور بھی کھو دیتا ہے۔

پھر ایسا انسان کبھی کبھی تو زندگی بھر کے لیے عبادت اور میلان عبادت سے محروم ہو جاتا ہے اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی فراغ قلب اور تیقظ وبیداری نصیب نہیں ہوتی اور اگر کسی لمحے سوچتا بھی ہے، تو اس سوچ کی لو اتنی مدھم ہوتی ہے کہ غفلت کا معمولی جھونکا بھی اسے بجھا دیتا ہے، یا پھر نصیبہ یاوری کرتا ہے، اور یہ انسان عبادت کرنے پر آمادہ بھی ہو جاتا ہے، تو عبادت میں اس کا دل نہیں لگتا، عبادت اس کے لیے بوجھ معلوم ہوتی ہے اور انتہائی بے دلی اور بے کیفی کے ساتھ جیسے تیسے عبادت سے الگ ہو جاتا ہے، گویا وہ قفس میں تھا، اور اب آزاد ہو گیا، اس کو اس عبادت میں کوئی روحانی اور قدرتی لذت نہیں ملتی، وجہ کیا ہے؟ بس یہ کہ "انها لكبيرة الا على الخاشعين" "وہ عبادت بوجھ ہے، سوائے ڈرنے والوں کے، یعنی غلبۂ خواہشات کے سبب جزا وسزا کا احساس اور احتساب مولیٰ کا خوف دل سے جاتا رہا۔

تو اب ضروری ہوا کہ خواہشات کو دبایا اور مغلوب کیا جائے اور عقل وشریعت سے مدد لی جائے عقل نے کہا: جب تمھاری خالق مولیٰ تعالیٰ ہے، تو تنہا وہی لائق طاعت وعبادت بھی ہے، اور اس نے

طاعت وعبادت کے طریقے سکھانے کے لیے شریعت بنائی ہے، چنانچہ شریعت سے رجوع کیا گیا،تو شریعت نے کہا:''اے بندۂ خواہشات!''الصوم جنة''روزہ خواہشات سے بچنے کے لیے ڈھال ہے،اس لیے روزہ رکھا کرو۔

امام غزالی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''روزہ کا مقصد یہ ہے کہ انسان امکانی حد تک فرشتوں کی تقلید کرتے ہوئے خواہشات سے دست کش ہو جائے،اس لیے کہ فرشتے بھی خواہشات سے پاک ہیں اور انسان کا مرتبہ بھی جانوروں سے بلند ہے،نیز خواہشات کے مقابلہ کے لیے اس کو عقل وتمیز کی روشنی عطا کی گئی ہے،البتہ وہ فرشتوں سے اس لحاظ سے کم تر ہے کہ خواہشات اکثر اس پر غلبہ پالیتی ہیں اور اس کو ان سے آزاد ہونے کے لیے سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے،چنانچہ جب وہ اپنی خواہشات کی رو میں بہنے لگتا ہے تو اسفل السافلین تک جا پہنچتا ہے اور جانوروں کے ریوڑ سے جا ملتا ہے،اور جب اپنی خواہشات پر غالب آتا ہے تو اعلیٰ علیین اور فرشتوں کے آفاق تک پہنچ جاتا ہے''۔(احیاء العلوم ج ۱/ ۲۱۲)

حاصل یہ ہے کہ خواہشات کو دبانے،جسمانیت کو مغلوب کرنے اور معدہ پرستی کو ختم کرنے کے لیے قدرت کی طرف سے سال میں رمضان بھر انسان کو روزہ کا مکلف کیا گیا،تاکہ انسان کا ایمان جاگتا رہے اور اس کی روحانیت،جسمانیت،مادیت کی کثافت سے پاک ہو کر اتنی غالب اور طاقت ور ہو جائے کہ اسے ملأ اعلیٰ سے نسبت حاصل ہو جائے اور روح وقلب کی تاریک وتنگ فضا اتنی روشن اور کشادہ ہو جائے کہ جس میں وہ پرواز کر کے اپنے مولیٰ کا قریب ومحبوب بن جائے اور اس کا دل ایسا صاف وشفاف آئینہ بن جائے کہ جب بھی ذرا گردن جھکائے،اسے اس میں جلوۂ یار نظر آنے لگے۔

[پیام حرم ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۶ء]

شذرات

دینی مدارس ومکاتب مسلمانوں کے لیے پاور ہاوس اور محفوظ قلعے کی حیثیت رکھتے ہیں، مدارس ومکاتب کی اہمیت غیروں کے یہاں بھی مسلم ہے، مسلمانوں کے ہاتھ سے جب حکومت جاتی رہی تو مسلمان قوم کی دینی قیادت وسربراہی اور مذہبی تربیت کی ساری ذمہ داری مدارس ومکاتب ہی کے سرآن پڑی اور ان مدارس ومکاتب نے اس سلسلے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

خاص طور سے آزادی کے بعد سے اب تک قوم مسلم کی توقعات کا مرکز ومحور یہی مدارس رہے ہیں، ان مدارس ومکاتب نے جہاں عام مسلمانوں کی دینی تربیت کی، وہیں تعلیم وتربیت اور اصلاح وتبلیغ، تحفظ ودفاع اور فلاح وبہبود کے لائق افراد بھی پیدا کیے، جنھوں نے مساجد، خانقاہوں، مدرسوں، تنظیمی اداروں، انجمنوں اور تبلیغی واشاعتی نیز سیاسی وسماجی پلیٹ فارموں سے مسلم امہ کے ایمان وعقیدے کی حفاظت کی اور اسے صاحب کردار وعمل بنائے رکھنے کا اہم فریضہ انجام دیا۔

اسی وجہ سے مدارس ومکاتب ہمیشہ اغیار کے نشانے پر رہے ہیں اور خاص طور سے اس وقت پوری دنیا میں یہود ونصاریٰ اور ہندوستان میں ہندوتوا کے علم بردار فرقہ پرست برادرانِ وطن کی آنکھوں کا کانٹا بنے ہوئے ہیں اور آئے دن ان مدارس ومکاتب کو سبوتاژ کرنے کی سازشیں ہوتی رہتی ہیں، دشمن کو یقین ہے کہ جس دن یہ مدارس ومکاتب ختم کردیے گئے، یا ان کی روح نکال دی گئی، اس دن ان کا کردار ختم ہوجائے گا اور مسلم قوم بے سہارا ہوجائے گی، اور قیادت وتربیت کے ان مراکز کے خاتمے کے بعد مسلمانوں پر قابو پانا آسان ہوجائے گا۔

یہ مدارس ومکاتب جس قدر مضبوط ومستحکم ہوں گے، اسی قدر مسلم قوم کو قوت وطاقت پہونچاتے رہیں گے، ان دینی تعلیمی اداروں کا استحکام جہاں اور بہت سی خارجی چیزوں پر مبنی ہے، وہیں براہِ راست ان سے قریبی تعلق رکھنے والے افراد یعنی انتظامیہ، اساتذہ اور طلبہ کے اخلاص ومحنت اور استقلال پر بھی مبنی ہے، ان تینوں چیزوں کے بغیر مدارس کے قیام کے عظیم ہدف تک نہیں پہونچا جاسکتا۔

لیکن کیا اس پہلو سے مکاتب ومدارس کی صورت حال اطمینان بخش ہے؟ اگر نہیں تو پھر

اسباب کا پتہ لگا کر اصلاح حال کی فکر کرنا انتہائی ضروری ہے اور اس طرف سے غفلت ہمیں صدیوں پیچھے کر دے گی، حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک ہم نے غفلت برتی اور جتنے مدارس ومکاتب کی جہاں جہاں ضرورت رہی، نہ ہم اتنے ادارے قائم کر سکے اور نہ موجودہ اداروں کو صحیح معیار پر چلا سکے، الا ماشاء اللہ، اس لیے خوش عقیدہ، سادہ لوح مسلم عوام کی ایک بڑی تعداد ہمارے حریفوں کا شکار بن گئی اور مطلوبہ مقدار کے مطابق افراد کار بھی پیدا نہ کیے جا سکے۔

آزادی کو ساٹھ سال پورے ہونے کو ہیں، نقصان بہت ہو چکا ہے، بڑی سنجیدگی سے اس اہم موضوع پر غور وفکر کر کے مدارس ومکاتب کے نظام کی اصلاح اور اساتذہ وطلبہ کے فرائض اور کارکردگی کے احتساب کی ضرورت ہے، انفرادی غور وفکر کے ساتھ ساتھ اجتماعی طور سے بھی مل بیٹھ کر جائزہ لینا چاہیے، بہتر یہ ہوگا کہ بڑے تعلیمی ادارے اس اہم موضوع پر بھی سیمینار منعقد کریں۔

الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور سواد اعظم اہل سنت کا سب سے بڑا ادارہ ہے، اس سے سواد اعظم کو اس سلسلے میں بھی بڑی امید وابستہ ہے، خوشی کی بات ہے کہ سنی علما کونسل گھوسی کی پہل بر صغیر کے مدرس علی الاطلاق صدر الشریعہ مولانا مفتی امجد علی قادری علیہ الرحمہ مصنف بہار شریعت کے یوم وصال ۲ رذی قعدہ کو یوم اساتذہ منانے کی شروعات کئی سال پہلے سے گھوسی کے مدارس میں ہو گئی ہے، اور اس سال سے یوم اساتذہ منانے کی تحریک کو پورے بر صغیر میں عام کرنے کا بیڑا جامعہ امجدیہ رضویہ گھوسی کی طرف سے اٹھایا گیا ہے، لہذا اہتمام دینی مدارس ومکاتب کو اس طرف توجہ دینی چاہیے اور عرس امجدی کے موقع پر یوم اساتذہ منانا چاہیے، جس میں اساتذہ کے حقوق وفرائض اور گزشتہ وموجودہ مثالی اساتذہ کی خدمات کا خصوصی ذکر کیا جائے، کیا ہی بہتر ہوتا کہ نظام ونصاب تعلیم میں اصلاح وتحسین اور اساتذہ وطلبہ کی فرض شناسی کو بھی موضوع سخن بنایا جاتا اور ہم اپنے احتساب کی کوشش کرتے اور اسی موقع پر اس موضوع پر ایک سیمینار بھی منعقد کر لیا جاتا۔

ان چند سطور کے لکھنے کا داعیہ دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی کے امتحان داخلہ ۲۰۰۶ء میں شرکت کرنے والے طلبہ کی تعلیمی صورت حال اور حد درجہ انحطاط پذیر علمی لیاقت بنی، ملک کے دسیوں صوبوں سے کمپٹیشن میں شریک چار سو سے زائد طلبہ میں مطلوبہ درجہ میں داخلہ کے لائق صلاحیت کا فقدان، مدارس

کے نصاب ونظام میں اصلاح وتحسین اور انتظامیہ کے ساتھ اساتذہ وطلبہ کے فرائض سے غفلت کے ازالہ کا زبردست تقاضا کر رہا ہے، بعض مدارس کے طلبہ میں علمی لیاقت کے فقدان اور غفلت کا حال یہ ہے کہ درجۂ ثالثہ کے امیدوار ایک طالب علم نے کیفیت تیمم بیان کرتے ہوئے یہ لکھا کہ

''جس شخص کو تیمم ہو جائے، اسے نہلا دھلا کر عطر لگا کر قبرستان لے جائیں اور قبر میں دفن کردیں''۔

افسوس اور غور کا مقام ہے کہ دو تین سال درجہ عربی میں پڑھنے کے بعد وہ تیمم کو بھی نہ سمجھ سکا اور سمجھا تو ''موت''، حقیقت میں یہ تیمم کی موت نہیں، بلکہ ہمارے مدارس اور ان کے نظام ونصاب تعلیم کی موت ہے، ہم اساتذہ وطلبہ کی موت ہے، بلکہ قوم مسلم کی موت ہے۔

خدا ہمیں کسی طوفاں سے آشنا کردے
ہمارے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

❀❀❀❀❀❀❀❀

۱۶ رشوال دار العلوم علیمیہ کے روحانی مرشد،خلیفۂ اعلیٰ حضرت مبلغ اسلام علامہ شاہ عبد العلیم میرٹھی علیہ الرحمہ کے جانشین قائدِ ملت اسلامیہ علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی علیہ الرحمہ کے وصال کی تاریخ ہے،۱۴۲۴ھ /۲۰۰۳ء میں اسی دن اسلام آباد پاکستان میں حرکتِ قلب بند ہونے کے سبب آپ کا وصال ہوا تھا، کراچی کے نشتر پارک میں آپ کی نماز جنازہ آپ کے بڑے صاحب زادے علامہ شاہ انس نورانی صدیقی نے پڑھائی، جس میں کئی لاکھ لوگوں نے شرکت کی، اتنی بھاری تعداد میں عوام وخواص کی شرکت آپ کی بے پناہ مقبولیت اور مسلمہ قیادت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے، انٹرنیشنل سطح پر تبلیغی خدمات کے ساتھ ساتھ عالمی سطح کی سیاسی سوجھ بوجھ اور پاک سیاست میں نمایاں سیاسی کردار ادا کرنے والی کوئی اور شخصیت میری نظر میں نہیں ہے۔

ختم نبوت کے منکر قادیانی فرقہ کو قانونی طور سے غیر مسلم قرار دلوانے میں آپ نے سب سے اہم اور کلیدی کردار ادا کیا ہے، تفصیل کے لیے فقیر کی کتاب'' قادیانیت اور تحریک تحفظ ختم نبوت'' اور دیگر کتابوں کا مطالعہ مفید رہے گا، پیام حرم کے زیر نظر شمارہ میں ''گوشۂ نورانی'' کے تحت مضامین سے بھی

حضرت کی شخصیت اور کردار کو سمجھنے میں مدد ملے گی، حضرت نورانی میاں غیر معمولی تبلیغی وسیاسی مصروفیات کے باوجود عابد شب زندہ دار، پابند سنت وشریعت ایک عظیم روحانی شخصیت کے مالک بھی تھے، زندگی بھر باجماعت تراویح میں قرآن سنایا اور تہجد میں بھی پابندی کے ساتھ رمضان بھر قرآن شریف پڑھتے رہے، درمیانی وقفہ میں بوڑھی والدہ کی خدمت بھی معمول میں داخل تھی، جب بھی باہر کا سفر ہوتا، والدہ محترمہ کی اجازت ضرور لیتے، ایک لمبی مصروف اور مثالی زندگی گذار کر پیغام اجل کو لبیک کہا اور کلفٹن کراچی میں عبداللہ شاہ غازی علیہ الرحمہ کے آستانے کے قریب اپنی والدہ کے پائتانے اپنی پسند کی جگہ مدفون ہوئے، صاحب زادہ علامہ شاہ انس نورانی مدظلہ العالی نے اپنے والد کی جگہ سنبھال لی ہے، مولیٰ تعالیٰ انھیں سچا جانشین بنائے، آپ کی یاد میں پیام حرم اسی شمارہ میں ''گوشۂ نورانی'' کا اہتمام کر رہا ہے۔

ادارہ کی نمائندگی کرتے ہوئے ''پیام حرم'' کے نگراں حضرت مولانا محمد شفیق الرحمٰن عزیزی مصباحی نے نورانی میاں کے عرس منعقدہ کراچی میں شرکت فرمائی، اپنی مجبوریوں کی بنا پر ادارے کے سربراہ حضرت مولانا معین الحق علیمی اس سال اپنے مرشد کے سالانہ عرس کی شرکت سے معذور رہے، ممبئی ناریل واڑی قبرستان کی سنی مسجد میں مولانا علیمی صاحب نے عرس نورانی کا خصوصی اہتمام کیا اور دار العلوم علیمیہ میں بھی مولانا علیمی اور سیٹھ عبدالمجید رضوی کی ایما پر قرآن خوانی، ایصال ثواب، نعت خوانی اور تقریر کا اہتمام کر کے اساتذہ وطلبہ اور جمدا شاہی کے لوگوں نے خراج عقیدت پیش کیا۔

❁❁❁❁❁❁

اس سال ۱۰/۱۱/۱۲ نومبر ۲۰۰۶ء کو شاہ ابوالقاسم حضرت سید اسماعیل حسن مارہروی علیہ الرحمۃ والرضوان کا سالانہ عرس مارہرہ شریف کی خانقاہ برکاتیہ میں انتہائی سادگی کے ساتھ منعقد ہوا، شب وروز میں کئی اجلاس ہوئے، جس میں ملک وبیرون ملک کے تقریباً پچاس ہزار عقیدت مندوں نے شرکت کی جس میں علماء ومشائخ کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔

اس عرس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ حفاظت عقیدہ کے ساتھ محاسبۂ نفس، پختگی کردار وعمل، اخلاق وتقویٰ، تعلیم وصحت، تبلیغ دین اور اشاعت علم پر علمائے کرام اور درگاہ کے سجادہ نشین حضرت امین ملت، حضرت نجیب میاں اور حضرت اشرف میاں کی تقریروں میں خصوصی زور دیا گیا۔

یہاں عورتوں کو عرس کی شرکت سے روکا جاتا ہے اور جو آہی جاتی ہیں، انھیں احاطۂ مزار اور بھیڑ میں گشت سے روکنے کے لیے خانقاہِ برکاتیہ میں ''امی کا گھر'' کے نام سے عورتوں کی خصوصی اقامت گاہ میں پابند رکھا جاتا ہے، اور موقع کا فائدہ اٹھا کر عقیدہ و دینی احکام و مسائل کی تبلیغ کے لیے معلمات کو بلا کر ان میں اصلاح و تبلیغ کرائی جاتی ہے، جس کا خاطر خواہ فائدہ نظر آرہا ہے۔

آخری دن ''قل'' کی تقریب میں بحر العلوم حضرت مفتی عبد المنان اعظمی دامت برکاتہم العالیہ نے اور باتوں کے ساتھ ایک بڑی اہم اور ضروری بلکہ سب سے ضروری بات کی طرف سجادہ نشینان کی توجہ مبذول کرائی کہ: ''کثرت ہجوم کے باعث مسجدیں تنگ ہو جاتی ہیں اور بہت سے نمازیوں کی باجماعت نماز چھوٹ جاتی ہے، لہذا آئندہ عرس سے جلسہ گاہ میں باقاعدہ باجماعت نماز کا اہتمام کرایا جائے، اور مزید وضو خانے بنوا دیے جائیں، فقیر بھی کئی سالوں سے عرس قاسمی میں شرکت کرتا آرہا ہے، اور اس نے بھی اس چیز کو محسوس کیا، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ حضرت بحر العلوم مدظلہ العالی کی مبارک زبان سے اپنے دل کی بات کہلائی گئی، امید کہ اس پر ضرور توجہ دی جائے گی۔

حضرت امین ملت اور ان کے دیگر برادران دار العلوم علیمیہ پر خصوصی طور سے مہربان ہیں مسلم یونیورسٹی سے دار العلوم علیمیہ کا معادلہ کرانے میں ان ہی بزرگوں کا سب سے بڑا کردار ہے ، ہمارے جو طلبہ مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں، ان کے داخلے اور تعلیم میں آنے والی مشکلات کو بن کے علیمیہ کو اپنا ادارہ سمجھ کر حل فرماتے ہیں اور طلبہ کو ہر طرح سے قانونی اور علمی تعاون دیتے رہتے ہیں۔

ہمارے یہ طلبہ تبلیغ اسلام و سنیت میں ایم، ایس، او کے پلیٹ فارم سے حضرت امین ملت کے دست و بازو بن کر اہم کردار ادا کر رہے ہیں، حضرت امین ملت نے قل کے خصوصی اجلاس میں دار العلوم علیمیہ کا ذکر فرمایا، حضرت کی خصوصی دعوت پر یہ فقیر بھی طبیعت کی ناسازی کے باوجود عرس قاسمی میں شرکت کے لیے برکاتی شفاخانے حاضر ہوا۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

دار العلوم علیمیہ کے ناظم تعلیمات اور جامعہ ہمدرد کے شعبۂ علوم اسلامیہ کے صدر مولانا ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم کو اس سال دہلی کی وزیر اعلیٰ ''شیلا دکشت'' نے تین سال کے لیے اردو اکیڈمی دہلی کا ممبر نامزد

کیا ہے۔

ادارہ علیمیہ موصوف کو اس نامزدگی پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہے اور ہم امید رکھتے ہیں کہ موصوف کو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اردو زبان و ادب اور خاص طور سے مذہبی ادبیات کے فروغ کے لیے کوئی بنیادی کام کرسکیں گے۔

[پیام حرم نومبر ۲۰۰۶ء]

﴿فروغ احمد اعظمی مصباحی﴾

مسلمانوں کا سالانہ عالمی اجتماع..........حج

پیغمبر اسلام سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ وحی ربانی پر مشتمل جو تعلیمات اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی جانب لائے اور جو انسانی فلاح و کامیابی اور مکمل نجات کا ضامن آخری خدائی منشور کی حیثیت رکھتے ہیں وہ پانچ ہیں، (۱) ایمان (۲) نماز (۳) روزہ (۴) زکوٰۃ (۵) حج۔

یہ پانچوں فرائض، اسلام کے ستون اور ارکان ہیں، جن پر اسلام کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہے، ایمان ایک کیفیت ہے، جس کا تعلق دل سے ہے اور بقیہ چار اعمال ہیں، جو اعضا سے تعلق رکھتے ہیں۔

کامل ایمان رکھنے اور چاروں اعمال کی مکمل ادائیگی پر خدا کی طرف سے بندوں کو صلے کے طور پر دنیا میں خلافت ارضی اور آخرت میں تمام آسائشوں اور آرائشوں سے بھرپور دائمی نعمت کدے جنت میں اولاً داخل ہونے کا وعدہ ہے۔

''وعدالله الذین آمنوا و عملوا الصٰلحٰت لیستخلفنّهم فی الارض '' (سورۂ نور ۵۵)

ترجمہ: وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کو زمین کا خلیفہ بنائے گا۔

''والذین آمنوا و عملوا الصالحات اولئك اصحاب الجنة'' [سورۂ بقرہ ۸۲] ترجمہ: اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے، وہی جنت والے ہیں۔

اسلام کے ان ہی چار بنیادی اچھے کاموں میں چوتھے نمبر پر حج ہے، حج بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اس کا لغوی معنی قصد و ارادہ ہے، اور اسلامی شریعت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان شہر مکہ میں جا کر ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کردہ مرکزی اسلامی عبادت گاہ کعبہ کے گرد چکر کاٹے، صفا و مروہ کی دوڑ لگائے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات، منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں حاضر ہو کر کچھ اعمال و آداب بجالائے۔

مسلمانوں کا سالانہ عالمی اجتماع ..... حج

جو مسلمان مکہ معظمہ تک جانے کے وسائل اور طاقت رکھتا ہو، اس پر زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے کہ وہ رب العالمین کا یہ حق ادا کرے، استطاعت کے باوجود حج میں تاخیر گناہ ہے۔

حج کے فرض ہونے کا حکم شریعت محمدی میں ۹ ھ میں نازل ہوا، حج ایک مالی و بدنی عبادت ہے، جو زمین کے محور کعبہ کے ارد گرد صدیوں سے جاری ہے۔

کعبہ کی اولین تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے کی تھی، حضرت عبداللہ بن عمر بن عاص کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو آدم وحوا کے پاس بھیجا اور خانۂ کعبہ تعمیر کرنے کو کہا، حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے بیت اللہ کے چار ارکان کو پانی کے ارکان پر رکھ دیا تھا، پھر بیت اللہ کے نیچے سے زمین پھیلا دی گئی، ہو سکتا ہے کہ اسی تعمیر ملائکہ کی طرف منسوب کیا گیا ہو، حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ کعبہ کو ملائکہ نے آدم سے قبل بنایا تھا، حضرت سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ حضرت آدم نے اسے پانچ پہاڑوں، حرا، طور، سینا، طور زیتا، کوہ لبنان اور کوہ جودی کے پتھروں سے بنایا تھا، بہرحال کسی انسان کے ہاتھوں سب سے پہلے روئے زمین پر کعبہ کی تعمیر حضرت آدم کے ذریعہ ہوئی ہے۔

کعبہ دنیا میں سب سے پہلا عبادت خانہ ہے، یہ خدا پرستی کا سب سے قدیم اور سب اہم مرکز ہے۔

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا
ہم پاسباں ہیں اس کے وہ پاسباں ہمارا

یہ گھر صوفیہ کرام کے نظریے کے مطابق عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا سمت القدم، تمام عظم پیغمبروں نے اس کی زیارت کی ہے اور بیت المقدس سے پہلے اسے اپنی عبادتوں کا قبلہ بنایا ہے۔

ان اول بيت وضع للناس للذی ببكة'' [سورۃ آل عمران ۹۶]

ترجمہ: سب سے پہلا جو گھر لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا وہ وہی ہے جو بکہ میں ہے۔

بکہ، مکہ کا قدیم غیر عربی نام ہے، مکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں ایک خاص

خاندان کا تبلیغی مستقر بنا، پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانے میں چند خیموں اور جھونپڑیوں کی آبادی کی شکل میں ظاہر ہوا، پھر دھیرے دھیرے اس نے عرب کے مذہبی شہر کی حیثیت اختیار کی اور نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت کے بعد وہ اسلامی دنیا کا دینی ودعوتی مرکز بنا۔

قرآن سے ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ سب سے پہلے تعمیر کیا جانے والا عبادت خانہ یہی کعبہ ہے، نہ کہ بیت المقدس، کیوں کہ بیت المقدس کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سیکڑوں سال بعد حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے ہاتھوں ہوئی ہے۔

کعبہ کا لغوی معنی بلند چارگوشہ ہے، چونکہ کعبہ چارگوشہ بلند عمارت کی شکل میں بنا ہے، اس لیے کعبہ کے نام سے مشہور ہے، اسے بیت اللہ، بیت الحرم، اور بیت عتیق بھی کہتے ہیں، طوفان نوح کے وقت اس کی عمارت آسمان پر اٹھالی گئی تھی، اور کعبہ کا نشان مٹ گیا تھا، پھر خدا کے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے الہامی نشان دہی پر ایک لمبے عرصے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرانی بنیاد پر کعبہ کی دوسری تعمیر فرمائی۔

واذیرفع ابراهیم القواعد من البیت واسماعیل" [سورۂ بقرہ، ۱۲۷]

ترجمہ: اور یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے دنیا نے اپنی گمراہیوں میں پڑ کر کعبہ کو بھلا دیا تھا اور وہ بت پرستی اور ستارہ پرستی میں مبتلا ہو گئی تھی، تو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے وطن بابل (عراق) سے شام ہجرت کی، پھر وہاں سے مع اہل وعیال ہجرت کر کے مکہ کی بے آب وگیاہ وادی میں آگئے اور اسے اپنا وطن اور مرکز دعوت وعبادت بنایا۔

ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتك المحرم لیقیموا الصلوٰة فاجعل افئدة من الناس تهوی الیهم وارزق من الثمرات لعلهم یشکرون [سورۂ ابراہیم، ۳۷]

ترجمہ: اے میرے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد (یعنی اسماعیل) کو بے آب وگیاہ وادی میں بسایا ہے، تیرے حرمت والے گھر کے پاس، اے میرے رب! اس جگہ کا انتخاب میں نے اس لیے کیا

ہے، تاکہ وہ (یعنی اسماعیل اور ان کی اولاد) نماز قائم کریں، تو لوگوں کے کچھ دل ان کی طرف مائل کردے، اور انھیں کچھ پھل کھانے کو دے، شاید وہ احسان مانیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمائی اور وادی مکہ کو رزق سے مالا مال کردیا، جب کہ اس سے پہلے یہاں حلق تر کرنے کے لیے بھی پانی میسر نہیں تھا، لیکن اس آب وگیاہ پتھریلی زمین سے اللہ تعالیٰ نے ایک چشمہ جاری کردیا اور خود بخود پانی نکلنے لگا، جو آج بھی پوری فراوانی کے ساتھ جاری ہے اور اس سے زمانہ ابراہیمی سے آج تک برابر پوری دنیا سیراب ہو رہی ہے، اسی کو چاہ زمزم کہتے ہیں، یہ چشمہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایڑیوں کی رگڑ سے یا فرشتے کے پر مارنے کی وجہ سے جاری ہوا تھا۔

لہٰذا دیکھتے دیکھتے یہ غیر آباد وادی انسان کی ضروریات خورد ونوش سے بھرپور آبادی میں تبدیل ہوگئی، اور لوگوں کے دل یہاں سکونت وعبادت کے لیے کھنچنے لگے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بھی دعا کی تھی کہ "اے میرے پروردگار! تو اس شہر کو امن والا بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پوجا سے بچا" [سورۂ ابراہیم، ۳۵]

چنانچہ ان کی یہ دعا قبول ہوئی اور مکہ دارالامن بن گیا اور ایک خدا کی پرستش کا مرکز بھی، کعبہ کی نئی تعمیر کے دوران جب دیواریں اونچی ہونے لگیں تو جنت سے ایک پتھر لایا گیا، جس پر کھڑے ہوکر ابراہیم علیہ السلام دیواریں چن رہے تھے، اور اسماعیل علیہ اسلام پتھر اٹھا اٹھا کردے رہے تھے، جوں جوں دیوار اونچی ہوتی جاتی تھی، یہ پتھر بھی اونچا ہوتا جاتا تھا، وہی پتھر آج بھی یادگار کے طور پر شیشے کے ایک قبے میں کعبہ کے پورب جانب چند ہاتھ کے فاصلے پر موجود ہے، جسے مقام ابراہیم کہتے ہیں اور جہاں بعد طواف دو رکعت واجب الطواف پڑھی جاتی ہے۔

جب کعبہ تعمیر ہو چکا، تو اللہ کی طرف سے حکم ہوا کہ "اے ابراہیم! میرے گھر کو طواف، قیام اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لیے پاک وصاف رکھو اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو، وہ تیرے پاس پیدل اور دور کے سفر سے تھکی ہوئی دبلی سواریوں پر ہر دور دراز راستے سے آئیں گے۔ [سورۂ حج، ۲۷]

اس حکم کی تعمیل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کوہ بوقبیس پر چڑھ کر حج کا اعلان فرمایا، اور

لوگ اس اعلان پر لبیک کہتے ہوئے ایک خدا کی عبادت اور حج کے لیے کعبہ کی طرف رجوع ہونے لگے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی نسل کو اقوام عالم کی لازوال دعوت اور ابدی امامت سے نوازا گیا تھا، اس کے لیے انھوں نے دعا بھی مانگی تھی "اے ہمارے پروردگار! تو ہم کو مسلمان یعنی اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری نسل میں سے ایک مسلمان جماعت یعنی فرمانبردار جماعت بنا، اور ہم کو ہماری عبادت (حج) کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول کر، تو توبہ قبول کرنے والا رحم فرمانے والا ہے، اے ہمارے رب! اور تو ان میں انھیں میں سے ایک رسول بھیج۔ [سورۂ بقرہ، ۱۲۷]

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بھی مقبول ہوئی اور قیامت تک کے لیے اولاد اسماعیل یعنی عربوں میں سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ سارے عالم کے ہادی ورہنما بن کر مکہ میں مبعوث ہوئے ،اور آپ نے ابراہیمی مرکز دعوت وعبادت کعبہ سے توحید کا ڈنکا بجایا اور آپ کی تبلیغی اور دعوتی کوششوں اور آپ کی تعلیم وتزکیہ سے موعودہ امت مسلمہ پیدا ہوئی ، جسے نیک ترین امت ہونے کا شرف بخشا گیا ،اور جس نے خاتم النبیین کی ظاہری حیات کے بعد دعوت توحید، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری سنبھالی۔

اولاد ابراہیم میں حضرت اسماعیل کے بعد ان کی اولاد سے کوئی نبی نہیں ہوا، ہاں دوسرے اور چھوٹے بیٹے حضرت اسحٰق کی نسل میں نبی ورسول پیدا ہوتے رہے اور یہ سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک چلا، حضرت اسحاق کے بیٹے حضرت یعقوب اور ان کے بیٹے حضرت یوسف بھی نبی ہوئے ، حضرت یعقوب کا نام اسرائیل تھا، اس لیے آپ کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی ، بنی اسرائیل کے زیادہ تر نبی مخصوص قوموں اور خاص علاقوں میں رشد وہدایت کا کام کرتے رہے، ان حضرات کی دعوتی کوششوں کے اثرات اور ادھر اولاد اسماعیل یعنی عربوں میں اسماعیل علیہ السلام کے بعد کوئی نیا نبی نہ آنے کی وجہ سے رفتہ رفتہ توحید وخدا پرستی کی جگہ شرک وبت پرستی نے لے لی ،اور ایک خدا کی جگہ بے شمار خدا پوجے جانے لگے، حتی کہ کعبہ جو مرکز توحید تھا، اس میں بھی بت پرستی شروع ہوگئی ، جب پیغمبر آخرالزماں ﷺ پیدا ہوئے تو کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، آپ نے بعثت کے بعد توحید کی دعوت دی ، اور ایک خدا کی عبادت کا پیغام عام کیا، کعبہ کو بتوں سے پاک کیا اور صدیوں بعد ایک بار پھر دعائے خلیل ونوید مسیحا بن کر

کعبہ کو مرکز توحید بنا دیا۔

صدیوں کے فاصلوں نے حج کی صورت بھی مسخ کر دی تھی، مکہ میں عرب والے کعبہ کے گرد عبادت کے نام پر حج ضرور کرتے تھے، لیکن حج کے نام پر جو اعمال انجام دیے جا رہے تھے، وہ عبادت کی روح سے خالی بے حیائی اور مسخراپن کی بدترین مثال تھے، اور ان میں بعض شرکیہ رسمیں بھی داخل ہو گئی تھیں، آپ نے ان مفاسد کی اصلاح فرمائی، فرائض و ارکان، واجبات و آداب اور طریقہ عمل کو اپنی زبان اور عمل سے بیان فرمایا، بعثت سے پہلے جاہلی دور کے حج میں درج ذیل مفاسد داخل ہو گئے تھے۔

(۱) ذکر الٰہی کی جگہ اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے بیان کیے جاتے تھے، (۲) اہل یمن بغیر زادِ راہ سفر حج کرتے تھے، (۳) تقرب کے لیے قربانی کا خون کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے، (۴) قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے تھے، (۵) قریش کے لوگ عرفات کی بجائے مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے، جب کہ بقیہ قبائل عرفات میں، (۶) حج کے اجتماع کی حیثیت میلے کی ہو گئی تھی۔ (۷) احرام باندھنے کے بعد چپ رہتے تھے، (۸) خانہ کعبہ تک پیدل جانے کو کارِ ثواب سمجھتے تھے، (۹) حج سے واپسی پر دروازے سے داخل ہونے کی بجائے پچھواڑے سے کود کر گھر میں آتے تھے، اور اسے ثواب کا کام سمجھتے تھے، (۱۰) طواف کے دوران اعتراف گناہ ظاہر کرنے کے لیے ناک میں نکیل ڈلوا کر یا دونوں ہاتھ بندھوا کر کسی آدمی سے کھنچواتے تھے (۱۱) ایام حج میں عمرہ نہیں کرتے تھے (۱۲) حج کی نیت کرنے کے بعد تجارت کو طریقہ حج کے خلاف تصور کرتے تھے (۱۳) کچھ لوگ صفا و مروہ کی سعی نہیں کرتے تھے (۱۴) طواف کے دوران سیٹیاں بجاتے تھے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے ان تمام خرابیوں کو دور فرما کر حج کو عبادت کا تقدس عطا کیا، اور حج کے اجتماع کو میلے کی بجائے مسلمانوں کے سالانہ عالمی مشاورتی اجتماع میں تبدیل کر دیا، جو ہر سال خدا کے حکم سے مکہ کی سرزمین پر بلایا جاتا ہے، اور مسلمانوں کے الجھے ہوئے دینی و دنیوی انفرادی و اجتماعی سیاسی و سماجی، اور اقتصادی و تجارتی مسائل کے حل اور آئندہ کے لائحہ عمل اور منصوبہ بندی کا بہترین موقعہ فراہم کرتا ہے۔ خیر القرون میں رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام کے ذریعہ حج کے موقعے سے یہ سب کام بحسن و خوبی انجام پاتے رہے، آج کے دور ادبار و انحطاط میں اس کی اہمیت و ضرورت اور زیادہ

بڑھ جاتی ہے، اگر دورِ حاضر کے مسلم حکمراں اور منتخب علما و مشائخ نیز دانشورانِ قوم و ملت خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر حج کے اس عظیم عالمی سالانہ اجتماع کے اس عظیم مقصد پر پھر سے غور کریں اور اپنے اعمال و کردار اور اپنی ملکی و عالمی پالیسیوں کا احتساب کریں تو عجب نہیں کہ عالمی اور ملکی سطح پر مسلمانوں کے حالات سدھر جائیں اور مسلم ممالک اور مسلم قوم کو سپر طاقتوں کے ناجائز و مضر دباؤ سے نجات مل جائے ، اور کھل کر اپنے قدرتی وسائل کو مسلمانوں کے مفاد میں استعمال کرنے کا موقع مل جائے اور امت مسلمہ ایک بار پھر اپنی عظمتِ رفتہ حاصل کرلے، اور اسے اپنی طاقت و اہمیت کا احساس ہو جائے ، لیکن موجودہ حالات میں مسلم حکمرانوں کے طرزِ عمل سے ایسا ہوتا ہوا نظر نہیں آرہا ہے، آج کے جمہوری دور میں ووٹ کے ذریعہ مسلم عوام اپنے حکمرانوں کو اس کے لیے مجبور کر سکتے ہیں۔

حج کے ذریعہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو سال بھر میں ایک مرتبہ ایک ساتھ مرکزِ اسلام میں اکٹھا ہو کر بحیثیت قوم بلکہ بحیثیت خیرِ امت اپنی حالت کا جائزہ لینے ، ذاتی و جماعتی احتساب کر کے غلطیوں کی نشان دہی اور ان کا تدارک کرنے ، باہمی اختلافات دور کر کے از سرِ نو متحد و منظم ہونے ، نو پید اشرعی مسائل کے متفقہ اور اجماعی فیصلے حاصل کرنے اور حکمرانوں نیز عوام کے لیے ضابطۂ حیات ، دین و دنیا کے رہبر اصول اور ضروری ہدایات جاری کرنے کا ایسا نادر موقع ہے جو کسی اور قوم کو حاصل نہیں۔

آپ ﷺ نے حج کی عبادت کو عالمِ اسلام اور اسلامیانِ عالم کی سب سے بڑی اجتماعی عبادت بنادیا، جس سے غیر مسلم دنیا پر مسلمانوں کی شوکت و سطوت کا غیر معمولی اظہار ہوتا ہے۔

حج خدا کی رحمتوں ، اور برکتوں کے موردِ خاص میں حضوری ، اجتماعی شکل میں اپنے مولا کے حضور گریہ وزاری ، عجز و انکساری ، عقیدت کیشی و فرمانبرداری ، فرض شناسی و اطاعت شعاری اور فدائیت و جاں نثاری کا عملی اظہار ہے۔ نیز حج حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم قربانی کی روح تازہ کر دیتا ہے ، اور یہ ان کی اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور بیوی ہاجرہ کی اداؤں کی والہانہ نقل کرنے کا میدان اور براہیمی مراسم کی ادائیگی کا پلیٹ فارم ادا کرتا ہے۔

حج کے کچھ دنوں کے لیے فطری اختلافات ، طبعی امتیازات اور دیگر تشخصات کو مٹا دیتا ہے ، اور علاقائی ، لسانی ، نسلی ، قومی اور تمدنی طبقاتیت کا خاتمہ کر کے آفاقیت ، مساوات ، اتحاد و یکجہتی اور باہمی

تعارف وتعاون کا پیغام دیتا ہے، اور پوری امت مسلمہ کو ایک جگہ، ایک لباس، ایک وضع اور ایک زبان کر کے کثرت میں وحدت کا نمونہ پیش کرتا ہے، گویا پیغمبر اسلام ﷺ نے نہ یہ کہ صرف ساڑھے چودہ صدی پہلے عالم گیریت (گلوبلائزیشن) کا نظریہ پیش کیا، بلکہ اس پر عمل کر کے دنیا کو دکھا بھی دیا، جو آج سپر طاقت امریکہ کے لیے ہزار جتن کے باوجود ممکن نہیں ہو پا رہا ہے۔

حج کا ایک روحانی اور اصلاحی پہلو بھی ہے، جس کو ہر حاجی حج کے وقت فطری طور سے محسوس کرتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ مقامات مقدسہ کی زیارت اور ارکان حج کی ادائیگی سے اس کی روح میں ایک عجیب وغریب کیفیت وتاثیر محسوس ہوتی ہے، اس کے باطن میں بندگی میں کوتاہی پر شرمندگی اور آئندہ کے لیے برائیوں سے دور رہنے اور خدا کے حکم کی پابندی زندگی گذارنے کا احساس جاگ جاتا ہے، اور فکر وعمل اور ظاہر وباطن میں ایک عظیم خوشگوار انقلاب پیدا ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے حاجی کی دنیا پہلے سے یکسر بدل جاتی ہے اور حاجی کے اندر اور باہر کا یہ انقلاب حج کے مقبول ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

مرکز توحید اور قبلۂ عبادت کعبہ کے مسلسل دیدار، اس کے طواف اور بغیر حائل کے اس کی طرف نماز پڑھنے سے اس کے مثال خدائی جلال وجمال کی غیر معمولی کشش، مقناطیسیت کا کام کرتی ہے، اور کعبہ حاجی کے لیے مرکز تعلق بن جاتا ہے، اور حاجی خواہ کہیں کا ہو، حج وزیارت کے بعد روحانی طور سے ایسا محسوس کرتا ہے گویا اس کا وطن عزیز سرزمین عرب ہی ہے اور وہ دنیا کے کسی بھی ملک میں رہ کر روحانی طور سے یہیں رہتا ہے، اور وقت رخصت تقریباً ہر حاجی کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ اگر چہ میں حرم سے دور ہو رہا ہوں مگر ان شاء اللہ آئندہ پھر یہاں ضرور آؤں گا۔

مختصر یہ کہ حج اتحاد واجتماعیت کا درس بھی دیتا ہے اور بندوں میں بندگی کا احساس بھی جگاتا ہے جو مقصد تخلیق انسانیت ہے، گویا حج کے توسط سے ہمیں یہ پیام حرم ملتا ہے کہ

اجتماعیت میں پنہاں زندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

[پیام حرم دسمبر ۲۰۰۶ء]

ہمارا نصاب تعلیم اور نئے تقاضے

کہتے ہیں کہ ''فیشن'' اور نصاب تعلیم کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ فیشن تو اب ہر سال اپنا رنگ ڈھنگ بدل لیتا ہے۔ مگر نصاب کی عمر اس سے کچھ زیادہ ہوتی ہے، بہرحال عام مشاہدہ ہے کہ دنیا کے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب پر پانچ سال گزرنے پر نظر ثانی ضرور کی جاتی ہے اور زمانے کے بدلتے سماجی، اقتصادی، سیاسی حالات، عصری ایجادات اور طلبہ کی نفسیات وضروریات تقاضا کرنے لگتے ہیں کہ تبدیل وترمیم اور اصلاح وتحسین ضروری ہوگئی ہے۔ لھذا ماہرین تعلیم انفرادی طور سے اور زیادہ تر اجتماعی طور سے بورڈ کی شکل میں باہمی غور وخوض اور بحث ومشاورت سے مناسب اور ضروری اصلاح وترمیم کردیتے ہیں اور اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ پھر اگر درمیان میں تجربہ کچھ اور کہتا ہے تو درمیان میں بھی اصلاح وترمیم کا عمل جاری رہتا ہے۔

بارھویں صدی ہجری میں ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی نے برصغیر کے عربی مدارس کے لیے ایک نصاب بنایا تھا، جو انھیں کے نام کی مناسبت سے درس نظامی کہلاتا ہے۔ یہ نصاب اپنی جامع افادیت کے سبب مقبول عام ہوکر رائج ہوا اور آج بھی کچھ بدلی ہوئی شکل میں رائج ہے۔ مگر اصل نصاب وہی ہے کیوں کہ بنیادی اسلامی علوم وفنون ان کے اصول ومبادیات اور ان کے لیے آلہ وذریعہ کی حیثیت رکھنے والے علوم صرف، نحو، لغت، بلاغت، اور ادب آج بھی شامل نصاب ہیں، بلکہ ان علوم عالیہ مقصودہ، تفسیر، حدیث، اور فقہ کی اکثر کتابیں اور علوم آلیہ کی بہت سی کتابیں بھی وہی ہیں۔ جو ملا نظام الدین سہالوی نے تجویز کی تھیں۔ کچھ ہی کتابیں بدلی ہیں، یا ان کی تعداد میں تخفیف کردی گئی ہے۔

درس نظامی کے نصاب میں معقولات کی کتابوں کو بہت زیادہ جگہ دی گئی تھی۔ چودھویں صدی کے اختتام کے ساتھ معقولات کی بڑی حصہ داری کم ہوتی گئی اور آج متوسط قسم کے اور کچھ بڑے مدارس میں بھی فلسفہ کی ہدایۃ الحکمت، ہدیہ سعیدیہ یا زیادہ سے زیادہ میبذی اور شرح ہدایۃ الحکمت باقی رہ گئی ہیں۔ ہاں منطق میں ابھی بھی کئی کتابیں باقی ہیں۔ جواہر المنطق، کبریٰ، مرقاۃ، شرح تہذیب، قطبی، اور ملا حسن، کی تعلیم تقریباً ہر بڑے مدرسے میں ہوتی ہے۔ کچھ بڑے مدارس میں ''حمد اللہ'' بھی پڑھائی

جاتی ہے۔

درس نظامی کی معنویت وجامعیت اور افادیت مسلم ہے، مگر ہم بدلتی حالت وضرورت سے بھی آنکھ بند نہیں کر سکتے۔ تبدیلی تو درس نظامی کے نصاب میں بھی ہمیشہ سے ہوتی آ رہی ہے۔ اور بہت کچھ تبدیلی کے بعد بھی ابھی موجودہ نصاب کے علوم اور کتابوں میں مزید تبدیلی وتخفیف اور جدید وموثر طریقۂ تدریس اپنانے کی ضرورت ہے۔ موجودہ دور میں نئی ایجادات اور کھیل کود سے دل چسپیاں چوں کہ بڑھ گئی ہیں اس لیے بچوں کی نفسیات کا اور زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ اور ایسا دل چسپ نفسیاتی طریقۂ تدریس اختیار کرنا چاہیے، جس سے تعلیم کی طرف بچے کی رغبت زیادہ سے زیادہ ہو اور وہ پوری لگن کے ساتھ تعلیم حاصل کرے، لگن ہی سے بچہ محنت کرے گا اور جب محنت کرے گا تو باصلاحیت بنے گا، ورنہ وقت کی بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

مدارس کے نصاب میں قواعد کی مشق اور اجرا کی کمی بہت بڑا بنیادی عیب ہے، مشق واجرا نہ تو زبانی ہوتا ہے نہ تحریری، نتیجہ میں قواعد یاد نہیں رہ پاتے، اور یاد رہتے ہیں تو بول چال اور تحریر میں انھیں برت نہیں پاتے۔ لھذا زبانی اور تحریری دونوں طریقوں سے یا کم از کم تحریری طور سے مشق واجرا ضرور کرایا جائے۔

روزانہ کم از کم کسی ایک کتاب کے پڑھے ہوئے سبق کا خلاصہ ضرور لکھوایا جائے۔ اس کے بے شمار فائدے ہیں، اور یہ کوئی نئی چیز نہیں، چار صدی سے پہلے شیخ عبد الحق محدث دہلوی اس پر عامل تھے۔ اور ہر گھنٹی میں ہر کتاب کے ہر سبق کی نئی یا مشکل مفید وضروری باتوں کو نوٹ بک پر دوران درس یا بعد میں لکھتے رہنے کی عادت ڈلوائی جائے۔

تختۂ سیاہ یا نئی ایجاد کمپیوٹر کا استعمال سبق کے خلاصے یا مشکلات کی تشریح کے لیے ضرور کیا جانا چاہیے۔ چوں کہ وقت کی قلت علوم عقلیہ کی دقت، طلبہ کی بے رغبتی وغفلت اور کچھ نئے علوم والسنہ کو داخل نصاب کرنے کی ضرورت نے منطق وفلسفہ کی اہمیت پہلے سے بہت کم کر دی ہے۔ اس لیے مجبوراً منطق وفلسفہ کی کتابیں عام نصاب تعلیم سے مزید کم کر دی جائیں۔ فلسفہ میں ہدایۃ الحکمت، اصطلاحات جاننے کے لیے ضروری اور کافی ہے منطق کی بھی صرف دو یا تین ہی کتابیں پڑھائی جائیں، لیکن تخفیف تدریجا

ہونی چاہیے، منطق وفلسفہ کی موجودگی نصاب میں اس لیے ضروری ہے کہ اصول اور گرامر یعنی صرف ونحو وبلاغت کی بہت سی کتابوں پر معقولی رنگ چڑھا ہوا ہے، اس طرح کی معقولیت زدہ کتابوں کے نصاب میں موجود رہنے تک اصطلاحات جاننے کی حد تک منطق وفلسفہ کی دو ایک کتابوں کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی، پھر ذہنی ورزش اور دماغی جولانیت کے لیے بھی معقولات کا وجود مفید ہے، اس لیے نصاب سے ایک دم معقولات کا دیس نکالا کسی حد تک مضر ہوگا۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ معقولات پڑھے بغیر کوئی قابل نہیں ہو سکتا، ورنہ پھر جلیل القدر فقہائے صحابہ، تابعین اور ائمہ فقہ وتفسیر وحدیث یعنی امام اعظم اور امام بخاری جیسے نابغۂ روزگار بزرگوں کی قابلیت وصلاحیت کے بارے میں سوالات اٹھ کھڑے ہوں گے۔ فارسی کی کتابیں بھی مزید کم کردی جائیں۔ منطق وفلسفہ اور فارسی کی کتابوں کی تخفیف سے نصاب تعلیم میں انگریزی زبان، ابتدائی ریاضی، سائنس کے لیے جگہ نکل آئے گی۔ چوں کہ انگریزی عالمی زبان بن چکی ہے، اس لیے اس میں بولنے اور لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ضروری ہے۔ نیز کمپیوٹر کی زبان بھی انگریزی ہی ہے اور کمپیوٹر ہر فرد کے لیے ناگزیر بنتا جارہا ہے۔ لھذا انگریزی کو اعدادیہ سے ثانیہ تک پڑھایا جائے۔ دین ودنیا دونوں میں ریاضی کی ضرورت ہے، سائنس کو مڈل کلاس یعنی فوقانیہ کے تین سالوں اعدادیہ اولی اور ثانیہ تک لازم کیا جائے سائنس کی تعلیم کے لیے بھی ریاضی کی ضرورت ہوگی اور علم فرائض کو سمجھنے کے لیے تو اس کی ضرورت مسلم ہی ہے۔

صرف ونحو اور بلاغت کی جو رائج کتابیں، فارسی زبان میں ہیں یا ایجاز مخل کا نمونہ ہیں، یا منطقیانہ وفلسفیانہ رنگ میں رنگی ہوئی ہیں، جن کی وجہ سے قواعد کو سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے ان کی جگہ آسان عربی زبان میں انتہائی سہل اور دل پذیر انداز میں صرف ونحو اور بلاغت کی کتابیں عرب جامعات میں پڑھائی جارہی ہیں، جن میں مشق واجرا کا اہتمام نصاب وکتاب کا جزء لاینفک ہوتا ہے۔ اور ان کی دست یابی اب ناممکن یا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہ گئی ہے۔ کم از کم کچھ بڑے مدارس کے لیے نسبتاً حصولیابی آسان ہوگئی ہے اور مزید ہوتی جارہی ہے۔

صرف ونحو وبلاغت ہی کیا، اب تو فقہ اور تفسیر واصول تفسیر وغیرہ علوم کی کتابیں بھی نئی ترتیب وتسہیل کے ساتھ آچکی ہیں۔ نصاب میں پرانی کتابوں کی جگہ ان کتابوں کے انتخاب پر سنجیدگی سے غور

کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر درس نظامی کے نصاب میں مجوزہ تبدیلی وترمیم، تخفیف واضافہ اور اصلاح وتحسین ہو جائے اور طریقۂ تدریس بدل دیا جائے تو یقیناً یہ نصاب نئی شکل میں سب سے بہتر اور پہلے سے زیادہ مفید ونتیجہ خیز نصاب ہو جائے گا۔

اب تک جن مدارس نے نظام تعلیم کی اصلاح اور نصاب میں جزئی ترمیم کا تجربہ کیا ہے، وہ اس کے فوائد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور الحمد للہ ان اداروں کے طلبہ کے سامنے غیر ترمیم شدہ قدیم نصاب کے فیض یافتہ طلبہ ہوں یا عصری درسگاہوں کے طلبہ آنکھوں سے آنکھیں ملاکے بغیر کسی احساس کمتری کے بات کرنے کی پوری ہمت رکھتے ہیں۔ یہ تو رہے جزئی تبدیلی اور اصلاح کے فوائد، اور اگر بڑے پیمانے پر یہ کام ہو اور ادب وفقہ کے ساتھ تفسیر وحدیث اور تقابل ادیان میں بھی اختصاص کا انتظام ہو اور باصلاحیت اساتذہ کی فراہمی سمیت اختصاص کی تمام سہولیات طلبہ کو فراہم کی جائیں تو ہمارے مدارس سے بھی ازہر کی طرح وسیع النظر اور باصلاحیت ماہرین فن پیدا ہو سکتے ہیں، برصغیر میں مدارس ہی کے پروڈکٹ تفسیر وحدیث کے ایسے باصلاحیت علما موجود ہیں، جو تھوڑی سی توجہ اور محنت کے ساتھ طلبہ کو تفسیر وحدیث میں بھی اختصاص کرانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اس وقت میرے سامنے جامع ازہر کا چند سال پہلے کا ثانویہ مرحلے یعنی سکنڈری کلاسز کا نصاب ہے، جو چار سالوں کو محیط ہے، اور جامع ازہر سے ملحق برصغیر کے مدارس اسلامیہ کے لیے "رابطۃ الجامعات الھندیہ الاسلامیہ" کا وہ نصاب بھی، جو ازہر کے نصاب کے مطابق ہے، یہ طویل المدت اور کثیر الجہات نصاب درج ذیل تین فیکلٹیوں پر مشتمل ہے، (۱) کلیۃ اصول الدین (۲) کلیۃ الشریعۃ (۳) کلیۃ اللغۃ العربیۃ۔

کلیۃ اصول الدین 'میں تین شعبے ہیں (۱) قسم التفسیر وعلوم القرآن (۲) الحدیث وعلومہ (۳) العقیدۃ والفلسفۃ۔

ہر فیکلٹی کے تین مرحلے ہیں (۱) مرحلۂ عالیہ (۲) مرحلۂ تخصص (۳) مرحلۂ عالمیہ

مرحلۂ عالیہ بی۔اے کے برابر ہے اور مرحلۂ تخصص ایم۔اے کے برابر اور مرحلۂ عالمیہ

ڈاکٹریٹ (پی ،ایچ ،ڈی) کے مساوی ہے۔
ثانویہ کے چار سالوں کے بعد اتنے طویل المدت اور کثیر الجہات نصاب کو مکمل طور سے عام بڑے مدرسوں میں بھی جاری کر پانا بہت مشکل ہے، ظاہر ہے، اس کے لیے طلبہ کے پاس نہ اتنا وقت ہے اور نہ مدارس کے پاس اتنے اساتذہ اور کتابوں سمیت دیگر لوازم ووسائل کی فراہمی آسان ہے۔اس لیے از ہر کے ان دونوں نصابوں کو سامنے رکھ کر ایک نو سالہ نصاب ایک بورڈ کے ذریعہ تیار کرایا جائے۔جس میں عالمیت کے دوسالہ کورس کی تکمیل پر عام طلبہ کو فارغ کر دیا جائے اور اس کے بعد فضیلت کے دوسالوں میں تفسیر یا حدیث یا فقہ یا ادب یا تقابل ادیان میں مخصوص باذوق اور ذہین طلبہ کو اختصاص کرایا جائے۔تو مزید فائدے سامنے آئیں گے۔لیکن یہ کام صرف ایک آدمی کا نہیں خواہ وہ کتنا ہی قابل ذہین اور ماہر و تجربہ کار کیوں نہ ہو بلکہ انتہائی ذہین صاحب نظر تجربہ کار اور ماہر نفسیات اساتذہ کی منتخب نصاب ساز بورڈ ہی یہ کام بخوبی انجام دے سکتا ہے۔تا کہ وہ اپنی ذہانت اور مشق و تجربے کی مدد سے اس نازک ترین کام کے ہر مفید و معتبر پہلو پر نظر رکھ کر نصاب کی تدوین کرے،اس کے لیے بہت جلد بازی بھی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ منصوبہ بند طریقے سے کام شروع کیا جائے اور مناسب وقت دیا جائے ،بہتر یہ ہوگا کہ مختلف علاقوں اور مختلف مدارس کے لائق اساتذہ پہلے نصاب سازی کے رہبر اصول طے کریں اور بنیادی امور پر اتفاق کریں، پھر ان اصول وامور کی روشنی میں دو،دو، چار، چار کی ٹیم دو، چار نصابوں کا مسودہ تیار کرے، پھر یہی لوگ ایک سیمینار میں ان مسودوں پر بحث کریں اور کسی ایک مسودۂ نصاب پر،یا معجون مرکب پر اتفاق کریں،اس کے بعد اسے نافذ کیا جائے۔

نصاب میں اختصاص کوئی نئی چیز نہیں ہے۔درس نظامی کے نصاب سے صدیوں پہلے بھی مخصوص لوگ اپنے ذوق وفرصت کے مطابق کسی فن، تفسیر ،حدیث ،فقہ ،ادب ،معقولات ،نحو اور بلاغت میں اختصاص کرتے تھے۔اس کی ضرورت واہمیت جیسے کل تھی ویسے ہی آج بھی ہے۔بہتر یہ ہے کہ فضیلت کے دوسالوں ہی میں فن اختصاص کا اہتمام کیا جائے۔مدرسے کے وسائل ،آمدنی جہاں تک ساتھ دیں اتنے ہی زیادہ فنون میں اختصاص بڑھاتے جائیں، بڑے مدارس میں کم از کم دوفنوں حدیث یا فقہ اور تفسیر یا ادب یا تقابل ادیان میں اختصاص کا انتظام ہونا چاہیے۔

نئے تجربات سے گریز کی وجہ وسائل کی کمی اور فقدان بھی ہے، نیز انتظامیہ اور اساتذہ کی فکری سطحیت ,فکری جمود، اور سب سے بڑھ کر کم ہمتی ,محنت سے گریز، سستی وآرام طلبی اور نفع عاجل کی طلب جیسی چیزیں ہیں شامل ہیں۔

[پیام حرم جنوری ۲۰۰۷ء]

تھانوی صاحب کی قبر کی مسماری وہابی فکر و عمل کے تناظر میں

ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) کی کاشتہ اور ابن عبدالوہاب نجدی (متوفی ۱۲۰۶ھ) کی پرداختہ وہابی تحریک نے توحید خالص کے نام پر جزیرۃ العرب میں شعائر اللہ کی حرمتوں کا جو خون ناحق کیا ہے، اس کے چھینٹے تاریخ کے صفحات پر آج بھی ثبت ہیں، اور جنۃ البقیع اور جنۃ المعلی اور مقام احد وغیرہ اس شقاوت و درندگی کی کہانی اپنی زبان حال سے آج بھی سنا رہے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی تحریک اور ان کے اشاروں پر ابن عبدالوہاب نجدی نے آل سعود کی حکومت کے تعاون سے بزرگوں کے قبوں اور ان کی قبروں کے انہدام کے لیے بہانہ یہ بنایا کہ:

"کچھ لوگوں کی توہم پرستی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اولاً انھوں نے ولیوں کی اس قدر تعظیم کی کہ عبادت کے درجہ تک پہونچ گئے، بعد ازاں ان کے مزاروں کی پرستش شروع کی" (سوانح حیات سلطان عبدالعزیز آل سعود ص ۱۲۳ سردار محمد حسنی)

جب کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث اس کے برخلاف یہ کہتی ہے کہ: (۱) "شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ سرزمین عرب میں بت پرستی کی جائے"۔ (جامع ترمذی ص ۴۸۷)

(۲) "شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ مسلمان جزیرۂ عرب میں اس کی عبادت کریں، البتہ ان کو آپس میں لڑاتا رہے گا"۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۷۶)

فرمان رسول کے مطابق زمینی حقیقت بھی یہی ہے کہ عہد رسالت سے آج تک جزیرۃ العرب میں کسی قسم کی بت پرستی یا قبر پرستی نہیں ہوئی، ہاں انبیائے کرام اور حضرات صحابہ اور اولیاے عظام کے مزارات پر باادب حاضری، آستانہ بوسی اور استمداد و استغاثہ کا سلسلہ خیر القرون سے آج تک جاری ہے، اسی کو شرک و بت پرستی اور قبر پرستی کا نام دے دیا گیا اور ایسا کرنے والے عرب و عجم کے کروڑوں مسلمانوں کو کافر و مشرک قرار دے دیا گیا اور ان کا خون بہانا جائز ہی نہیں کیا گیا بلکہ بے شمار خوش عقیدہ مسلمانوں کا خون بہا بھی دیا گیا ثبوت کے لیے درج ذیل صرف ایک داخلی شہادت ہی کافی ہے، دیوبندی جماعت کے شیخ الاسلام مولوی حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

''محمد بن عبدالوہاب نجدی ابتدائے تیرہویں صدی (بارہویں) صدی میں نجد عرب میں ظاہر ہوا، اور چوں کہ خیالات باطلہ اور عقائد فاسدہ رکھتا تھا، اس لیے اس نے اہل سنت والجماعت سے قتل وقتال کیا، ان کو بالجبر اپنے خیالات کی تکلیف دیتا، ان کے اموال کو غنیمت کا مال اور حلال سمجھا کیا، ان کے قتل کرنے کو باعث ثواب ورحمت شمار کرتا رہا'' (الشہاب الثاقب ص۴۲) اس کے بعد لکھتے ہیں:

''محمد بن عبدالوہاب کا عقیدہ تھا کہ جملہ اہل عالم اور تمام مسلمانان دیار مشرک وکافر ہیں، اور ان سے قتل وقتال کرنا اوران کے اموال کو ان سے چھین لینا حلال اور جائز بلکہ واجب ہے'' (ایضاً ص۴۳)

شیخ نجدی کے نزدیک مزارات، روضے، اور قبے شرک اور بدعت کی آبیاری کے مرکز تھے، اس لیے اس نے قبر اور قبہ شکنی کی مہم چلائی اور اس مہم کے لیے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا اوران کو ساتھ لے کر کام شروع کیا۔

سردار محمد حسنی لکھتے ہیں: ''شیخ محمد بن عبدالوہاب کا پہلا قابل ذکر ہم خیال عثمان بن معمر والی عیینہ تھا، شیخ نے اس سے حلف لیا کہ وہ ان مزاروں اور متعلقات کو تلف کرنے میں امداد دے گا، ابن معمر نے قبول کیا، دونوں ہم مشورہ ہو کر جبیلہ گئے، یہاں چند صحابیان رسول کے مزارات تھے، دونوں نے مزارات مسمار کر دیے''۔ (سوانح حیات سلطان عبدالعزیز ص۴۲،۴۳)

شیخ نجدی نے سب سے پہلے جو قبہ اپنے ہاتھ سے گرایا، وہ حضرت فاروق اعظم، سیدنا عمر بن خطاب ﷺ کے بھائی حضرت زید بن خطاب ﷺ کا قبہ ہے، جو جبیلہ میں تھا، شیخ عثمان بن بشر نجدی (متوفی ۱۲۸۸ھ) اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عثمان بن معمر اپنے چھ سو ساتھیوں کے ساتھ شیخ نجدی کو لے کر چل پڑا، جب اہل جبیلہ نے دیکھا تو وہ مزاحم ہوئے، لیکن جب عثمان کے آدمی لڑائی کے لیے تیار ہو گئے تو انھوں نے ان کا راستہ چھوڑ دیا، جب عثمان قبہ کے پاس پہونچا، تو اس نے کہا، ہم لوگ قبہ کو ہاتھ نہیں لگائیں گے، شیخ نجدی نے کہا مجھے کلہاڑی دو، پھر شیخ نجدی نے ہاتھ میں کلہاڑی لے کر قبہ کو توڑنا شروع کیا، حتی کہ اس کو زمین کے ہموار کر دیا''۔ (عنوان المجد فی تاریخ نجد ج۱ ص۹،۱۰)

اس کے بعد شیخ نجدی نے امیر درعیہ امیر محمد بن سعود کی پشت پناہی حاصل کی اور حکومت کی

سرپرستی اور تعاون سے عظیم پیمانے پر قبر شکنی کی مہم آگے بڑھاتا رہا۔
نتیجہ یہاں تک پہونچا کہ مدینے میں جنۃ البقیع اور مکے میں جنۃ المعلیٰ کے قبرستان بھی نجدیوں کی انہدامی کارروائی اور تخریبی مہم سے محفوظ نہ رہ سکے، حتی کہ گنبد خضریٰ کو بھی صدمہ پہونچایا گیا۔
۲۲ راگست ۱۹۲۵ء کو لندن سے ایک پریس رپورٹر نے یہ خبر بھیجی کہ:
''باوثوق ذرائع سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ وہابیوں نے مدینہ پر حملہ شروع کر دیا ہے، جس سے مسجد نبوی کے قبے کو، جس میں رسول اللہ ﷺ کی قبر بھی ہے، صدمہ پہونچایا ہے اور سیدنا حمزہ کی مسجد شہید کر دی گئی ہے''۔ (رپورٹ خلافت کمیٹی ص ۳۰)
۱۹۲۵ء میں ہندوستان کی خلافت کمیٹی نے تحقیق حال اور انہدامی کارروائیوں کو رکوانے کے لیے حجاز کا دورہ کیا اور یہ اطلاع بھیجی کہ:
''مکہ میں جنۃ المعلیٰ کے مزارات شہید کر دیے گیے، مولد النبی توڑ دیا گیا''۔ (ایضاً ص ۲۳)
پھر ۱۹۲۶ء میں خلافت کمیٹی کے دوسرے دورے کے موقع پر اپنی مشاہداتی رپورٹ میں ارکان وفد لکھتے ہیں:
''مکہ معظمہ کی طرح مدینہ کی بعض مساجد بھی نہ بچ سکیں اور مزارات کے قبوں کی طرح یہ مساجد بھی توڑ دی گئیں، مدینے میں منہدم کردہ مساجد کی تفصیل یہ ہے:
(۱) مسجد فاطمہ متصل مسجد قبا (۲) مسجد ثنایا (میدان احد میں) (۳) مسجد منارتین (۴) مسجد مائدہ (۵) مسجد اجابہ (ایضا ۸۸)
جنت البقیع کے توڑے گیے مزارات:
(۱) حضرت سیدہ فاطمہ زہرا (۲) حضرت سیدہ زینب (۳) حضرت سیدہ ام کلثوم (۴) حضرت سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہن ۔ (بنات رسول ﷺ) (۵) حضرت سیدہ عائشہ (۶) حضرت سیدہ زینب (۷) حضرت حفصہ رضی اللہ عنہن (ازواج طیبات) (۸) حضرت امام حسن (۹) سر مبارک امام حسین (۱۰) امام زین العابدین (۱۱) حضرت ابراہیم (شہزادہ رسول) (۱۲) حضرت عباس (عم رسول) (۱۳) امام جعفر صادق (۱۴) امام محمد باقر رضی اللہ عنہم (۱۵) حضرت عثمان غنی (۱۶) حضرت عثمان بن

مظعون (۱۷) حضرت عبد الرحمن بن عوف (۱۸) حضرت سعد بن وقاص (۱۹) حضرت امام مالک (۲۰) امام نافع رضی اللہ عنہم ۔ بات انہدام ہی تک نہیں رہی بلکہ شقاوتوں کی حد کردی گئی۔

انتہائی ناپاک جسارت: مفتی حرم حضرت علامہ سید احمد بن زینی دحلان علیہ الرحمہ کے بقول: ابن عبد الوہاب نجدی نے مقام "احسا" میں حکم دیا کہ بعض بزرگوں کی قبروں کو بیت الخلا بنادیا جائے۔ (الدرر السنیہ ص ۵۲)

اس سے بھی زیادہ دل خراش اور لرزہ خیز جسارت ان بدبختوں نے یہ کی کہ جنت المعلیٰ میں آرام فرما ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے گنبد کو ڈھانے کے بعد مزار شریف کے ارد گرد بول و براز ڈال دیا۔

ایک غیر مقلد مصنف اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"مکہ مکرمہ کے مدفن جنت المعلیٰ میں (جہاں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا مزار ہے) نہ صرف قبوب کو زمین بوس، بلکہ قبور تک کو مسمار اور ان کے گرد و پیش بول و براز پڑا ہوا اور اونٹوں کو بے مہار چرتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھا، یہی نقشہ مدینہ منورہ میں بھی تھا"۔ (زاد السبیل بحوالہ تاریخ نجد و حجاز ص ۲۱۰)

ابھی چند سال پہلے کی بات ہے کہ مقام ابوا میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی آمنہ رضی اللہ عنہا کی قبر شریف کے ساتھ نجدی وہابی حکومت نے یہ بیہودہ جسارت کی کہ مزار شریف کو بے نشان کر کے مزار کے راستے میں شیشوں کی کرچیاں اور غلاظت پھیلادی تاکہ فاتحہ و زیارت کو جانے والے مزار شریف تک نہ جاسکیں۔

مولد نبوی (حضور کی جائے ولادت) کی موجودہ عمارت (جس میں اس وقت ایک لائبریری قائم ہے) کو مسمار کر کے کوئی دوسری تجارتی یا رہائشی بلڈنگ بنانے کا منصوبہ بھی نجدی حکومت کے زیر غور ہے، جس پر ابھی عمل درآمد نہیں ہوا ہے، جزیرۃ العرب میں اسلامی آثار یعنی مساجد و مقابر کی مسماری کے یہ مذکورہ اقدامات نجدیوں کی کارستانی ہے، جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، لیکن ابھی وہیں تک محدود ہے، برصغیر میں اسماعیل دہلوی نے وہابی نظریات کو درآمد کر کے پھیلایا لیکن یہاں کے وہابیوں سے متعلق

ابھی تک مزار شکنی کی جرأت کی کوئی خبر سننے میں نہیں آئی ہے۔

علمائے دیوبند اور قبور شکنی: ہاں چند سال پہلے دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی کی علیمی لائبریری کے لیے کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں مجھے سہارنپور اور دیوبند جانے کا اتفاق ہوا تو سہارن پور کے ایک حکیم صاحب نے مجھے دار العلوم دیوبند کے انتظام کاروں اور اساتذہ کے حکم پر انھیں کی نگرانی میں دار العلوم دیوبند کے طلبہ کے ہاتھوں دار العلوم کے قبرستان میں آرام فرما مولوی قاسم نانوتوی اور دیگر علما و اساتذہ اور دیوبندی مکتب فکر کے بزرگوں کی پختہ قبروں کے توڑنے کا حقیقت پر مبنی ایک پر لطف واقعہ سنایا:

حکیم صاحب نے اس واقعے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے بیان فرمایا کہ دار العلوم کے کیمپس میں مسجد رشید کے نام سے ایک عظیم و وسیع مسجد تعمیر ہو رہی تھی، اور اس مسجد کی تعمیر کے اخراجات کا ایک بڑا حصہ سعودی حکومت نے دیا تھا، ایک مرتبہ زیر تعمیر اس مسجد کے معائنے کے لیے سعودی حکومت کا ایک نمائندہ دیوبند آیا ہوا تھا، اس نے معائنے کے وقت جب یہ دیکھا کہ مسجد کے بغل میں قبرستان کے اندر کچھ پختہ قبریں بنی ہوئی ہیں، تو وہ بہت ناراض ہوا، اور اس نے دار العلوم دیوبند اور مسجد رشید کے ذمہ داروں کو دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ یہاں تو قبر پرستی ہوتی ہے جب کہ سعودی حکومت توحید خالص کی علم بردار ہے، شرک و بت پرستی کو دنیا سے مٹانا چاہتی ہے، اور اسی مقصد کی خاطر وہ مساجد کی تعمیر کراتی ہے اور امداد بھی فراہم کرتی ہے، لھذا اگر شرک کے ان مراکز کو مسمار نہ کیا گیا تو سعودی امداد بند کر دی جائے گی۔

سعودی ایجنٹ کی اس وارننگ کے بعد دار العلوم دیوبند کے ذمہ داران بہت پس و پیش میں مبتلا ہو گئے، بالآخر امداد بند ہونے کے خوف سے مہتمم صاحب اور اساتذہ نے مجبوراً یہ فیصلہ کیا کہ مولوی قاسم صاحب نانوتوی سمیت تمام بزرگوں کی پختہ قبریں توڑ دی جائیں، اور بلا تاخیر ان دیوبندی ذمہ داروں نے طلبہ کو دیوبندی بزرگوں کی قبریں مسمار کرنے کا حکم دے دیا اور آلات و اوزار فراہم کر کے طلبہ کو قبور شکنی کے کام پر لگا دیا گیا اور دیکھتے دیکھتے اونچی اونچی قبریں پست ہو گئیں۔

اللہ رے یہ مسند افتا کی اہانت
اپنوں کا بھی ہوتا ہوا خوں دیکھ رہا ہوں

اتفاق سے اس واقعے کے کچھ ہی دنوں بعد دیوبند کا ہمارا یہ سفر ہوا تو دار العلوم دیوبند کی مشہور

مسجد رشید اور اس کے اس قبرستان کو بھی ہم دیکھنے گئے اور ہم نے بہت سی قبروں کو پست اور مسمار حالت میں دیکھا، اور صاف نظر آرہا تھا کہ یہاں جلد ہی بڑے اور جنگی پیمانے پر قبور شکنی کا واقعہ پیش آیا ہے، قبروں کی مسماری کے آثار چیخ چیخ کر اپنی مظلومیت کی داستان بیان کررہے تھے۔

قبور شکنی کا عوامی ردعمل: اس داستان کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داران جب اپنے طلبہ کے ذریعے کلہاڑیوں اور دوسرے اوزاروں سے اپنے بزرگوں کی قبریں مسمار کرارہے تھے، تو اتنی عظیم انہدامی کاروائی سے دیوبند کے عوام بھلا کس طرح بے خبر رہ سکتے تھے؟ اگرچہ عوام انہدامی اقدام کے اسباب اور منصوبہ بندی سے بے خبر تھے، لیکن جب کاروائی شروع ہوگئی تو آناً فاناً عوام کو بھی معلوم ہوگیا اور جو جہاں تھا وہیں سے بھاگا ہوا قبرستان پہونچا، اور اپنے علما اور طلبہ کے ہاتھوں اپنے بزرگوں کی قبروں کے انہدام کا یہ دل روز منظر دیکھ کر دیوبندی عوام بوکھلا گئے اور مزاحمت پر آمادہ ہوگئے، اور عوام نے قبر شکن علما و طلبہ پر سنگ ساری اور خشت باری شروع کردی، اور پورے قصبے میں ہنگامی کیفیت پیدا ہوگئی، اسی دوران ایک شخص نے اس انہونی اور اس ہنگامے کی خبر سنی تو ایک مقامی غیر مسلم سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو اس غیر مسلم نے جواب دیا کہ مسلمانوں اور مولویوں میں جھگڑا ہوگیا ہے۔

اس واقعے کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ علمائے دیوبند اپنے کو وہابی کہتے ہیں اور ساری دنیا کو وہابی دیکھنا پسند کرتے ہیں جیسا کہ مولوی اشرف علی تھانوی نے ایک مرتبہ اپنی اس خواہش کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ اگر میرے پاس دس ہزار روپیہ ہو، سب کی تنخواہ کردوں، پھر خود ہی وہابی بن جائیں
۔(الافاضات الیومیہ ج۳ ص ۶۷)

اور وہابی تحریک کی عمارت ہی شعائر اللہ یعنی اسلامی آثار اور مقابر کی حرمتوں کی پامالی پر کھڑی ہے، پھر بھی میرے علم کے مطابق عملاً خوش دلی سے برصغیر میں کہیں بھی دیوبندی عناصر نے قبر شکنی کی جسارت نہیں کی اور دیوبند کے قبرستان میں پہلی مرتبہ مجبوراً ایسا کیا گیا تو دیوبندی عوام کی طرف سے اس اقدام پر سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، اسی سفر میں ہمیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ جب ہم قصبے سے نکل کر روڈ پر آئے تو بالکل روڈ پر ایک گنبد نما عمارت نظر آئی ہم نے ذرا قریب جاکر دیکھا تو اس عمارت کے دروازے کے اوپر بہت صاف لفظوں میں اس مضمون کی عبارت لکھی ہوئی تھی، یہ مولانا بشیر احمد

صاحب شیخ التفسیر یا شیخ الحدیث دار العلوم دیو بند کی قبر ہے۔

گویا علمائے دیو بند بھی عملاً قبوں اور پختہ قبروں کے قائل ہیں۔ حال ہی میں اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ تھانہ بھون میں واقع دیو بندی مذہب کے پیشوا مولوی اشرف علی صاحب تھانوی اور ان کے کچھ رشتہ داروں کے مزارات کچھ نامعلوم لوگوں نے توڑ دیے ہیں اور قبر پر غلاظت ڈال دی ہے، اس خبر کے چھپتے ہی دیو بندی حلقے میں مذمت اور احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور اخباروں میں ہفتوں تک احتجاجی خبریں اور مذمت کے بیانات آتے رہے۔

اپنے عظیم پیشوا کی قبر کے ساتھ اس ناروا سلوک پر ردعمل ایک فطری عمل تھا، لیکن جہاں انہدام کے اور بہت سے امکانات ظاہر کیے جا رہے ہیں وہیں یہ بھی امکان موجود ہے کہ خود اسی وہابی فکر کے کچھ شدت پسند عناصر نے وہابی تحریک کی تاریخ کا مطالعہ کر لیا ہو، اور ابن عبد الوہاب نجدی اور سعودی حکمرانوں کے قبر شکنی کے واقعات پڑھ کر جذباتی ہو گئے ہوں اور بانی تحریک کی سنت پر عمل کرتے ہوئے تھانوی صاحب کی قبر سے قبر شکن مہم کا آغاز کر دیا ہو۔

میرے اس شبہے کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ تھانوی صاحب کی قبر کی مسماری کے واقعے سے کچھ ہی دنوں پہلے اسی فکر سے تعلق رکھنے والے ایک وزیر کا اس طرح کا ایک بیان بھی لکھنؤ کے کچھ اخبارات میں آ چکا تھا، جس میں انھوں نے مزارات شکنی اور مزارات کو غلاظت خانہ بنانے کی ناپاک خواہش کا اظہار کیا تھا۔

عجب نہیں کہ ان جنونی عناصر کو اس بیان سے بھی شہ ملی ہو، اور اس بیان نے جلتی میں تیل کا کام کیا ہو، نیز وہابی تحریک کے ہم خیال اور ہمنوا علمائے دیو بند کے فکر وعمل کا تضاد تھانوی صاحب کی قبر سے انہدامی کاروائی کے آغاز کا سبب بنا ہو، بہر حال اس امکان کو یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

[پیام حرم فروری ۲۰۰۷ء]

اخلاص و نیک نیتی اور محنت و مجاہدہ

آج کے مسلمان کی ضرورت

''اخلاص'' دل کا وہ فعل ہے، جس سے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مقصود ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ سنت جاریہ ہے کہ جو بھی بندہ اخلاص کے ساتھ محنت و مجاہدہ کرتا رہتا ہے، وہ ضرور کامیاب ہوتا ہے۔

عمل پیہم اور جہد مسلسل محنت و مشقت اور ریاضت و مجاہدہ خواہ دین کے کام میں ہو، یا دنیا کے کام میں، اس کے ثمرات اور فائدے کبھی نہ کبھی اور کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی شکل میں ضرور ظاہر ہوتے ہیں، اسی محنت کی وجہ سے آج صلیبی یورپ و امریکہ اور صیہونی اسرائیل غالب اور کامیاب ہیں، اور پوری دنیا پر اپنی مرضی کی حکومت چلاتے ہیں۔

بے ایمان ہندو جوگی ریاضت و مجاہدہ کے بل پر ہوا میں اڑنے لگتے ہیں تو گویا محنت و مجاہدہ کا بدلہ دینے میں قدرت نے حق و باطل میں کوئی فرق نہیں رکھا، یہی محنت و مجاہدہ اگر ایمان و اخلاص کے ساتھ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ مومن بندے کو دین و دنیا میں کامیابی نہ ملے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا و ان اللہ لمع المحسنین '' [سورۂ عنکبوت آیت ۶۹]

ترجمہ: وہ لوگ جنھوں نے (ہماری طاعت میں) محنت و مجاہدہ کیا، ہم ضرور ایسے لوگوں کو اپنی (معرفت اور قرب و ثواب) کے راستوں تک پہونچادیں گے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بندوں کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت کے لیے ہوئی ہے عبادات کی دو قسمیں ہیں (۱) عبادت مقصودہ (۲) عبادت غیر مقصودہ مثلاً طہارت یعنی وضو و غسل، عبادت مقصودہ کے صحیح ہونے کے لیے نیت شرط ہے، جیسے نماز کے ارکان اگر کوئی شخص بغیر نیت کے ادا کرے، تو اس کی نماز ادا نہ ہوگی اور اس سے نماز کا فریضہ ساقط نہیں ہوگا، چہ جائے کہ ثواب ملے اور نیت کر کے نماز پڑھے تو نماز صحیح بھی ہوگی، اور ثواب بھی ملے گا، اور عبادت غیر مقصودہ بغیر نیت کے صحیح

ہو جاتی ہے، جیسے اگر کسی شخص نے نیت کے بغیر وضو کر لیا، تو وضو ہو جائے گا، مگر اس پر ثواب نہیں ملے گا، اور نیت کرنے سے وضو پر ثواب بھی ملے گا۔

نیت کا لغوی معنی یہ ہے کہ دل میں کسی بھی چیز کے کرنے کا پکا ارادہ ہے، خواہ وہ چیز عبادت مقصودہ ہو یا غیر مقصودہ، یونہی باہمی معاملات ہوں مثلاً خرید و فروخت ہو یا طبعی عادات و حاجات جیسے کھانا، پینا، پہننا، چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، پیشاب پاخانہ کرنا اور روزی کمانا وغیرہ۔

اور نیت کا شرعی معنی یہ ہے کہ بندہ دل میں اللہ تعالیٰ کی طاعت و بندگی کا پختہ ارادہ کر رہا ہے، مثلاً اگر کوئی مومن بندہ معروف عبادات جیسے مقصود بالذات عبادت نماز پڑھنے اور غیر مقصود بالذات عبادت وضو کرنے سے پہلے اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت کرنے کا پختہ ارادہ کرتا ہے، تو یہ شرعی نیت ہے، اور اسی نیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے اس بندہ مومن کو ثواب عطا فرماتا ہے، اس نیت کو "عبادت کا اخلاص" کہتے ہیں۔

پھر لغوی نیت کی دو قسمیں ہیں (۱) نیت صادق (نیک نیتی) اور (۲) نیت فاسد، نیت صادق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ باہمی معاملات اور طبعی عادات کو بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا جوئی کے لیے انجام دیا جائے، اس نیت کو "معاملات و عادات کا اخلاص" کہتے ہیں، ایسی مخلصانہ نیت کے ساتھ انجام دیے جانے والے معاملات و عادات بھی اس اخلاص کی وجہ سے طاعت و عبادت بن جاتے ہیں، اور ان پر ثواب ملتا ہے، گویا طاعت و عبادت معنی کے اعتبار سے ایک ایسا جامع و ہمہ گیر اور وسیع الجہات لفظ ہے، جو اپنے اندر ایک جہان رکھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے طاعت و عبادت، اپنے ان تمام تر معانی کے ساتھ مطلوب ہے، لہٰذا جو کوئی بندہ اپنے رب کے حضور ایسی بندگی کرنے کی جتنی زیادہ کوشش اور جتنا زیادہ مجاہدہ کرتا ہے، وہ اتنا ہی بڑا کامل انسان اور اتنا ہی زیادہ مقرب و محبوب بندہ ہوتا ہے اور بندے کی یہی سب سے بڑی کامیابی ہے، دنیا کی مختصر سی زندگی میں بھی اور آخرت کی دائمی زندگی میں بھی، اور اسی دنیوی اور اخروی کامیاب زندگی کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے اور اسے طاعت و عبادت کا حکم دیا گیا ہے:

"وماخلقت الجن والانس الالیعبدون" [سورۂ ذاریات، آیت:۵۶]

اخلاص اور نیک نیتی سے صرف فرض و واجب ہی نہیں، بلکہ امر مباح بھی عبادت بن کر باعث اجر و ثواب ہو جاتا ہے، اور کسی ایک امر مباح میں اگر کئی ایک صادق نیتیں کر لی جائیں، تو عمل اگرچہ صرف ایک ہو، مگر نیتوں کے کئی ایک ہونے کی وجہ سے نیتوں کی تعداد کے مطابق کئی ایک ثواب ملتا ہے۔

صدر العلما حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمہ حدیث "انما الاعمال بالنیات" کی صوفیانہ و عارفانہ شرح کرتے ہوئے اس نکتہ کو ایک مثال کے ذریعہ اس طرح سمجھاتے ہیں:

"مثلاً خوشبو کا استعمال طبعی چیز ہے، لیکن یہی استعمال اگر مندرجہ ذیل نیات میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی ہو تو عبادت ہو کر موجب ثواب ہوگا، (۱) اتباع سنت کی نیت سے کہ محبوب دو عالم ﷺ خوشبو کو پسند فرماتے تھے، (۲) تعظیم مسجد کی نیت سے (۳) ہمنشیں فرشتوں اور بنی آدم کو راحت پہنچانے کی نیت سے (۴) غیبت سے خود محفوظ رہنے یا دوسرے کو محفوظ رکھنے کی نیت سے، کہ کسی سے بدبو محسوس کر کے خود یا دوسرا اس کی غیبت میں آلودہ ہو جائے (۵) معالجۂ دماغ کی نیت سے تاکہ دماغ میں تازگی پیدا ہو کر زیرکی بڑھے اور علوم و معارف حاصل ہوں.........خوشبو کا یہی استعمال اگر مذکورہ بالا نیات کے ساتھ نہیں، (تو کچھ ثواب نہیں) بلکہ صرف نفسانی شہوت اور خود نمائی کے ماتحت ہے، تو حرمان ثواب کے ساتھ مستحق ملامت و عتاب بھی ہوگا۔

اسی طرح نشست و برخاست، رفتار و گفتار، خور و نوش، پوشاک و پاپوش کے پہننے، اتارنے، خواب و بیداری، بلکہ ہر حرکت و سکون میں اتباع سنت کی نیت کر لی جائے، تو سب کے سب عبادت ہو کر ثواب کا سبب بنیں گے، شہنشاہ دو عالم ﷺ کا ارشاد: الدین یسر" کہ دین سراپا آسانی ہے، اس مقصد کو اجمالی طور پر ظاہر فرما رہا ہے، لیکن افسوس کہ عام طور پر لوگ اس سے غافل ہیں" [بشیر القاری ص ۵۶]

یہ تو امر مباح میں نیک نیتی، اور اخلاص کی بات تھی، اخلاص کی برکت کا حال تو یہ ہے کہ بندہ اگر لہو و لعب میں مبتلا ہو کر بھی نیک نیت ہو، تو حصول مراد میں کامیابی پاتا ہے، "قلائد الجواہر" میں ایک قوال کا واقعہ مذکور ہے، جو قوالی گا کر زندوں کو سنایا کرتا تھا، پھر بڑھاپے کے سبب جب قوالی کا دھندہ مندہ پڑ گیا، اور معاشی دشواریوں میں مبتلا ہو گیا تو قبرستان جا کر مردوں کو قوالی سنانے لگا، یہ قوال حضور غوث

اعظم رضی اللہ عنہ کے دربار میں بر سر منبر اپنا ماجرا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں قبرستان میں کبھی اس قبر کے پاس، کبھی اس قبر کے پاس، گھومتے گھومتے قوالی گاتا رہا، یہاں تک کہ ایک قبر کے پاس جا کر بیٹھ گیا، دیکھتا کیا ہوں کہ وہ قبر پھٹی اور اس سے ایک آدمی نے سر نکال کر کہا: ارے مردوں کو کب تک سنائے گا، جا، اور ایک مرتبہ اللہ کے لیے گا، جو حی وقیوم ہے، اس نے تیری غربت پر رحم فرما کر اشرفیوں کا تیرا سوال پورا فرما دیا۔ قوال کہتا ہے کہ ان کلمات کو سن کر مجھ پر غشی طاری ہوگئی، پھر افاقہ ہونے پر میں کھڑے ہو کر جناب باری میں کچھ اشعار گا کر عرض کرنے لگا، ابھی میری عرض جناب باری میں ختم نہ ہونے پائی تھی کہ حضور غوث اعظم کا خادم ابو الرضا سو اشرفیاں لے کر میرے پاس پہنچا اور مجھ کو دے دیں۔ یہ قصہ بیان کر کے اس قوال نے اپنے عود (ساز) کو توڑ ڈالا اور تائب ہو گیا، جب اس نے توبہ کی، تو حضرت غوث اعظم کی مجلس میں موجود چالیس حاضرین میں سے انتالیس اشخاص نے بھی سو سو اشرفیاں اس قوال کو دیں۔

اس کے بعد حضور غوث اعظم نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اے فقیرو! مقام غور ہے، اس قوال نے لہو و لعب میں نیت صادق کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دامن مراد کو بھر دیا، تو جو شخص اپنے فقر وغیرہ تمام احوال اور جملہ طاعات و افعال میں نیت صادق سے کام لے، اس پر مولیٰ تعالیٰ کا کس قدر عظیم الشان کرم ہوگا، لہذا تم پر لازم ہے کہ صدق نیت اور صفائی باطن اختیار کرو، اگر یہ دونوں نہ ہوتے تو کوئی بشر قرب الٰہی حاصل نہ کر سکتا''۔ [ایضاً ص ۶۱]

بندہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر اس کی طاعت و عبادت کو اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے اور اس کی انجام دہی کے بغیر اسے چارۂ کار نہیں ہوتا، طاعت و عبادت کی تفصیلی معلومات اور ہدایات کے لیے خدائی کتاب اور الٰہی فرستادہ نبی کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے، قرآن ہدایت کے اصول بتاتا ہے اور رسول اس کی شرح کرتا ہے، اور عملی نمونہ بھی پیش کرتا ہے، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں "کان خلقه القرآن" ''آپ ﷺ کی سیرت قرآنی تعلیمات کا عملی نمونہ ہے''۔ [مسلم شریف ج ۱ ص ۲۵۶]

سب سے آخری پیغمبر ہمارے نبی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ظاہری کے بعد آپ کے نائب و جانشین کی حیثیت سے صحابۂ کرام، پھر تابعین پھر تبع تابعین اور ائمۂ مجتہدین بندوں

کی مادی و روحانی رشد و ہدایت کے لیے شریعت و طریقت کے رہبر و رہنما اور آئیڈیل بنے اور اللہ تعالیٰ کے عام بندے ان صاحبان صدق و صفا برگزیدہ خاص ہستیوں کے شاگرد و مرید بن کر ان سے جڑے رہے اور ایمان و عقیدے کی درستگی اور اعمال و احوال اور اخلاق و کردار کی بہتری کا سامان کرتے رہے ،اوران سے جڑ کر اپنی زندگی کی ہر ہر سانس کو مرضی مولیٰ کے تابع کرلیا۔ اوراس طرح حق سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت وقرب حاصل کر کے اپنے مقصد تخلیق کو پاگئے۔

شریعت سے ظاہری اعمال درست ہوتے ہیں ،اور طریقت سے باطنی احوال کی اصلاح ہوتی ہے ،عام علما کی بیشتر توجہ شریعت کی تبلیغ واشاعت اور اصلاح اعتقاد وعمل کی طرف مبذول ہوتی ہے ،اس لیے انھیں علمائے ظاہر یا صرف علما کہتے ہیں ،جب کہ صوفیہ خصوصیت سے باطن کی اصلاح وتربیت پر توجہ دیتے اور دلاتے ہیں ،باطن کی اصلاح وتربیت کے لیے ظاہر کا علم بھی ضروری ہے ،اور علم کے ساتھ ساتھ اس عمل بھی ،اس لیے صوفی اور روحانی مرشد کے لیے علم ظاہر و باطن دونوں کا حصول اور ان پر عامل ہونا لازم ہے ،بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ولی علم ظاہر کے حصول کے بغیر ولی ہو جائے ،یہ بعض بہت کمیاب خاصان خدا کا نصیبہ ہے ،کہ مکتب کی کرامت کے بغیر محض فیضان نظر سے ولایت کا درجہ پا جاتے ہیں عموماً ظاہر و باطن کے علم اور اس پر مخلصانہ عمل پیہم اور ریاضت ومجاہدے اور احسان عبادت ہی سے ولایت ملتی ہے ،وہ بھی مولیٰ تعالیٰ کے خصوصی فضل وکرم اوراس کی خاص تائید وتوفیق سے ،صرف علم وعمل سے بھی ولایت ملنا قطعی وضروری نہیں ہے ،اور نہ ولایت کے لیے کرامت ہی ضروری ہے ،اظہار کرامت کے بغیر بھی ولی ،ولی ہوتا ہے ،بلکہ ولی کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ یہ جانتا ہو کہ میں ولی ہوں.........

اگر بندہ اخلاص کے ساتھ ہر ممکن حد تک طاعت کا التزام اور پابندی کرتا ہے اور اس میں استقامت فی الدین کا وصف موجود ہے تو اللہ تعالیٰ سے امید رکھنی چاہیے کہ وہ اسے اپنی معرفت اور قرب وولایت عطا فرما دے گا۔

اصحاب صفہ میں سے حضور کے ایک خاص خادم صحابی حضرت ابوفراس ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رات گذارتا تھا، چنانچہ میں آپ کے وضو کا پانی اور آپ کی دیگر ضروریات (مسواک وغیرہ) فراہم کرتا تھا تو حضور نے (ایک مرتبہ خوش ہو کر) فرمایا: مجھ سے (کچھ) مانگ لو، میں نے عرض کی: مجھے جنت میں آپ کی رفاقت چاہیے، فرمایا: اس کے سوا اور کچھ؟ میں نے عرض کی: بس اتنا ہی، تو فرمایا: تم سجدہ یعنی عبادت کی کثرت سے اپنے اوپر میری مدد کرو۔[ریاض الصالحین باب المجاہدہ]

حتی المقدور ہر مسلمان پر استقامت فی الدین واجب ہے، یعنی کفر و شرک، گناہِ کبیرہ اور گناہِ صغیرہ سے بچنا اور ایمان کے ساتھ فرائض و واجبات ادا کرنا، پھر سنتوں پر عمل کرنا۔

شریعت کے منہیات سے بچنے اور اوامر کی پابندی میں بندے کو کئی طرح کے داخلی اور خارجی عوارض و عقبات اور برائی کے دواعی و محرکات کا سامنا کرنا پڑتا ہے (۱) نفس (۲) شیطان اور (۳) برا ماحول۔

نیک اور طاعت گذار بننے میں تقریباً ہر ایک بندے کو ان تینوں سے سخت مقابلہ اور جہاد کرنا پڑتا ہے، مومن بندے کا سب سے بڑا دشمن اس کا نفس امارہ بالسوء ہوتا ہے، جو ہر وقت بندے کے باطن میں دنیا کی نوع بہ نوع لذتوں کی ترغیب دے کر بے عملی اور بدعملی کی تحریک پیدا کرتا رہتا ہے، حتی کہ اچھا خاصا باشعور اور سوجھ بوجھ کا انسان بھی بسا اوقات مغلوب العقل ہو کر نفس کی شرارتوں کا شکار ہو جاتا ہے، اور خدا کی یاد اور اس کی طاعت و بندگی سے غافل ہو کر اس کی مقررہ شرعی حدود پھلانگنے میں کوئی جھجک اور عار محسوس نہیں کرتا اور ایسی ایسی بداعمالیاں کر جاتا ہے، جسے سوچ کر بعد میں دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا ہے، اور پچھتاتا ہے، اس لیے سب سے پہلے اپنے باطن کے اس شیطان سے چوکنا رہنا اور اس سے لڑنا ضروری ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ نفس میں جب بھی کوئی خواہش پیدا ہو تو بندہ رک کر اس خواہش نفسانی کو امر و نہی کے شرعی پیمانے سے ناپے کہ یہ کام حلال ہے یا حرام، اگر حلال ہے تو کس حد تک؟ پھر آگے قدم بڑھائے اور اس کے اچھے اور برے انجام کو بھی سوچے، اور نفس پر جبر کر کے برائی سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرے، روزانہ سوتے وقت دن بھر کے اپنے اچھے برے اعمال کا احتساب بھی کرے، اور اللہ تعالیٰ سے برائیوں سے دور رہنے اور نیکی کی توفیق کی دعا بھی کرتا رہے، اور جو نیکی ہو جائے اس پر اللہ

کا شکر بجالائے اور گناہ و معصیت سے صدق دلی سے توبہ کرے، مجاہدۂ نفس کے یہی وہ طریقے ہیں، جن کو اپنا کر اس زبردست دشمن کو مغلوب کیا جاسکتا ہے، اگر یہ پہلا دشمن "نفس" قابو میں آجاتا ہے تو انسان پر شیطان کا بس بالکل نہیں چلتا یا چلتا ہے تو کم چلتا ہے۔

مومن بندے کا دوسرا بڑا دشمن شیطان ہے جس کا دخل یہاں تک ہے کہ یہ انسان کے رگ و ریشے میں سمایا رہتا ہے، اور بندے کو خدا سے غافل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا اور ہر دم خدا کی یاد سے غافل کر کے گناہ کی رغبت دلاتا رہتا ہے، شیطان گناہوں کو بہت خوبصورت، لذیذ اور پرکشش بنا کر پیش کرتا ہے، اور بعض اوقات اچھے اچھوں کو اپنی پر فریب کشش سے خدا سے دنیا کی طرف پھیر دیتا ہے، اور گمراہ کر دیتا ہے، شیطان نفس کی مدد بھی کرتا ہے، اور اس کا سہارا بھی لیتا ہے، بندہ برائی کا خیال آتے ہی کچھ کہنے اور کرنے سے پہلے اگر چوکنا ہو جائے تو اس کو شیطان کی شرارتوں کا بخوبی احساس ہو جائے گا" ان الشیطان للانسان عدو مبین "شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

شیطان مومن کے ہر ہر کام میں آڑے آتا ہے اور بندہ ہر گھڑی ہر کام میں شیطان کے ساتھ حالت جنگ میں رہتا ہے، اس کے شر سے بچنے کا بہتر علاج یہ ہے کہ دین و دنیا کا ہر اچھا کام کرتے وقت اللہ تعالیٰ کو یاد رکھے، کام شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھ لے، اور کام کے آغاز و انجام کے وقت کی جو دعائیں قرآن و حدیث اور بزرگوں کے معمول سے منقول ہیں، ان کو پڑھ لینے کا خصوصی اہتمام کرے اور مصیبتوں پر صبر کرے اور اللہ تعالیٰ سے عفو و عافیت اور شیطان کے ہر شر سے محفوظ رہنے کی دعا کرتا رہے، خود بینی و خود نمائی سے اپنے کو دور رکھے اور خدا اعتمادی کے ساتھ خود اعتمادی پیدا کرے، خاص طور سے غیبت اور چغلی کرنے والوں اور افواہ بازوں کو اپنے سے دور رکھے، شیطان کے یہ تین بڑے کارگر ہتھیار ہیں، جن کا استعمال کر کے بدگمانی اور باہمی فساد و منافرت کے دروازے کھولنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، جس سے پورا سماج تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور ماحول سے امن و اعتماد کا جنازہ نکل جاتا ہے۔

غیر شرعی نظر سے سختی کے ساتھ پرہیز کرے، کیوں کہ شیطانی تاثیر سے پہلے نظر بہکتی ہے، پھر دل بہکتا ہے، تب اعضا بہکتے ہیں، اس سلسلے میں مشائخ کے تین بنیادی اصولوں کو ہمیشہ نظر کے سامنے رکھے اور عمل کی کوشش کرے (۱) نظر بر قدم (۲) خلوت در انجمن اور (۳) سفر در وطن۔

نماز چونکہ اہم الفرائض ہے اور بندے کو رب سے قریب و محبوب کر دیتی ہے، اور شیطان کو یہ کب گوارا؟ تو شیطان طہارت اور نماز میں خصوصیت سے وسوسے ڈالتا ہے، لہذا بندہ نماز کے لیے کھڑا ہو تو ہر طرف سے دھیان الگ کر کے پوری توجہ اور ظاہری و باطنی خشوع و خضوع کا خاص اہتمام کرے، باطنی خشوع و خضوع یہ ہے کہ دوران نماز یہ تصور باندھے کہ میں گویا خدا کو دیکھ رہا ہوں، اگر اس تصور میں کامیاب نہ ہو تو پوری کوشش کے ساتھ یہ تصور کرے کہ خدا مجھے دیکھ رہا ہے۔ [مستفاد از حدیث جبرئیل]

عارف ربانی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ النورانی نماز کے اندر شیطانی وسوسوں کی دفاعی تدبیریں اور توجہ ظاہر و باطن کی ترکیبیں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ خوب کس کر باندھے جائیں، نفس کا معدن زیر ناف ہے، یہیں سے وسوسے اٹھتے ہیں، اور قلب کو جاتے ہیں، اس لیے ائمۂ شافعیہ قلب کے نیچے پیٹ پر ہاتھ باندھتے ہیں کہ دشمن کا راستہ روک دیں، ہمارے ائمۂ احناف، ناف کے نیچے ہاتھ باندھتے ہیں کہ ابتدا ہی سر چشمہ کی بندش کریں، ہاتھ وقتاً فوقتاً (شیطانی دخل سے) ڈھیلے ہو جائیں گے، اسے کس لیا کریں، (نماز کے ارکان میں) نگاہ کے جو مواضع شریعت نے بتائے ہیں، ان سے یہی مقصود ہے کہ خیال پریشان نہ ہونے پائے، اس کی پابندی ضروری ہے۔ (جس کی تفصیل یہ ہے)

قیام میں نگاہ جائے سجدہ پر رہے، رکوع میں پاؤں پر، سجود میں بینی (ناک) پر، قعودی گودی پر، سلام میں شانوں پر، کان اپنے آواز سے بھرے رہیں، پڑھنے میں جلدی چاہیے، آہستہ ڈھیل کے ساتھ پڑھا جائے، (تو) خیال کو انتشار کا میدان وسیع ملتا ہے، جب جلد جلد الفاظ ادا کیے جائیں اور صحت کا بھی خیال رہے تو خیال کو اس طرف سے فرصت نہ ملے گی۔

اعلیٰ حضرت مزید فرماتے ہیں (شیطانی وسوسے دور کرنے اور توجہ ظاہر و باطن میں) "ایک بڑی اصل یہ ہے کہ سر سے پاؤں تک ہر جوڑ، ہر رگ، نرم اور ڈھیلا اور تصور میں زمین کی طرف متوجہ رہے، ہاتھ کھنچے ہوئے نہ ہوں، مونڈھے اوپر کو نہ چڑھے ہوں، اور پسلیاں سخت نہ ہوں، بدن کی یہ وضع بھی بدل جائے گی، لحاظ رکھیں، تبدیل پاتے ہی فوراً ٹھیک کر لیں، اس کے یہ معنی نہیں کہ قیام میں جھکا ہوا کھڑا ہو، یا رکوع میں سر نیچا ہو، یا سجود میں کلائی یا بازو یا زانو خلاف قیام وضع مسنون ہوں، کہ یہ تو ممنوع ہے

بلکہ توجہ میں ہر عضو زمین کی طرف جھکا ہوا ہو، پٹھے کھنچے ہوئے نہ ہوں، نرم ہوں، اور یہ تجربے سے ظاہر ہو جائیں گے، جس طرح بتایا گیا، سیدھا کھڑا ہو تھوڑی دیر میں دیکھے گا، کہ پٹھے سخت ہو گئے، شانے او رپسلیاں اوپر کو چڑھتے ہوئے معلوم ہوں گے، اور تصور ٹھیک کرتے ہی بغیر اس کے کہ بدن کو جنبش دے محسوس ہوگا کہ سب اعضا اتر آئے اور زمین کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اگر از کار نماز کے معنی معلوم ہوں، فبہا، ورنہ اتنا تصور جمائے رہے کہ میں اپنے رب کے روبرو کھڑا ہوں اور عاجزی سے اپنی عرض کر رہا ہوں، اور اس پر معین ہوگا، گڑگڑانے کی صورت منہ بنانا، جب یہ وضع بدلے فوراً متوجہ ہو کر پھر بنالے، معاً خیال صحیح ہو جائے گا، وسوسے جو آئیں، ان کے دفع کی کوشش نہ کرے، اس سے لڑائی باندھنے میں بھی اس کا مطلب حاصل ہے کہ بہر حال نماز سے غافل ہو کر دوسرے کام میں مشغول ہوا، بلکہ معاً ادھر سے خیال اپنے رب کے حضور عاجزی کے ساتھ متوجہ کر دے، اور وسوسے کو یہ سمجھ لے کہ کوئی دوسرا بک رہا ہے، مجھ سے کچھ کام نہیں، اگر زیادہ ستائے، تو اسی عاجزی میں اپنے رب سے فریاد کرے، اس کا قاعدہ ہے کہ یادِ الٰہی کرتے ہی بھاگ جاتا ہے۔

بڑا گر، یہ ہے کہ پیٹ نہ خالی ہو، نہ بھرا، اتنا خالی کہ بھوک پریشان کرتی ہو، مضر ہوگا، اور بھرے کے ضرر کا تو ٹھکانا ہی نہیں، افضل او روا وہی تہائی پیٹ ہے"۔ [حیات اعلیٰ حضرت ج ۳ ص ۸۸ تا ۹۰ ترتیب مختصر]

نماز کی طرح ایک اور خاص وقت میں شیطان مومن بندے پر خصوصی یورش کرتا ہے اور وہ نیند سے بیداری کا وقت ہے، اعلیٰ حضرت اس خاص وقت کے شیطانی وسوسے سے بچاؤ کی تدبیر اور علاج یہ بتاتے ہیں:

"جس وقت آدمی سو کر اٹھتا ہے، خیال کہ مجتمع تھا، بجلی کی چال سے منتشر ہو جانا چاہتا ہے، اگر پھیل گیا تو سمٹنا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے آنکھ کھلتے ہی پہلا کام یہ کرے کہ خیال کو روک کر تصور میں تین مرتبہ کلمۂ طیبہ پڑھے، یہ ابتدا اس کے خیال کی ہوگی، تو دن بھر اس کی برکت، اس کے خیالات پر حاوی رہے گی"۔ [ایضاً ص ۸۸]

مومن کا تیسرا دشمن اس کا وہ بگڑا ہوا ماحول و معاشرہ ہے، جس میں وہ رہتا ہے، جس سے آدمی خواہی نہ خواہی متاثر ہوتا ہے، خراب سماج کا فساد اپنے ہر فرد پر کچھ نہ کچھ اثر انداز ہوتا ہے، یہ سماج نیک

اور نیکی پسند شخص کی نہ صرف یہ کہ موافقت نہیں کرتا، بلکہ نیکی کے لیے رکاوٹ بھی بنتا ہے، سماج کے بگڑے ہوئے افراد اپنے بگاڑ کے ساتھ نیک شخص کو بھی بگڑا ہوا دیکھنا پسند کرتے ہیں، اور ہر دم نفس اور شیطان کے زیر اثر نیکوں کو، نیکی سے دور رکھنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں، اور نیک آدمی کی تضحیک اور طعن و تشنیع کرتے رہتے ہیں، یہ بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے، بسا اوقات نیک آدمی ان کے ڈر سے نیکی کا عزم رکھنے کے باوجود بھی نیکی نہیں کر پاتا۔

اس کا علاج یہ ہے کہ ممکن حد تک ایسے معاشرے اور ایسے افراد سے دوری بنائے رکھے، اور کم آمیزی اختیار کرلے اور دوری مشکل ہو تو ان کی ایذا رسانیوں پر خاموشی کے ساتھ صبر کرے، اور نیکی کی راہ نہ چھوڑے۔

زمانہ با تو سازد   تو با زمانہ مساز

خاص طور سے اہل علم یعنی علما و طلبہ کے لیے نفس و شیطان کے ساتھ اس کے معاشرے کے بدعمل، بے پروا، اور اپنے مقصود سے غافل افراد قدم قدم پر تحصیل علم سے رکاوٹ بنتے ہیں، اور اپنی طرح وقت کی بے قدری، فضول گوئی، آرام طلبی، بزم آرائی اور بے فائدہ گشت جیسی مضر یا غیر ضروری یا کم از کم غیر اہم کاموں کا شکار بناتے رہتے ہیں، اور ہمنوائی نہ کرنے پر تضحیک و تشنیع کرتے ہیں، مولی تعالی ہمیں نفس، شیطان اور ایسے معاشرے کے شر سے بچائے اور اخلاص و نیک نیتی اور دین و دنیا کے کاموں میں محنت و مجاہدے کی توفیق عطا فرمائے!

وما ذالك على الله بعزيز

[پیام حرم مارچ ۲۰۰۷ء]

اسلام، علم اور صنفِ نازک

کوئی بھی انسان خواہ مرد ہو یا عورت اسے ہمیشہ اس دنیا میں نہیں رہنا ہے، بلکہ زندگی کی مقررہ مدت پوری کر کے اسے ایک اور نئی اَن دیکھی دنیا میں جانا ہے اور ہمیشہ وہیں رہنا ہے، اسی نئی دنیا کا نام آخرت ہے، اور آخرت کی زندگی ہی صحیح معنوں میں حقیقی اور دائمی زندگی ہے، اور آخرت کی زندگی کا دکھ سکھ ہی اصلی دکھ سکھ ہے، دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے، یہاں جس شخص نے ایمان اور اچھے عمل کی جس قدر زیادہ محنت سے، جتنی زیادہ اچھی کھیتی کر لی، اسے آخرت کی زندگی میں اتنا ہی زیادہ سکھ اور چین ملے گا، اور جس نے یہاں کی عمل کی کھیتی میں جتنی زیادہ غفلت ولاپروائی برتی، اسے آخرت میں اتنا ہی زیادہ دکھ اٹھانا پڑے گا۔

اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ جس طرح ایک کسان کے لئے زمینی پیداوار کی اچھی کوالیٹی اور زیادہ مقدار حاصل کرنے کے لیے کھیتی کرنے سے پہلے اس سے متعلق زیادہ سے زیادہ جان کاری اور معلومات حاصل کرنا ضروری ہے، اسی طرح ایک مسلمان کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ دنیا کی زندگی میں اچھے عمل کی کھیتی کرنے سے پہلے زیادہ سے زیادہ اس کی جان کاری اور علم حاصل کر لے۔ ورنہ اناڑی لاپرواہ محروم کسان کی طرح یہ مسلمان بھی اپنے عمل کی کھیتی میں نقصان ہی اٹھائے گا۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ دین کا کام ہو یا دنیا کا، عمل سے پہلے علم حاصل کرنا بہر حال ضروری ہے۔ علم اور تعلیم کی اہمیت اور ضرورت وافادیت اہل دین ومذہب کے نزدیک بھی تسلیم شدہ ہے اور دین ومذہب سے قطع نظر خالص دنیاداروں اور مادہ پرستوں کے یہاں بھی

ہمارا دین کہتا ہے: "طلب العلم فريضة على كل مسلم ومسلمة" ۔ (الحدیث) علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر ضروری ہے، خواہ مرد ہو یا عورت۔ (کیمیائے سعادت اردو امام غزالی ص ۱۲۷)

ایک غیر مذہبی ماہر تعلیم اور مفکر، دنیوی نقطۂ نظر سے تعلیم کی ضرورت واہمیت ان لفظوں میں بیان کرتا ہے:

"تعلیم ایک ناگزیر عمل ہے کیوں کہ کسب معاش سے لے کر کسب جاہ تک تقریباً ہر انسانی

خواہش تعلیم سے مدد لینے پر مجبور ہے، تعلیم کی ضرورت، تہذیب کے ارتقا کے ہر دور میں تسلیم کی جاتی تھی۔ مگر آج کے جدید دور میں جب کہ سائنس کی مہلک ایجادات نے انسان کا مستقبل ہی خطرے میں ڈال دیا ہے، تعلیم کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔" (اصول تعلیم ص ۲۲، ضیاءالدین علوی)

علم کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ ہمارے معاشرے کا ہر فرد علم اور جہل کے فرق کو بہت واضح طور سے سمجھتا ہے۔ اور تعلیم یافتہ انسان کو غیر تعلیم یافتہ اور ناخواندہ انسان پر فضیلت واہمیت دیتا ہے۔ اور علم کی وجہ سے اس کا ادب واحترام کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ علم چاہے دین کا ہو چاہے دنیا کا، بہر حال قابل قدر ہے، اسے کم نصیبی ہی کہیے کہ علم کو دین اور دنیا کے دو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے، اور اس تقسیم کی زیادہ تر ذمہ داری ہوا پرست قوتوں نیز یورپ وامریکہ کی سیاسی بالا دستی پر عائد ہوتی ہے، جس نے بڑی چابکدستی سے دین اور سیاست کو جدا کر رکھا ہے، جب کہ اقبال کی اسلامی نظر میں دین اگر سیاست سے جدا ہو جائے تو چنگیزی کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ اسی طرح دین اور دنیا کے خانوں میں علم کی تقسیم بھی بے جا تعدی اور ظلم و چنگیزی ہے۔

اسلام کے نظریے کے مطابق علم ایک ایسا ہمہ گیر اور جامع وصف ہے جو دین اور دنیا دونوں کو شامل ہے، دنیا کا کام بھی خدا کی مرضی اور اس کے اصول وہدایات کے مطابق ہو تو یہ بھی عبادت بن جاتا ہے، لہٰذا اس نیت سے اس کام کا سیکھنا اور جاننا بھی عبادت ہے اور اس پر بھی ثواب ملے گا، بلکہ بقدر ضرورت اس کا سیکھنا فرض ہے۔ عصری اسکولوں اور کالجوں میں بھی دنیوی علوم کے ساتھ دین کی ضروری اور بنیادی تعلیم بھی لازم ہے، ہاں تفصیل اور دلائل کے ساتھ علم دین سیکھنا ہر فرد کے لیے ضروری نہیں۔ اور نہ ہر فرد اس کا اہل ہی ہے، لہٰذا وہ دنیوی تعلیم جسے عملاً دین سے بالکل الگ رکھا جاتا ہے، جیسا کہ اکثر اسکولوں اور کالجوں میں ہوتا ہے۔ اس کے نقصانات انتہائی بھیانک شکل میں سامنے آتے ہیں، اور بندہ خدا سے دور ہو جاتا ہے۔ نیز انسانی معاشرہ سماجی تفریق اور اقتصادی ناہمواری کا شکار بن جاتا ہے۔ بقول ضیاءالدین علوی:

"روحانیت کی طرح مذہب کی اہمیت بھی آج کی دنیا میں مادیت پرستی کے تحت بہت کم ہو گئی ہے۔ مذہب کو اب انسان کا ذاتی مسئلہ سمجھا جاتا ہے، اس لیے مدرسے (اسکول) میں نصاب میں اس کی

طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سی اخلاقی قدریں جن کا براہ راست مذہب سے تعلق ہے، مفقود ہو گئی ہیں، اور طلبہ ذہنی انتشار کا شکار نظر آتے ہیں، سوائے اقتصادی تگ و دو کے ان کے سامنے کوئی دوسرا نصب العین نہیں ہوتا، مذہب اس کمی کو پورا کر سکتا ہے۔" (ایک ماہر تعلیم مفکر) "راس" کہتا ہے:

"مذہب کو تعلیم میں بنیادی حیثیت دینی چاہیے، جس تعلیم میں مذہب کو نظر انداز کر دیا جائے وہ تعلیم کہلانے کی مستحق نہیں ہے"۔

مذہب محض چند رسوم اور عبادات کا نام نہیں، جنھیں انسان سیکھ لے اور ادا کر دیا کرے، وہ در اصل انسان کی روحانی فطرت کا مظہر ہے، اور انسان کی چند اہم نفسیاتی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور اس کی نظر کو عارضی اور وقتی چیزوں سے ہٹا کر دائمی حقائق سے روشناس کرتا ہے۔ اور اس کے اور خالق کائنات کے درمیان ایک ایسا تعلق قائم کرتا ہے جو انسان کی شخصیت کی تکمیل کے لیے لازمی ہے۔

ہماری آج کی تعلیم کی سب بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ مذہب سے بالکل بے تعلق ہو گئی ہے، اور طلبہ میں مذہبی روح پیدا کرنے کی طرف سے بالکل غافل ہے، یعنی تعلیم میں قومی زندگی کے ایک اہم پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ تعلیم صرف ایک خاص طبقے کے قبضے میں ہے۔ جو اقتصادی دوڑ میں بہت آگے نکل گیا ہے۔ اور عوام پچھڑ گئے ہیں،...... اس لیے ماہرین تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسی تعلیم کا انتظام کریں، جس میں اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ تہذیب، ثقافت اور مذہبی قدروں کو مناسب نمائندگی حاصل ہو۔ (ایضاً ص۲۲، ۲۳)

لہٰذا عصری تعلیم کے اداروں میں بھی دنیوی تعلیم کے شانہ بشانہ دینی تعلیم کو بھی نصاب تعلیم کا لازمی اور بنیادی عنصر قرار دیا جانا چاہیے، تاکہ خدا اور بندے کے تعلق اور بندوں سے بندوں کے تعلق میں انقطاع یا ناہمواری نہ پیدا ہونے پائے۔

امام غزالی علیہ الرحمہ پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی طلب علم کی فرضیت والی مشہور حدیث کے مفہوم و مراد کو تفصیل کے ساتھ سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کس پر؟ کتنا؟ اور کس چیز کا علم فرض ہے؟ فرماتے ہیں:

''اس بات میں علما کا اختلاف ہے کہ وہ کون سا علم ہے جس کا حاصل کرنا سب پر فرض ہے متکلمین کہتے ہیں وہ علم کلام ہے کہ اس سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ فقہا کہتے ہیں کہ وہ علم فقہ ہے کہ اس کی بدولت آدمی حلال وحرام میں فرق کرسکتا ہے۔ محدثین کہتے ہیں کہ وہ علم تفسیر ہے کہ علوم شرعیہ کی اصل یہی ہے۔ صوفیا فرماتے ہیں کہ وہ احوال دل کا علم ہے کہ دل خدا کی طرف بندے کی راہ ہے۔ الغرض ہر عالم اپنے علم کی عظمت بیان کرتا ہے اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ نہ کسی ایک علم کی خصوصیت ہے نہ سب علوم کی فرضیت ہے، اس مقام میں تفصیل ہے، اس کے اعتبار سے یہ اشکال رفع ہو جاتا ہے۔

جو کافر صبح کے وقت مسلمان ہو یا جو لڑکا بالغ ہو، اس پر یہ سب علم سیکھنا فرض نہیں ہے، بلکہ اس وقت اس پر اتنا فرض ہے کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے معنی جانے، اور ان معنوں کا علم اس طرح حاصل ہوتا ہے کہ اہل سنت کے عقائد حاصل کرے، اس طرح پر حاصل کرنا ضروری نہیں کہ ان عقائد کے دلائل بھی جان لے، دلائل کا جاننا اس پر لازم نہیں۔ لیکن ان عقائد کو قبول کرلے اور سب پر یقین کرلے، اور ان کا تفصیل سے جاننا بھی ضروری نہیں، مگر خدا، رسول، آخرت، بہشت، دوزخ، اور حشر ونشر تمام باتوں کا اعتقاد رکھے اور یہ جان لے کہ اس کا خدا، ان، ان صفات سے متصف ہے اور اسی خدا کی طرف سے رسول مقبول ﷺ کی زبانی پیغام واحکام آئے ہیں۔ جو اطاعت کرے گا مرنے کے بعد سعادت پائے گا اور جو نافرمانی کرے گا، وہ شقی وکم نصیب ہوگا۔ جب اس نے یہ جان لیا، تو دو طرح کے علم اس پر واجب ہوتے ہیں (۱) ایک تو دل سے تعلق رکھتا ہے، اس کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک ان کاموں کا علم جو کرنے کے قابل ہیں، اور ایک ان کاموں کا علم جو نہ کرنے کے لائق ہیں۔ جو کام کرنے کے قابل ہیں، ان کا علم ایسا ہے، جیسے کوئی صبح کو مسلمان ہوا، جب ظہر کی نماز کا وقت آجائے تو اس پر بقدر فرض طہارت ونماز سیکھنا فرض ہوتا ہے۔ اور جو چیز سنت ہے اس کا سیکھنا بھی سنت ہے فرض نہیں ...... جب رمضان آئے تو روزے کا جاننا اس قدر اس پر فرض ہو جاتا ہے کہ یہ جان لے کہ روزے کی نیت فرض ہے اور صبح سے غروب آفتاب تک کھانا پینا اور جماع حرام ہے...... اسی طرح جب کوئی دنیا کا کام پیش آتا ہے، تو اس وقت اس کا علم بھی فرض ہو جاتا ہے، جس وقت نکاح کرے، اس وقت اس کا علم بھی فرض ہو جاتا ہے مثلاً

یہ جاننا کہ خاوند پر بیوی کا کیا حق ہے؟ اور حالت حیض میں جماع کرنا درست نہیں، اور حیض کے بعد غسل کرنے تک جماع نہ کرنا چاہیے، اور اس کے سوا جو چیزیں نکاح سے تعلق رکھتی ہوں ان سب کا علم فرض ہو جاتا ہے......

اگر آدمی کوئی پیشہ کرتا ہے تو اس پیشے کا علم بھی اس پر فرض ہو جاتا ہے اگر تاجر ہے تو تجارت کے مسائل اور بیع کی شرطیں معلوم کرنا فرض ہے، تا کہ بیع باطل سے بچے، اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوکانداروں کو درے مار کر علم سیکھنے کے لیے بھیجتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ جو کوئی بیع کے احکام نہ جانے اسے تجارت نہیں کرنا چاہیے، کہ لاعلمی میں سود کھائے گا اور خبر بھی نہ ہوگی۔ اسی طرح ہر پیشہ کا ایک علم ہے حتی کہ اگر جراح (سرجن) ہے تو اس کو یہ جاننا چاہیے کہ آدمی کے بدن سے کیا چیز کاٹنے کے لائق ہے اور تکلیف کے وقت کون سا دانت اکھاڑنے کے قابل ہے...... وعلی ہذا القیاس۔

اور یہ علوم ہر شخص کے حال کے موافق ہوتے ہیں لہذا کپڑوں کے تاجر پر سرجری سیکھنا فرض نہیں۔

اور جو کام نہ کرنے کے لائق ہیں، ان کا علم بھی فرض ہے، لیکن ہر شخص کے حال کے موافق مختلف ہے، اگر کوئی شخص شراب خوروں یا سور کا گوشت کھانے والوں کے پاس یا غصب کی جگہ میں رہتا ہے یا حرام مال اپنے قبضے میں رکھتا ہے تو علما پر واجب ہے کہ اسے ان باتوں کا علم سکھا دیں کہ یہ حرام ہے۔ اور جو کام دل سے تعلق رکھتے ہیں ان کی پھر دو قسمیں ہیں، پہلی قسم دل کے حالات سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری قسم اعتقادات سے۔ پہلی کی مثال یہ ہے کہ آدمی کے لیے یہ جاننا فرض ہے کہ کینہ، حسد، تکبر، بدگمانی اور اس جیسے امور حرام ہیں، اور اس کا جاننا فرض عین ہے، اس لیے کہ کوئی بھی شخص ان عادتوں سے خالی نہیں، تو اس کا علم اور اس کے علاج کا علم سب پر فرض ہے، کیوں کہ اس قسم کی بیماری عالم گیر ہے اور بے علم کے اس کا علاج نہ ہوگا، لیکن بیع سلم اور اجارہ اور رہن اور اس قسم کے معاملات کا علم جو فقہ میں مذکور ہے فرض کفایہ ہے، فرض عین نہیں۔ یہ اسی پر فرض ہے جو ایسے معاملات کرنا چاہتا ہو......

دوسری قسم جو اعتقادات سے متعلق ہے، یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی اعتقاد میں کچھ شک پیدا ہو جائے تو اگر شک ایسے اعتقاد میں ہے، جو واجب ہے یا جس کے اعتقاد میں شک آنا درست نہیں ہے

ہو تو اس شک کو دل سے نکال باہر کرنا فرض ہے۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوا کہ طلب علم سب مسلمانوں پر فرض ہے۔ کیوں کہ کوئی مسلمان جنس علم سے بے نیاز نہیں ہے۔ بلکہ حالات و اوقات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور کوئی شخص علم کی ضرورت سے کسی طرح خالی نہیں، اسی وجہ سے رسول مقبول ﷺ نے فرمایا ہے:

"کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جس پر طلب علم فرض نہ ہو، یعنی جس شخص کو جس علم کی ضرورت ہے اس پر اس کا سیکھنا بھی فرض ہے۔ (کیمیائے سعادت اردو ص ۲۹ تا ۲۷)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے اس طویل اقتباس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہر مسلمان کے واسطے ایسی اسلامی زندگی گزارنے کے لیے جو اللہ و رسول کی مرضی کے مطابق ہو، خواہ وہ خالص فرض عبادات مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوۃ، نیز واجبات ہوں جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں، ان کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ بندوں کے باہمی معاملات، پیشے، تجارت، صنعت و حرفت، ملازمت اور دیگر دنیا کے کام جو بظاہر نجی مفادات مثلاً کسب معاش یا طبعی حاجات و عادات سے متعلق ہیں، بوقت ضرورت اور بقدر حاجت، ان کا جاننا بھی ضروری ہے۔

عورتیں انسانی آبادی کا آدھا حصہ ہیں، جس طرح مرد اللہ کے بندے ہیں اور ایمان اور فرض کردہ اعمال کے مخاطب و مکلف ہیں اسی طرح عورتیں بھی اس کی بندی ہیں اور ان پر بھی اللہ کے احکام لاگو ہوتے ہیں، تکلیف اعمال میں عورتوں اور مردوں میں کوئی فرق نہیں، ہاں مگر یہ کہ صنف نازک (عورتیں) اپنی بعض صنفی خصوصیات و امتیازات کی وجہ سے بعض حالات میں بعض عوارض کے سبب بعض احکام و مسائل میں مردوں سے مختلف ہیں، اور عقل و دین کی کمی نیز مخصوص طبعی ساخت اور خاص صنفی اوصاف کے تقاضے سے کہیں کہیں کچھ سہولتوں کی حق دار ہیں مثلاً حیض و نفاس کے دنوں میں نمازوں کا سقوط، تو کہیں کہیں ان پر مردوں کے مقابلے میں مزید پابندیاں عائد کی گئی ہیں، جو ان کی صنفی خصوصیت کے عین مطابق ہے۔ جیسے پردہ کرنا، مرد کے مقابل آدھی گواہی، میراث میں آدھا حصہ وغیرہ۔ بہر کیف ایک مومن ہونے کے ناطے خدا اور رسول کے حکم کے مطابق دین و دنیا کا کام کرنے کے لیے ان پر بھی علم سیکھنا فرض ہے، بلکہ عورت کے لئے صاحب علم ہونا ایک حیثیت سے مردوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی ضروری اور اہم ہو جاتا ہے، کیوں یہی عورت بڑی ہو کر جب ماں بنتی ہے، تو اس کی آغوش، اس کے بچے

شعور نونہال کے لیے کئی سال تک سب سے پہلی اور اکیلی تربیت گاہ کا کام کرتی ہے۔ باپ کی تربیت کا دور تو بعد میں آتا ہے، پھر بچہ کچھ بڑا ہو کر گھریلو معاشرے میں باپ بھائی، دادا، کے ساتھ اپنی بہن ماں، دادی اماں، اور دیگر عورتوں سے بھی لاشعوری اور شعوری طور سے بہت کچھ سیکھتا اور پڑھتا ہے۔

مرد کی طرح عورت بھی جب بالغ ہو جاتی ہے تو اللہ اور اس رسول کے تمام احکام کی پابندی اس پر بھی لازم ہو جاتی ہے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوۃ سمیت اللہ تعالی کے تمام حقوق اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی اس پر بھی فرض ہو جاتی ہے، اسے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے بچے اور شریعت کی مکمل پابندی کر کے اپنی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھال لے۔ اور ایسا نہ کرنے پر اسے بھی خدائی عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا، پاکی ناپاکی کی تمیز اور حلال و حرام کا فرق، اپنی عملی زندگی میں مردوں ہی کی طرح اسے بھی کرنا ضروری ہے۔

عورت جسے قدرت نے تسیم اخلاق کی نکہت جانفزا، انسانیت کے چہرے کا غازہ، مرد کے دل کی دھڑکن اور سکون، مرد کی آدھی ادھوری زندگی کی تکمیل، سفر حیات کی ساتھی، گھر کی امانت دار رکھوالی اور بقائے نسل انسانی کا ذریعہ بنایا تھا۔

اس کے لیے اسلام سے پہلے انسانی معاشرے میں کسی قسم کی کوئی انسانی حیثیت اور عزت وعظمت حاصل نہیں رہ گئی تھی۔ عورت، بندھوا، مزدور یا گھر کی لونڈی تھی، بلکہ مرد اس کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرتے تھے، ایک عورت کئی کئی مردوں کے لیے شہوت رانی اور خواہش نفسانی پورا کرنے کا کھلونا بن کر رہ گئی تھی، بات بات پر اس کی پٹائی کی جاتی تھی حتی کہ معمولی معمولی باتوں پر اسے قتل بھی کر دیا جاتا تھا، بلکہ شرم و عار کے مارے یا فقر و افلاس کے ڈر سے بچپن ہی میں زندہ در گور کر دی جاتی تھی، ظالم دنیا نے بے چاری عورت سے عزت کے ساتھ جینے کا حق بھی چھین لیا تھا، اسلام نے اسی عورت کو سماج میں مرد کے دوش بدوش نسوانی حیثیت کے مطابق مکمل طور سے انسانی حقوق عطا کیے، اسلام نے عورت کو باعزت زندہ رہنے کا حق دیا، اسلام نے عورت کو دنیا کی دو روشن آنکھوں میں سے ایک روشن آنکھ بتا کر دنیا کو کانی ہونے سے بچایا۔ اسلام نے عورت کو کامل انسانی عزت وعظمت بخشی، اسلام نے عورت کو ماں ہونے کی حیثیت سے قابل احترام ہستی بنایا، اسلام نے عورت کو

پیار و محبت کے پاکیزہ جذبات کا حسین تاج محل قرار دیا، اسلام نے عورت کی عفت و عصمت کے تحفظ کی گارنٹی لی۔

پھر تو اسلام کے بعد یہی عورت نبوت کے سوا تمام فضائل و کمالات کی حق دار ہو گئی۔ عورت نبی تو نہ بنی، لیکن نبی کی محرم اور حرم ضرور بن گئی، یہی عورت خدیجہ و عائشہ کی صورت میں ام المومنین کے تمغۂ امتیاز سے سرفراز ہوئی۔ یہی عورت فاطمہ کی شکل میں جنتی عورتوں کی سردار ہوئی، اسی عورت نے صحابیت کا بلند مقام حاصل کیا، اسی عورت نے تابعیت کا شرف پایا، یہی عورت امامت نہ سہی، مگر ولایت کے عظیم مرتبے پر ضرور فائز ہوئی۔

سماج میں عورت کی مظلومیت اور اسے اس کا حقیقی رتبہ نہ ملنے کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ عورتوں پر مردوں کو بالا دستی حاصل تھی اور یہ بالا دستی حد سے آگے بڑھ کر ظلم کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ کیوں کہ عورتوں پر مردوں کی بالا دستی کا قائل تو مذہب اسلام بھی ہے: ''الرجال قوامون علی النساء''۔ (القرآن) مرد عورتوں کے حاکم اور بالا دست ہیں

دین اسلام میں یہ بالا دستی اس لیے ہے کہ یہ قدرتی طور سے صنفِ نازک ہے اور صنفی اعتبار سے مردوں جیسی قوت ضبط، اصابت فکر و نظر اور صلابت عقل و خرد نہیں رکھتی، پھر اس کے کام اور ذمے داریاں بھی مردوں سے کچھ الگ اور مختلف ہیں، اس لیے اسلام نے اس کی خلقی صلاحیتوں کو ملحوظ رکھ کر اس کو مخصوص ''دائرۂ عمل'' کا پابند بنا دیا، جو نہ صرف اس کی فطرت کے عین مطابق ہے بلکہ اس کی عزت و عظمت اور عفت و عصمت کے لیے انتہائی ضروری بھی ہے۔

عورت کو اس کا جائز حق اور حقیقی رتبہ نہ ملنے کی جہاں اور بہت سی وجہیں تھیں، وہیں ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ عورت پڑھی لکھی نہیں تھی، اسے اپنے مقصد وجود کا پتہ نہیں تھا، وہ علم سے بیگانہ تھی، بلکہ قصداً اسے علم سے دور رکھا گیا تھا، اسی لیے کارگاہ عمل میں بھی وہ پیچھے تھی، اور اسلام سے پہلے عورتوں کا کوئی قابل قدر بڑا علمی اور مذہبی و اصلاحی کارنامہ تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ نہیں ہے۔ اسلام نے اسے علم کے زیور سے آراستہ ہونے اور علم کا ہتھیار آزمانے کا موقع فراہم کیا، چنانچہ عورتوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اس سے خوب فائدہ اٹھایا، اور ان کے زیور علم کی چکا چوند سے جہالتوں کی تاریک دنیا

جگر گم تھی، اور اس صنفِ نازک نے اپنے علم سے صرف عورتوں ہی کو نہیں بلکہ مردوں کو بھی علم وفکر کی جلا بخشی، انھی عورتوں نے بے مثال مفسر و محدث، فقہ وفرائض کی ماہر، اور حافظ وقاری بن کر دین اور علم کی ایسی بیش بہا اور نمایاں خدمات انجام دی ہیں، جو بہت سے مردوں سے بھی ممکن نہ ہو سکیں۔

صحابیات میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، ام المومنین حضرت حفصہ اور ام المومنین حضرت ام سلمہ اور ام ورقہ قرآن مجید کی مکمل حافظہ تھیں، جب کہ بہت سی صحابیات کو قرآن کے بہت سے اجزا یاد تھے۔ اور بعض صحابیات قرآن کی تعلیم بھی دیتی تھیں، مثلاً حضرت ام سعد بنت سعد بن ربیع وغیرہ۔ (فتح الباری ج۹ ص ۴۷۔ اسد الغابۃ ج۵ ص ۵۸۶)

تفسیر قرآن، حدیث اور فقہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا رسوخ وکمال اور تبحر کون نہیں جانتا؟ صحیح مسلم میں آپ سے منقول تفسیری مواد اس کی واضح دلیل ہے۔ تفسیر میں آپ کو بڑا کمال حاصل تھا، حدیث میں ازواج مطہرات کے درمیان حضرت صدیقہ کو امتیازی شان حاصل تھی۔ آپ سے دو ہزار دو سو دس حدیثیں منقول ہیں۔ اسی طرح حضرت ام سلمہ نے تین سو اٹھہتر حدیثیں روایت کی ہیں۔

محدثین کرام نے تعداد روایات کے اعتبار سے محدثین صحابہ کے پانچ طبقے کیے ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ کا تعلق پہلے طبقے سے ہے، فقہ میں آپ کو یہ مقام حاصل تھا کہ بڑے بڑے صحابۂ کرام ان کے یہاں حاضر ہو کر مسائل پوچھتے تھے، جن میں بعض کا علم صرف آپ ہی کو تھا، اور آپ ہی کے توسط سے اوروں کو معلوم ہوا آپ درجۂ اجتہاد پر فائز تھیں۔ (اعلام الموقعین ج۱ ص ۱۳) کے مطابق حضرت عائشہ کے فتاویٰ اس قدر ہیں کہ متعدد ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں، فرائض میں آپ کو خصوصی درک اور مہارت حاصل تھی، علم الاسرار میں حضرت ام سلمہ کو پوری جان کاری تھی، خطابت میں اسما بنت سکن کا خاص شہرہ تھا، یوں ہی طب اور سرجری اور شعر وشاعری میں بھی کچھ خاص صحابیات نامور ہوئیں۔

علم کے ساتھ عمل صالح، زہد و تقویٰ اور احسان و سلوک میں بھی صحابہ کے ساتھ صحابیات بھی شہرت رکھتی ہیں، بعض صحابیات کی ریاضت وعبادت کے واقعات حدیثوں اور تذکروں میں دیکھے جا سکتے ہیں، علم دین کے ساتھ علم دنیا اور دنیا کے کاموں اور پیشوں میں بھی یہ پیچھے نہیں تھیں، انور بانی

، باغبانی، سلائی، دباغت اور تجارت وغیرہ کا ثبوت تاریخ وسیر کی کتابوں میں موجود ہے۔ (اسد الغابہ وغیرہ دیکھیں)

صحابیات نے اشاعت علم اور ترویج وتبلیغ کتاب وسنت کا فریضہ بھی انجام دیا ہے، اور جنگی خدمات میں بھی حصہ لیا ہے، اصلاح واحتساب کے معاملے میں بھی صحابیات نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ نیکی کی تلقین، برائیوں اور غلطیوں پر گرفت اور اصلاح سے متعلق بہت سے واقعات ملتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت عبد الرحمن بن ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے اور بے احتیاطی کے ساتھ جلدی جلدی وضو کیا، اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ٹوکا کہ وضو اچھی طرح کرو، میں نے حضور سے سنا ہے کہ وضو میں جو عضو نہ بھیگے، اس پر جہنم کی پھٹکار ہے۔ (مسند ج ۶ ص ۲۸۵ بحوالہ اسوۂ صحابیات)

علم وتعلیم کا یہ سلسلہ صحابیات سے آگے بڑھ کر تابعیات اور پھر بعد کے زمانوں میں جاری رہا، اور علم ظاہر وباطن، علم دین ودنیا، میں ایک سے بڑھ کر ایک نامور عورتیں پیدا ہوتی رہیں، اور یادگار علمی وعملی کارنامے انجام دیتی رہی ہیں۔ اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، مزید تفصیل طولانی ہے، جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

پہلے کے مقابلے آج کے پرفتن، خدا بیزار، ہوس پرست، جہالت زدہ، عریانیت پسند، آزاد خیال، اور مغربیت کی یلغار کے دور میں عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا خود ان کے اور ان کی اولاد اور ان کے خاندان اور معاشرے کے حق میں اور ضروری ہو گیا ہے۔ خاص طور سے دینی تعلیم اور عصری اداروں میں غیر مخلوط تعلیم کی اشد ضرورت ہے، عصری اداروں سے بھی ایسے عصری ادارے مراد ہیں جہاں کے نظام ونصاب تعلیم میں دینیات، اسلامی تہذیب وثقافت، اور صحیح اسلامی فکر کو جگہ دی گئی ہو۔ ایسے عصری ادارے فی الحال نہیں کے برابر ہیں۔

لیکن اگر صاحب ثروت مسلمانوں کو ہمارے مذہبی رہنما یعنی علما ومشائخ اور نئی نسل کے محفوظ، روشن مستقبل کے تئیں حساس اور ذمہ دار دانشوران توجہ دلائیں اور حکمت واخلاص کے ساتھ انھیں اس کی اہمیت بتائیں تو ان سے یہ کام دھیرے دھیرے آسانی سے لیا جا سکتا ہے، کیوں کہ انھیں اہل ثروت سے

مذہبی رہنما اور قائدین تعلیم کے علاوہ تعلیم سے کم اہم بلکہ کبھی کبھار کچھ غیر ضروری بلکہ کسی حد تک مضر کاموں کے لیے جذباتی اپیلوں کے ذریعے بڑے بڑے مادی تعاون حاصل کرنے میں بہت جلد کامیاب ہوتے رہے ہیں۔ اور جب عوام سے جوش و جذبات میں بڑا سے بڑا وقتی ناپائیدار اور نسبتاً کم اہم اور کم مفید کام لیا جاسکتا ہے اور لیا بھی گیا ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ تعلیم جیسا ٹھوس، دیرپا، مفید و اہم بلکہ زیادہ ضروری کام کیوں نہیں لیا جاسکتا، خواہ وہ بچوں کی تعلیم کا مسئلہ ہو، یا بچیوں کی تعلیم کا۔ بس سنجیدگی سے غور کر کے حکیمانہ انداز سے اہل ثروت کو بچوں کی دینی و عصری تعلیم کے ساتھ تعلیم نسواں کی اہمیت و ضرورت اور تعلیم نسواں کے غیر مخلوط نیم مذہبی عصری اداروں کے قیام اور ان کو بہتر نظم و ضبط اور معیار کے ساتھ چلانے اور اس میں تعاون کرنے پر آسانی سے آمادہ کیا جاسکتا ہے۔

جس کے نصاب پر اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی فکر کی چھاپ ہو، اہل ثروت کو بتایا جائے کہ یہ ان کی دنیاوی ترقی کا ذریعہ بھی ہے اور نئی نسلوں میں صحیح دینی مزاج و ماحول پیدا کرنے اور غیر اسلامی فکر، لادینی نظریات اور غیر شرعی اعمال و اخلاق اور رسوم و عادات سے انھیں بچانے کا مستحکم قلعہ بھی۔

جب انھیں یہ احساس ہو جائے گا کہ بچیوں کی تعلیم خود ان کی اور ان کی اولاد کی دنیاوی اور مذہبی ضرورت ہے اور اسی سے ان کا روشن مستقبل وابستہ ہے اور قومی مفاد بھی، تو انھیں بہت آسانی کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آجائے گی اور عملی اقدام کے بعد جب دھیرے دھیرے اس کے مفید نتائج آنا شروع ہو جائیں گے، تو انھیں مزید سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

نیز موجودہ نسل میں تحفظ عقائد، تحریک عمل، اور تبلیغ و اشاعت دین کا جذبہ بیدار کرنے کے نقطۂ نظر سے اور صحیح دینی، متوارث فکر و عمل کو آنے والی مسلم نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے اس سے زیادہ اہم اور ضروری دوسرا کام یہ ہے کہ پرائمری سطح سے لے کر فضیلت و تخصص کی سطح تک کے تعلیم نسواں کے غیر مخلوط ایسے دینی مدرسوں کا قیام بھی عمل میں لایا جائے، جن کے نصاب تعلیم کا غالب حصہ عربی زبان میں اسلامی فکر و عقیدہ، علوم قرآن، علوم حدیث، علم فقہ، اصول فقہ، تصوف، اسلامی تاریخ اور مطالعۂ ادیان پر مشتمل ہو، اور عالمی زبان انگریزی شروع سے اخیر تک لازم رہے۔ ملکی زبان ہندی اور مخصوص زبان کے

مخصوص علاقوں میں مقامی زبان ابتداً ضرور پڑھائی جائے۔
مزید عصری علوم مثلاً ریاضی، سائنس، اور کمپیوٹر کو بھی درجہ آٹھ تک نصاب کا لازمی حصہ بنایا جائے۔ تاکہ نئی ایجادات، غیر مذہبی رائج علوم اور عالمی زبان اور علاقائی زبان کی مدد سے اسلامی تعلیمات کی تدریس و تعلیم ان کی ارسال و ترسیل، ابلاغ و تبلیغ اور رشد و ہدایت کے کام میں بے بسی اور رکاوٹ نہ پیدا ہو، یوپی اور کچھ صوبوں میں اس طرح کے دینی نسواں ادارے چل رہے ہیں، اور کامیاب بھی ہیں، لیکن ان کی تعداد ابھی بہت کم ہے، دوسرے علاقوں میں بھی زیادہ سے زیادہ ایسے ادارے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

[پیام حرم اپریل ۲۰۰۷ء]

کچھ دن جنت ارضی میں

[ایک یادگار معلوماتی سفرنامہ]

وادی گل وبلبل کشمیر جیسے خوبصورت اور دل کش علاقے کی خوبیاں سننے اور پڑھنے کے بعد فطری طور سے ہر دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ یہاں کی سیر کی جائے، اور کچھ دن قیام کر کے یہاں کے حسین مناظر قدرت سے لطف اندوز ہوا جائے، ایک عرصے سے اپنے دل میں بھی کچھ ایسی ہی تمنا مچل رہی تھی، جو پوری نہیں ہو پا رہی تھی، لیکن "سیروا في الارض" کے خدائی حکم پر عمل کی توفیق قسمت میں لکھی تھی، لہذا قدرت نے اس سال "سیر کشمیر" کے اسباب فراہم کردیے، فالحمدلله علی ذالك۔

ہوا یوں کہ دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی یوپی میں جہاں دسیوں صوبوں کے طلبہ زیر تعلیم ہیں وہیں کچھ کشمیری طلبہ بھی ہیں، انھیں میں سے ایک حافظ وقاری آصف ملک کشمیری بھی ہیں، جنھوں نے یہیں حفظ وقراءت کی تکمیل کی اور اس کے بعد شعبۂ عالیہ میں داخل ہوئے اور اس وقت عالمیت سال دوم کے طالب علم ہیں۔

انھیں میری خواہش کا علم تھا، لہذا انھوں نے کئی ماہ قبل ہی باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ اب کے ششماہی تعطیل وادی میں گزاری جائے، سیر کشمیر کے لیے ہفتہ دس روز کا اچھا ٹائم بھی ہے، موسم بھی معتدل ہے، ٹھنڈک کم ہے اور ہمارے یہاں درہال میں بابا مستان شاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کی سالانہ تقریب بھی ہے، اس میں بھی شرکت ہو جائے گی، میں نے موقع غنیمت جان کر تھوڑے تامل کے بعد حامی بھر لی اور ذہنی طور سے سفر کے لیے تیار ہو گیا۔

۳۰ راپریل ۲۰۰۷ء بروز منگل آٹھ بجے شب بستی سے بذریعہ ٹرین چوبیس گھنٹے چل کر دوسرے دن تقریباً آٹھ بجے شب ہم جموں پہنچے، ساتھ میں پونچھ ضلع کے رہنے والے دار العلوم علیمیہ کے طالب علم عزیزی بشارت حسین سلمہ بھی تھے، گونڈہ اسٹیشن سے حضرت مولانا انوار احمد بغدادی علیمی سابق استاذ شعبۂ ادب عربی دار العلوم علیمیہ وحال استاذ جامعہ حضرت نظام الدین ذاکر نگر دہلی بھی شریک سفر ہو گئے۔

رات جموں کے مسلم علاقے میں واقع خوشبو ہوٹل میں گزاری، پھر پانچ اپریل بروز جمعرات دس بجے صبح بذریعۂ منی بس جموں سے چل کر ضلع راجوری کے صدر مقام راجوری شہر پہنچے، یہ سفر پیچیدہ پہاڑی راستوں سے چار گھنٹے میں طے ہوا، راستے میں اکھنور نوشہرہ، رام بن، اور اودھم پور سے گزرنا ہوا، بیچ میں دریائے چناب کے اوپر بنے پل سے بھی گزرے۔

وادی درہال میں: پھر ایک گھنٹے کا سفر کر کے منی بس کے ذریعے راجوری شہر سے وادی درہال پہنچے، درہال ہی میں حافظ آصف ملک سلمہ رہتے ہیں، ٹیکسی اسٹینڈ سے تقریباً ایک کلومیٹر روڈ پر چل کر سڑک پر آئے، پھر سڑک سے نیچے پتھریلی نشیبی راہوں سے ہوتے ہوئے دریائے درہال کے کنارے آصف ملک سلمہ کے دولت کدے پر عصر کے وقت پہنچے، کشمیر میں ہمارا یہی پڑاؤ تھا، ان کے والد بزرگوار اور ان کے برادران اشرف بھائی، عثمان بھائی اور بھتیجوں نے بڑی محبت اور گرم جوشی سے استقبال کیا، اور انتہائی خوشی اور اعزاز کے ساتھ مہمان بنایا، یہ رات یہیں گزاری، اور ۵ اپریل جمعرات کی شام سے ۱۰ اپریل بروز منگل صبح ۸ بجے تک درہال ہی ہمارا مستقر رہا، اور یہیں سے کچھ قریبی جگہوں پر جانا آنا ہوا۔

بابا مستان شاہ غازی: ان کے مکان کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد کے پاس چند درختوں کے ایک باغ میں کچھ بزرگ آرام فرما ہیں، موصوف کے والد ہی دیکھ ریکھ کی خدمت انجام دیتے ہیں، یہ اسی سال کے پابند صوم وصلوٰۃ بزرگ اور بزرگوں کے عاشق ایک سعادت مند مسلمان ہیں، عصر کے بعد مزارات پر حاضری اور فاتحہ خوانی کے بعد انھوں نے مجھے ایک سادہ مگر چادر پڑی قبر کی طرف اشارہ کر کے سینہ بہ سینہ روایت کی مدد سے بتایا کہ ان بزرگ کا نام حضرت مستان شاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ ہے، یہ یہاں چھ سو سال قبل تشریف لائے تھے، اور جب وصال کا وقت قریب آیا، تو اس قبر کی جگہ آ کر انھوں نے زمین سے خطاب کیا کہ "مائی زمین! مجھے اپنے اندر جگہ دے دے" چنانچہ فوراً زمین نے اپنا سینہ کھول دیا، اور آپ اس میں سما گئے، ایک دوسری قبر کے بارے میں بتایا کہ یہ بابا فقیر شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی قبر ہے، اور تقریباً پچاس سال قبل ان کا وصال ہوا ہے، یہ بھی کہیں سے غیبی اشارے پر یہاں عبادت وریاضت اور رشد وہدایت کے لیے تشریف لائے تھے، سال کے ہر دن روزے سے رہتے تھے، اور پیٹ پر پتھر رکھے

رہتے تھے، ان بزرگوں کے پر فضا روحانی آستانوں پر حاضری دے کر اور ان کے حالات سن کر بڑا روحانی سکون اور کیف و سرور حاصل ہوا۔

۶ر اپریل کو جمعہ تھا، جمعہ کی نماز راجوری کی جامع مسجد عیدگاہ میں ادا کی نماز کے بعد صوفی محمد علی متعلم جامعہ نظام الدین اور اپنے والد اور بھائی صاحب کے ساتھ مل گئے، اور ان کے اصرار پر دوپہر کا کھانا انھیں کے ہوٹل میں کھایا۔

شاہدرہ شریف: پھر مغل شاہراہ پر واقع تھنہ منڈی ہوتے ہوئے مغرب کے وقت شاہدرہ شریف میں حضرت بابا غلام شاہ بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ [متوفی ۱۲۲۶ھ] کے آستانے پر حاضر ہوئے اور یہیں رات گزاری، رات کا کھانا رات ڈیوٹی پر جاری رہنے والے، اس آستانے کے لنگر سے کھلایا گیا اور ایک کمرے میں آرام کیا، عشا اور فجر کی نماز دربار کی مسجد میں ادا کی، پھر مزار شریف پر فاتحہ پڑھی، آپ کا آبائی وطن راولپنڈی اور جہلم کا درمیانی گاؤں سیداں کسرانوں ہے۔ ۱۱۸۰ھ میں شاہدرہ ضلع راجوری تشریف لائے۔

بڑا عالیشان اور بافیض آستانہ ہے، کشمیر کے علاوہ پنجاب کے زائرین بھی نظر آئے، زائرین کے لیے کئی ایک گیسٹ ہاؤس بنے ہوئے ہیں اور مفت رہائش و خوراک کا انتظام رہتا ہے، ہر وقت سیکڑوں زائرین حاضر رہتے ہیں، یہاں پر خاص بات یہ دیکھی کہ مزار شریف کا حظیرہ بند رہتا ہے، شیشے لگے ہوئے ہیں، شیشے سے قبر شریف نظر آتی ہے، طواف مزار ممنوع ہے، اس مضمون کی ایک تختی لگادی گئی ہے، اور مزار کے مطاف کو بند کردیا گیا ہے۔

امام سید عبداللہ شاہ: آستانے کا انتظام محکمۂ اوقاف کے تحت ہے، آستانے کی مسجد کے امام مولانا سید عبداللہ شاہ بخاری ایک جوان باصلاحیت عالم دین ہیں، اور خوش عقیدہ سنی ہیں، اگرچہ آٹھ سال تک تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی ہے، لیکن فراغت دارالعلوم مظہر اسلام بریلی شریف سے ہے، مفتی اعظم ہند سے بیعت ہیں اور صاحب تصنیف ہیں۔

کشمیر کا المیہ یہ ہے کہ یہاں علمائے اہل سنت کی بہت کمی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مدارس کم ہیں، کچھ ہیں ضرور، مگر برائے نام، اس لیے یہاں کے لوگ مجبوراً دیوبند کے مدارس میں تعلیم پاتے رہے

ہیں، جس کی وجہ سے بعضوں کا عقیدہ خراب ہوگیا یا صلح کلی ہوگئے، بہت کم علماد یوبندی مدارس میں پڑھ کر وہابیت سے محفوظ ہیں، انھیں میں سے ایک یہ امام صاحب بھی ہیں، ادھر چند سالوں سے تحصیل علم کے لیے مشرقی یوپی کے مدارس کی طرف کشمیری طلبہ کا رجحان بڑھ رہا ہے۔

اصلاح وتبلیغ اور رشد وہدایت کے لیے غیر کشمیری مقررین اور پیران عظام نے کشمیر کی طرف کم دھیان دیا ہے۔

تقریبات عرس: ۷؍۸؍اپریل کو دن میں درہال میں مستان شاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کی تقریبات میں درہال کے مختلف مدرسوں کی حافظ قرآن بچیوں کا مظاہرۂ قراءت کا پروگرام ہوا، جس میں درجن بھر کے قریب بچیوں نے قراءت قرآن کا بہترین مظاہرہ کر کے انعامات پائے، یہ پروگرام پردے کے اہتمام کے ساتھ ہوا، اور دل چسپی کے ساتھ سنا گیا، پھر مختصر تقریری مجلس ہوئی، جس میں مولانا انوار احمد بغدادی نے تقریر کی، سنجیدہ اور پڑھے لکھے سامعین کو حضرت مولانا کی فکر انگریز سلجھی ہوئی تقریر نے بہت متاثر کیا، رات کی خصوصی مجلس میں کچھ خاص اہل علم ودانش حضرات نے دینی، علمی، تعلیمی اور ملی موضوعات پر سوالات پوچھے، جن کا تشفی بخش جواب مولانا نے دیا، یہیں جناب ماسٹر عبد القیوم صاحب سے ملاقات ہوئی، جو درہال میں ایک ہائر سکنڈری اسکول، درس نظامی کا ایک مدرسہ راحت العلوم اور حفظ قرآن کے لیے بچیوں کا ایک دار البنات چلاتے ہیں، بچیوں کی حافظ قرآن بنانے کی طرف ان کی خصوصی توجہ اور دل چسپی ہے، ان کی بچی بھی حافظ ہے اور دار البنات میں حفظ کی تعلیم دیتی ہے۔

جامع مسجد درہال: ۹؍اپریل بروز دوشنبہ ہم لوگ وادی درہال کے مشہور عالم دین حضرت مولانا حافظ سعید نقشبندی خطیب وامام جامع مسجد درہال وبانی ومہتمم مدرسہ رضاء المصطفیٰ درہال سے ملاقات کے لیے جامع مسجد گئے، حضرت موصوف بڑی محبت سے ملے اور قدر دانی فرمائی، ستر ہزار کی مسلم آبادی والی وادی درہال میں اشاعت اسلام وسنیت کی تبلیغ واشاعت اور دینی وعصری تعلیم کو رواج دینے اور تعلیمی وعصری اداروں کے قیام اور مسلمانوں کی حاجت روائی میں آپ کی طویل مخلصانہ خدمات کا شاندار ریکارڈ ہے جس کی وجہ سے پوری وادی کے لوگ آپ کا بے حد احترام کرتے ہیں، موقع بہ موقع سیاسی وسماجی مسائل میں بھی آپ مسلمانوں کی رہنمائی کرتے ہیں، وادی میں آپ کو کئی لحاظ سے مرکزی مقام حاصل

ہے،آپ ۱۹۷۳ء سے تا حال وادی میں مصروف عمل ہیں،اس وادی کے لیے آپ نے تاحیات اپنی خدمات کو وقف کردیا ہے،اس لیے بڑی سے بڑی مادی منفعت کے آفر کے باوجود کبھی بھی درہال چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔

آپ ایک اچھے خوش الحان قاری بھی ہیں،وزیر اعلیٰ شیخ عبداللہ نے ایک کانفرنس میں آپ کی سحر انگیز قرأت ونعت خوانی سے متاثر ہو کر خطیر معاوضے اور بڑے اعزاز کے ساتھ درگاہ حضرت بل سری نگر کشمیر میں خطاب وامامت کی باصرار پیش کش کی تھی،مگر آپ نے قبول نہیں کیا،اور درہال ہی میں رہ کر خدمت دین اور خدمت خلق کرنے کو ترجیح دی،آپ نے درہال کی قدیم جامع مسجد کی توسیع کر کے شاندار نئی تعمیر کروائی ہے،ساتھ ہی حفظ وقراءت اور مکمل درس نظامی کی تعلیم کا ایک دینی، تعلیمی ادارہ بنام مدرسہ رضاء المصطفیٰ بھی چلاتے ہیں،جو جامع مسجد ہی سے ملحق ہے اور مسلمان بچوں کی عصری تعلیم کے لیے مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ قائم کیا تھا،جس کے تحت ایک معیاری عصری تعلیمی ادارہ چل رہا ہے۔

آپ کی تعلیم مدرسہ مظہر اسلام بریلی شریف میں ہوئی ہے،وہیں سے فراغت ہے،اعلیٰ حضرت اور مفتی اعظم ہند علیہما الرحمہ سے عشق کی حد تک عقیدت رکھتے ہیں،امروہہ کے مشہور نقشبندی بزرگ حضرت صوفی محبوب صاحب علیہ الرحمہ سے بیعت ہیں،آپ کے والد گرامی مفتی محمد حسن شہید رحمۃ اللہ علیہ بھی یہیں پر دینی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

بے رحمانہ شہادت: ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک کی معرکہ آرائی میں بڑے دردناک اور عجیب انداز سے آپ کی شہادت کا دل دوز واقعہ پیش آیا،حافظ صاحب نے بتایا کہ خدائی کے مدعی ایک ظالم آرمی افسر نے والد صاحب اور چند دوسرے افراد سے کہا کہ تم لوگ اپنی زبان سے میرے بارے میں کہو کہ "میں خدا ہوں" ورنہ انکار کا انجام بہت بھیانک ہوگا،ایک مومن وہ بھی عالم دین اور مفتی سے اس قسم کی توقع ممکن ہی نہیں تھی،لہذا تینوں نے یہ جملہ کہنے سے انکار کردیا۔

لہذا طیش میں آکر اس افسر نے فوراً انتقام کی ٹھان لی اور ان لوگوں سے کہا کہ تم لوگ اپنے ہاتھوں سے اپنی اجتماعی قبر کھودو،چارۂ کار نہ دیکھ کر ان تینوں نے وہیں اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھودی،جب قبر تیار ہوگئی تو اس بے رحم ظالم نے اسی جگہ اپنی بندوق کی گولیاں تابڑ توڑ وار کر کے ان کے

جسموں میں اتاردی اور وہی ان تینوں نے جام شہادت نوش کرلیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اور پھر اس ظالم نے اسی اجتماعی قبر میں ان تینوں شہدا کو دفن کر دیا، آج بھی ان شہدائے اسلام کی یہ قبریں موجود ہیں، اور زبان حال سے اس ظالم اور جھوٹے خدا کے ظلم و بربریت اور بے رحمی کی کہانی بیان کررہی ہیں۔

محمد ابرار ملک کے گھر: مغرب کے بعد حافظ صاحب سے رخصت ہو کر درہال قصبہ میں محترم محمد ابرار ملک صاحب کی پیشگی دعوت پر ان کے مکان پر پر تکلف عشائیہ سے لطف اندوز ہوئے، اور یہیں دیر رات تک دین، تعلیم، ادب اور تاریخ کے موضوع پر ایک یادگار خصوصی مجلس میں ابرار صاحب کے ساتھ ہم لوگ محو گفتگو رہے، آپ سے مل کر اور باتیں کر کے آپ کی پرت در پرت مذہبی، علمی، سماجی اور ادبی شخصیت کے حقیقی خدوخال سمجھ میں آئے، ورنہ عرس کی تقریب میں آپ بس ایک متحرک عالم سعادت مند نوجوان کی حیثیت ہی سے سمجھ میں آئے تھے۔

آپ ایک صالح نوجوان محقق، ادیب، افسانہ نگار، خوش فکر شاعر، سماجی کارکن اور تعلیمی خدمت گار ہیں، دین داری اور خوش عقیدگی اس پر مستزاد ہے، صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں اور گذشتہ سال حج وزیارت کی سعادت بھی حاصل کرلی ہے۔

آپ اس وقت گرونانک یونیورسٹی امرتسر سے پی، ایچ، ڈی کر رہے ہیں، جس کا موضوع ''اردو صحافت ۴۷ء سے پہلے'' ہے، جموں یونیورسٹی سے ایم، اے کیا ہے۔

۱۹۹۳ء میں مرکزی حکومت کی طرف سے ''قومی یکجہتی'' کے موضوع پر ''سدبھاؤنا ایوارڈ'' پا چکے ہیں، جب کہ ۱۹۹۶ء میں ''غالب کے کلام میں فکری عناصر'' کے موضوع پر ''غالب ایوارڈ'' بھی حاصل ہے۔

آپ کئی ایک دینی، سماجی، ادبی اور تعلیمی اداروں سے وابستہ ہیں، خود ''ایگل پبلک اسکول'' قائم کر کے چلا رہے ہیں، مفتی محمد حسن شہید علیہ الرحمہ کی یاد میں انھیں کے نام پر ''مفتی محمد حسن شہید لائبریری'' بھی قائم کی ہے، ''انجمن نوجوانان اسلام'' ''غوثیہ ٹرسٹ'' اور'' علامہ اقبال بزم ادب'' کے بانی بھی ہیں۔ آپ ایک حوصلہ مند مسلم نوجوان ہیں، مستقل قریب میں ''ایک اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

"قائم کرنے کا منصوبہ ہے، جس کے لیے جدوجہد جاری ہے، مولیٰ تعالیٰ ان کی خدمات قبول کرے، اور ان کے امثال پیدا فرمائے۔

سوکڑ شریف: ۹؍اپریل ہی کو دارالعلوم علیمیہ سے فارغ عالم دین مولانا سید رضا حسین شاہ بخاری کی دعوت پر ان کے گاؤں بھی جانا ہوا، ان کے آباواجداد بخاری سید ہیں، ان کے والد شیخ طریقت پیر شاہ حسین مدظلہ ولد پیر جہان صاحب رحمۃ اللہ علیہ تبلیغی دورے پر تھے، اس لیے ملاقات نہ ہوسکی، پانچ پشت پہلے سید ریاض حسین صاحب کے جد اعلیٰ میر پور خاص سے آکر سوکڑ شریف میں آباد ہوگئے تھے۔

ان کے چچا پیر سید حسین صاحب مدظلہ ولد پیر جہان شاہ ولد کرم علی شاہ رحمہم اللہ کے مکان پر بھی جانا ہوا، پیر صاحب موصوف علاج کے لیے جموں اسپتال میں تھے، اس لیے ان سے بھی نہیں مل سکے، پیر نثار حسین صاحب اہل ارادت کا اچھا خاصا حلقہ رکھتے ہیں اور کشمیر میں ایک بڑے پیر کی حیثیت سے بہت مشہور اور مقبول ہیں۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن: ۹؍۱۰؍اپریل کی درمیانی شب آصف ملک سلمہ کے گھر ہی گزری، ۱۰؍اپریل بروز منگل ۹؍بجے صبح موصوف کے بڑے بھائی جناب اشرف ملک صاحب نے درہال قصبہ میں واقع اپنے تعلیمی ادارہ "نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن" کا معائنہ کروایا، یہ ادارہ اشرف ملک صاحب نے ابرار ملک صاحب کے ساتھ ۱۹۹۳ء میں قائم فرمایا ہے، اور بڑے حسن انتظام، سلیقہ مندی اور بہترین تعلیمی نظام ونصاب میں ضروری عصری علوم والسنہ کے ساتھ اردو، عربی اور دینیات کے مضامین بھی لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل ہیں، علیمیہ کے ایک فاضل مولانا محمد یوسف علیمی ایس نگری کئی سال سے اس ادارے میں یہ مضامین پڑھا رہے ہیں۔

شاہدرہ یونیورسٹی: ۱۰؍اپریل کو درہال کے پڑاؤ سے رخصت ہو کر ہم راجوری آگئے اور ۲؍بجے دن راجوری سے بذریعۂ کار شاہدرہ ضلع راجوری میں بابا غلام شاہ بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے نئی نئی قائم شدہ {B.G.S.B} یونیورسٹی دیکھنے پہنچے۔

راجوری سے یونیورسٹی کا فاصلہ تقریباً دس بارہ کیلو میٹر ہے، اس سفر کے لیے کار کا انتظام جناب منیر ملک صاحب درہالوی ریٹائرڈ پلاننگ افسر حال مقیم مدینہ کالونی شہر راجوری وصدر انتظامیہ کمیٹی مدینہ

مسجد راجوری وصدر کمیٹی مسجد نور شریف مصطفیٰ نگر راجوری اور راجوری کے خطیب ومبلغ سنیت حضرت مولانا نثار حسین نقشبندی ساکن راجوری نے اپنی جدوجہد سے کیا، اور اپنے خصوصی تعلق واثر سے ڈسٹرکٹ اسپتال راجوری کے ایک سرجن ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے مصروفیت کے باوجود گاڑی کے ساتھ انھیں بلوایا، ڈاکٹر صاحب کا نام یاد نہیں رہ گیا، یہ تینوں حضرات خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔

مولانا نثار حسین صاحب نوجوان اور متحرک عالم دین ہیں اور ملت وجماعت کی خدمت کے تئیں مخلص نظر آئے، مولانا کی تعلیم گجرات کے ایک غیر سنی دینی وتعلیمی ادارہ دار الفلاح میں ہوئی ہے، کشمیر کی مشہور روحانی وسیاسی شخصیت پیر طریقت میاں بشیر احمد شاہ صاحب قادری سے بیعت ہیں، پیر صاحب، ایم، ایل، اے بھی رہ چکے ہیں، اور مذہب کے ساتھ آپ کے سیاسی وسماجی اثرات وخدمات بھی قابل قدر ہیں۔ اس یونیورسٹی کے قیام کی زمین ہموار کرنے میں ان حضرات کا بھی کچھ حصہ ہے، ایسے ہی کچھ مخلص قائدین اور علما ودانشور حضرات کی تحریک اور توجہ دلانے سے مفتی محمد سعید سابق وزیر اعلیٰ جموں وکشمیر نے یہ یونیورسٹی قائم کی ہے۔

۱۹۹۶ء میں پروجکٹ تیار ہوا، اور ۲۰۰۱ء سے تعمیری کام شروع ہوا، جو برابر جاری ہے، ۲۰۰۵ء سے تعلیمی سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے، بنیادی طور سے یہ ایک ٹیکنیکل یونیورسٹی ہے، ساتھ ہی اسلامک اسٹڈیز اور عربک لنگویج کا شعبہ بھی کام کر رہا ہے۔

یونیورسٹی کے وائس چانسلر چودھری محمد مسعود صاحب ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل آف پولیس ہیں، بروقت موجود نہ ہونے کے سبب نہیں مل سکے، تو ہمارے تینوں کرم فرما گائڈ حضرات نے شعبۂ عربی کے چیمبر میں جناب ڈاکٹر عبید الرحمٰن صاحب لیکچرر شعبۂ عربی سے ملوایا، ڈاکٹر صاحب ہمارے یوپی ہی کے ہیں، ان سے مل کر اس یونیورسٹی اور دار العلوم علیمیہ کے تعارفی تبادلے کے بعد بڑی اپنائیت کا احساس ہوا، اور دار العلوم علیمیہ کی سندات کے معادلے اور الحاق کی ایک حوصلہ افزا ابتدائی گفتگو بھی ہوئی، انشاء اللہ قانونی کارروائی جلد ہی شروع کی جائے گی، اس مقصد میں کامیابی مل جانے پر علیمیہ سے عالمیت اور فضیلت کرنے والے خاص طور سے کشمیری طلبہ کے لیے اعلیٰ تعلیم کا حصول اور گریجویشن کا راستہ ہموار ہو جائے گا، اور ان کے لیے اپنے وطن میں ترقی کی راہیں کھل جائیں گی۔

سری نگر کی طرف: شام ہی کو یونیورسٹی سے واپس راجوری آ کر جموں کے لیے روانہ ہو گئے، اور ۱۰/۱۱ اپریل کی درمیانی شب جموں کے تہبان ہوٹل میں گزاری، اور ۱۱ اپریل بروز بدھ ۷ بجے صبح سپر ڈیلکس بس کے ذریعے جموں سے سری نگر کے لیے چلے، اور پر پیچ پہاڑی شاہراہوں سے گزرتے ہوئے اور زعفران کی کھیتیوں اور خوشنما سبزہ زاروں اور دیگر قدرتی مناظر سے محظوظ ہوتے ہوئے شام دیر گئے کوئی ساڑھے آٹھ بجے کشمیر کے جگر شہر سری نگر کی سرحدوں میں داخل ہو گئے، اس سفر میں ۱۲ گھنٹوں سے زیادہ کا وقت لگا، راستے میں کشمیر کا مشہور شہر اننت ناگ اور بانیہال بھی پڑا، لیکن یہاں پر رکنا نہیں ہوا، یہ دونوں تاریخی شہر ہیں۔

ڈل جھیل میں: جب ہم سری نگر میں داخل ہوئے تو جشن ولادت رسول کے ایک استقبالیہ بینر نے ہمارا استقبال کیا، جس پر یہ شعر درج تھا

هر که عشق مصطفیٰ سامان اوست
بحر و بر در گوشۂ دامان اوست

یہ شعر سری نگر کے سنی مسلمانوں کی خوش عقیدگی اور بے پناہ عشق رسول کی ترجمانی کر رہا تھا۔

۱۱ اپریل بدھ سے ۱۴ اپریل سنیچر کی صبح تک سری نگر کی ڈل جھیل میں جناب عبدالمجید بٹ صاحب کا دولت کدہ ہمارا مستقر رہا، بٹ صاحب ایک مہمان نواز اور صوم وصلوٰۃ کے پابند انسان ہیں اور اسی جھیل میں تجارت کرتے ہیں، اور دین داری اور خوش حالی کی زندگی گزار رہے ہیں، انھوں نے اور ان کے پورے گھرانے نے انتہائی خوش دلی کے ساتھ میزبانی کا بھرپور حق ادا کیا، اپنے مکان کے بغل میں ایک مسجد بنا رکھی ہے، پورا گھرانہ نمازی ہے، تن تنہا مسجد کے امام صاحب کی ضیافت اور تنخواہ کا بار اٹھائے ہوئے ہیں، حافظ آصف ملک سلمہ اسی مسجد میں ایک سال تراویح سنا چکے ہیں، اور اپنے حسن اخلاق سے بٹ صاحب کے گھر کے ایک فرد بن گئے ہیں۔

بٹ صاحب سال بھر میں ایک مرتبہ میلاد شریف کا شاندار پروگرام کرتے ہیں، جس کے انعقاد پر خود ہی تقریباً بیس ہزار روپے خرچ کرتے ہیں، ان کے چھوٹے صاحبزادے شبیر احمد سلمہ زیارات میں ہمارے ساتھ سائے کی طرح لگے رہے، یہ بٹ صاحب کے نوجوان پیر حضرت مولانا غلام

رسول صاحب حامی کے مدرسہ جامعہ قادریہ سری نگر میں دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

چھ صدی پرانے مدرسہ میں: ۱۲؍اپریل بروز جمعرات شبیر احمد بوٹ کے ذریعے ڈل جھیل کی سیر کرائی، اور جھیل میں بنا ہوا خوبصورت نہرو پارک دکھایا، ۱۱ بجے دن سری نگر میں محلہ مخدوم صاحب میں واقع ۶؍صدی قدیم دینی تعلیمی ادارہ دارالعلوم دارالشفا دیکھنے اور مشہور کشمیری بزرگ محبوب العالم سلطان العارفین سیدنا شیخ حمزہ کشمیری علیہ الرحمہ معروف بہ مخدوم صاحب [ولادت ۹۰۰ھ/وصال ۹۸۴ھ] کے آستانہ پر حاضری اور فاتحہ خوانی کے لیے گئے۔

مخدوم شیخ حمزہ کا مدرسہ اور مزار: مخدوم صاحب کا مزار مرجع خلائق ہے، اور زائرین کا بڑا ہجوم رہتا ہے، یہ سری نگر کے کوہ ماران پر واقع ہے، مخدوم صاحب کا اصل وطن موضع ''تجر'' تھا، بچپن میں وہاں سے سری نگر چلے آئے، اور صغر سنی ہی میں راہ سلوک کی طرف راغب ہو گئے، تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ''بچپن ہی میں حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقاتیں کیں اور کسب فیض کیا اور روحانیت کے اعلیٰ مدارج طے کیے'' خلائق کا بڑا مجمع رہتا ہے۔

آپ کی تعلیم کوہ ماران کے دامن میں واقع اسی دارالعلوم دارالشفا میں ہوئی ہے، کئی سو سال پہلے حضرت بابا اسماعیل کبروی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تعلیمی ادارہ قائم فرمایا تھا، جہاں ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ باطنی علوم پڑھانے کا بھی انتظام تھا، اس میں شب خیزی، تہجد، اوراد و اذکار، توجہ الی اللہ، کے رموز و اسرار عملی طور سے سکھائے جاتے تھے، باہر کے ممالک کے بھی طلبہ یہاں پڑھنے آتے تھے، اسی دارالعلوم دارالشفا میں مخدوم صاحب نے تقریباً ۹۱۳ھ میں داخلہ لے کر ظاہری و باطنی تعلیم مکمل کی اور بعد میں اسی کے مدرس، صدر مدرس اور مہتمم و سربراہ رہے۔

یہ ادارہ آپ کے وصال کے بعد کچھ وقت تک چلا، پھر کافی عرصہ تک بند رہا، ۳۰؍صفر ۱۴۲۳ھ مطابق ۱۷؍اپریل ۲۰۰۲ء کو تقریباً تین سو سال کے بعد دعوت اسلامی کشمیر کے نگراں اور حضرت سید میرک شاہ کاشانی علیہ الرحمہ کے آستانے کی مسجد کے خطیب مخلص عالم دین اور دعوت اسلامی کشمیر کے امیر حضرت مولانا غلام محی الدین صاحب نقیب نے سری نگر کے اپنے کچھ ساتھیوں اور درگاہ کے خدام کے اشتراک و تعاون سے اس کی نشاۃ ثانیہ کی ہے۔

اس وقت درجۂ ثالثہ تک تعلیم ہے، اور شہر کی مرکزی دینی تعلیمی اور تبلیغی ادارہ ہے، یہاں سے اہل سنت کی تبلیغی واصلاحی اور تعلیمی سرگرمیاں جاری ہیں۔

اس کے مہتمم جناب عبدالمجید صاحب مخدومی ہیں، یہیں پر ان سے اور جناب خورشید جان قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی، یہ پلاننگ محکمے کے ریٹائرڈ ملازم ہیں، اور کشمیر میں جماعتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، فی الحال دارالشفا کے شعبۂ اہتمام سے جڑے ہوئے ہیں، حضرت مولانا سجاد احمد قادری صدر مدرس ہیں، اسی ادارے میں ہمارے قریبی ضلع مہراج گنج کے ایک نوجوان مصباحی فاضل مولانا محبوب عالم صاحب سے ملاقات ہوئی، جو یہیں تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

شیخ صرفی کے مزار پر: یہاں سے فارغ ہو کر ہم محلہ زینہ کدل میں حضرت شیخ یعقوب صرفی حنفی رحمۃ اللہ علیہ [متوفی ۱۰۰۳ھ] کے آستانہ پر حاضر ہوئے، اور فاتحہ پڑھی، آپ سری نگر میں عام طور سے "حضرت ایشاں" کے نام سے مشہور ہیں۔ بڑا خاموش آستانہ ہے، مگر عظمت وجلال اور روحانیت نمایاں ہے، آپ کی عظمت سمجھنے کے لیے اتنا کافی ہے کہ آپ مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ ہیں، اور صرفی کی نسبت بتا رہی ہے کہ آپ کو شاید علم صرف سے خصوصی شغف رہا ہو، آستانے پر کندہ آپ کا درج ذیل شعر آپ کے عقیدۂ "ندائے یارسول اللہ ﷺ" کی گواہی دے رہا ہے، اور یہ بھی بتا رہا ہے کہ آپ شاعر بھی تھے۔

باز کشمیر کن زراہ کرم | رشک گلزار یارسول اللہ ﷺ

خانقاہ ہمدانیہ میں: اس کے بعد ہم ۴ر بجے دن خانقاہ معلی حاضر ہوئے یہ امیر کبیر شاہ ہمدان حضرت میر سید علی ہمدانی ختلانی کشمیری رحمۃ اللہ علیہ [متوفی ۷۸۶ھ] کی خانقاہ اور چلہ گاہ ہے، آپ ہمدان میں پیدا ہوئے، جو ایران کا ایک شہر ہے، اور ترکستان کے شہر ختلان میں مدفون ہیں، کشمیر آپ کا میدان تبلیغ رہا ہے، آپ تین مرتبہ کشمیر آئے اور تبلیغ واصلاح کا اہم کردار ادا کیا، آپ کے آنے سے تبلیغی نظام مستحکم ہوا، بلکہ آپ نے کشمیر میں تبلیغ کو منظم شکل دی، اور چپے چپے میں تبلیغی نظام کو پھیلایا، کشمیریوں کے عقائد واعمال کی اصلاح میں آپ کا رول بہت نمایاں ہے اور کئی ہزار کشمیری غیر مسلم آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، آپ نے جہاں ایک کو رصفہ تعمیر کروایا تھا، جہاں عبادت وریاضت اور چلہ کشی کرتے تھے، اور یہی آپ کی تبلیغ کا

مرکز تھا، سلطان کشمیر اپنے درباریوں کے ہمراہ اس جگہ آپ کی خدمت میں نیاز مندانہ حاضری دیا کرتا تھا، اور نصیحتیں سنتا تھا۔

یہ چلہ گاہ ایک خوبصورت اور وسیع دو منزلہ مسجد کے مغربی شمالی گوشے میں نمایاں کر دی گئی ہے ہلوگ زیارت کرتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں، ہم بھی اس سعادت سے شرفیاب ہوئے، یہاں ایک لائبریری بھی قائم ہے یہ خانقاہ سلطان سکندر شاہ میری نے بنوائی تھی۔

شیخ علی والی کے مزار پر: پھر خانقاہ معلی سے متصل حضرت بابا شیخ علی والی ترکستان شہید رحمۃ اللہ علیہ [متوفی ۱۰۰۱ھ] کے مزار پر حاضری دی اور فاتحہ پڑھی، آپ ۹۹۹ھ میں بغرض غزوہ و جہاد کشمیر تشریف لائے اور یہیں خانقاہ معلی میں سکونت اختیار کر لی، حد درجہ استغراق رکھتے تھے، حتی کہ نماز کے وقت بھی تحریک کی ضرورت پیش آتی تھی، بلکہ نماز میں بھی اتنی محویت طاری ہو جاتی کہ ایک رکن سے دوسرے رکن کی جانب انتقال کے لیے بھی دوسرے شخص کی تحریک سے ہی خبردار ہوتے تھے، اکبر بادشاہ کے دور میں دین کے دشمنوں نے شہید کر دیا تھا، آپ کی مجلس ارشاد میں اکثر اکابر شریک ہو کر استفادہ و استفاضہ کرتے تھے، حضرت خواجہ محمد باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آپ سے دو سال تک کسب فیض کیا تھا۔

آپ کا بڑا مشہور واقعہ ہے کہ ایک بادشاہ نے امتحان کے لیے ایک زندہ شخص کو مردہ قرار دے کر تابوت میں رکھوا دیا اور آپ کو نماز جنازہ پڑھانے کی تکلیف دی، حضرت شیخ نے حکم کے باوجود تاکید کے ساتھ بار بار نماز جنازہ پڑھانے کی اجازت مانگی، اور پھر چار تکبیریں پڑھ دیں تو حقیقۃً زندہ آدمی مر گیا، اور اسے تابوت سے مردہ شکل میں نکالا گیا، اللہ تعالی اپنے اولیا کی ایسی بے ادبی سے بچائے، بزرگوں کی ولایت و بزرگی آزمانے کی جرأت و کوشش باعث ہلاکت ہوتی ہے۔

جامع مسجد سری نگر: عصر کے وقت یہاں سے ہو کر ہم سری نگر کی جامع مسجد دیکھنے گئے اور وہیں حوض میں وضو کر کے نماز عصر ادا کی، یہ کشمیر کی سب سے بڑی اور عالیشان مسجد ہے، اسے شاہ بت شکن سلطان سکندر شاہ کشمیری شاہ میری نے ۱۳۹۴ھ میں تعمیر کروایا تھا، یہ عظیم مسجد مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی یاد دلاتی ہے۔

چرار شریف میں: ۱۳ر اپریل بروز جمعہ صبح ۹ ر بجے ہم لوگ ڈل جھیل سے بڈگام اور چاڈورہ ہوتے ہوئے بذریعہ منی بس کشمیر کی مشہور زمانہ درگاہ "چرار شریف" کے لیے روانہ ہوئے، یہاں شیخ العالم حضرت شیخ

نورالدین ولی نورانی رحمۃ اللہ علیہ کا آستانہ ہے، آپ ۷۷۹ھ میں پیدا ہوئے، اور ۸۴۲ھ میں وفات پائی۔

آپ کشمیری الاصل ہیں اور ہندوؤں کے سورج بنسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، آپ کے والد سالاردین، حضرت یاسمن یا حضرت سید حسین سمنانی خلیفہ میر کبیر علی ہمدانی علیہ الرحمہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، حضرت شیخ نورانی رشیوں کے سردار تھے، نفس کشی اور دنیا سے بے رغبتی میں یگانہ تھے، بچپن سے زہد کی طرف مائل تھے، ۱۲ سال تک کشمیر کے پہاڑوں، جنگلوں، اور غاروں میں مجاہدہ فرمایا، اور کاسنی کے علاوہ کوئی اور غذا استعمال نہ فرمائی، ۲۶ سال بے خورو خواب گزار دیے، سلطان زین العابدین شاہ کشمیر بھی جنازے میں شریک ہوا، آپ نے رشد و ہدایت کے لیے کشمیر میں سیکڑوں خلفا چھوڑے۔

آپ کی درگاہ کشمیر کی مشہور بافیض عالیشان درگاہوں میں سے ایک ہے، اور اس کا انتظام بھی محکمۂ اوقاف کے تحت ہے، ملیٹینسی کے دوران ملیٹینوں کے اندر گھس آنے کے سبب آپ کا مزار دو مرتبہ انہدام کا شکار ہو چکا ہے، ایک مرتبہ جماعت اسلامی کے مشہور جنگ جو مست گل کے در آنے کی وجہ سے درگاہ میں آگ لگادی گئی مگر مست گل بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا، اور سیکورٹی فورسیز کے ہاتھ نہیں لگ سکا۔

آپ کے آستانے کی خاک شفا کا درجہ رکھتی ہے، اہل عقیدت اسے بڑی عقیدت سے جسم پر ملتے ہیں، اور سرمۂ عقیدت کے طور پر استعمال کرتے ہیں، آپ کے مزار پر کندہ یہ شعر ہم نے نقل کر لیا تھا:

خاک درگاہ اوبعین یقیں　　　سرمۂ چشم اہل عرفان است

مولانا غلام رسول حامی سے ملاقات: چرار شریف سے واپس ہو کر نماز جمعہ ادا کرنے اور پیر طریقت مولانا غلام رسول حامی مدظلہ العالی سے ملنے کے لیے ہم سری نگر شہر کی ''مسجد غوثیہ'' آگئے، موصوف اسی مسجد میں خطاب جمعہ ارشاد فرماتے ہیں، آپ کا بیان کشمیری لوگ کشمیری زبان میں بڑے ذوق وشوق سے سنتے ہیں، آپ کی دینی و تبلیغی اور روحانی خدمات جان کر محسوس ہوا کہ کشمیر میں بہت اچھا حلقۂ اثر رکھتے ہیں، سوجھ بوجھ کے نوجوان متحرک سنی عالم ہیں، اور نوجوانی میں روحانیت کا رنگ غالب ہے، جمعہ

کے بعد اپنے مریدوں کے ساتھ اپنی قیام گاہ پر خصوصی مجلس ذکر منعقد کراتے ہیں، جس میں خاص لوگ بڑی عقیدت سے شریک ہوتے ہیں، اچھے خطیب، اور روحانی مرشد ہیں، اور ۲۴ رگھنٹے میں بیشتر اوقات مصروف رشد وہدایت رہتے ہیں، ایک تعلیمی ادارہ جامعہ قادریہ بھی چلاتے ہیں، جس کی کئی شاخیں بھی ہیں، غوث الاعظم کے نام سے ایک اردو ماہنامہ بھی شائع کرتے ہیں۔

دعوت اسلامی اور کاروان اسلامی: اسلام اور سنیت کی تبلیغ میں کھلی اور بے لاگ پالیسی رکھتے ہیں، علامہ ازہری میاں قبلہ مدظلہ العالی بریلی شریف سے بہت قریب لگتے ہیں، پہلے "دعوت اسلامی" سے وابستہ تھے، بلکہ اس کے بانیوں میں ہیں، لیکن کچھ دنوں سے دعوت اسلامی سے ذرا مختلف طریقۂ عمل اختیار کر کے "کاروان اسلامی" نام کی ایک الگ تنظیم کے پلیٹ فارم سے بہت مفید اور موثر کام کر رہے ہیں، اور کافی مقبول ہیں، مگر دعوت اسلامی کے امیر اور مبلغین سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں رکھتے اور اس کے مبلغین کے ساتھ دعوت اسلامی کے پروگرام میں ابھی بھی عملاً برابر شریک ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ کاروان اسلامی کے منشور میں انھوں نے صاف صاف یہ جملہ لکھ دیا ہے "سنتوں بھری غیر سیاسی تحریک دعوت اسلامی کا فروغ"۔ سری نگر کے شمالی مار علاقے میں جامع مسجد قادریہ پازو والپورہ میں ہر مہینے کے پہلے سنیچر کو نماز عصر سے اتوار کو نماز اشراق تک دعوت اسلامی کا اجتماع ہوتا ہے، جس کی قیادت و امارت مولانا غلام محی الدین نقیب صاحب فرماتے ہیں، افسوس کہ ان سے ملاقات نہ ہو پائی۔

سری نگر شہر کے مختلف علاقوں سمیت دوسرے کئی شہروں اور قصبوں میں بھی حامی صاحب کی تنظیم "کاروان اسلامی" کی ذیلی شاخیں اور تعلیمی ادارے اچھا کام کر رہے ہیں، دعوت اسلامی بھی اپنے انداز سے دین وسنیت کا بہتر اور قدرے حوصلہ افزا کام کر رہی ہے، کاروان اسلامی کے کام کی رفتار بڑھانے کی ضرورت ہے، تیزی کے ساتھ عام کشمیری مسلمان دونوں تنظیموں سے جڑ رہے ہیں اور وہابیت کے چنگل سے باہر آ رہے ہیں، تسلسل اور اخلاص کے ساتھ یوں ہی اصلاح اعتقاد وعمل کا کام جاری رہا تو بہت جلد کسی قدر تلافی مافات کی امید کی جا سکتی ہے۔ ہماری حریف اعتقادی جماعتیں منظم انداز سے بہت پہلے سے کام کر رہی ہیں، لہذا عام کشمیری مسلمانوں کی امامت وقیادت زیادہ تر ابھی انھیں کے ہاتھ میں ہے، زیادہ سے زیادہ اور جگہ جگہ اچھے مدارس کا قیام اور ان میں معیاری تعلیمی نظام وقت کی سخت

ضرورت ہے، اسی سے صورت حال پر کچھ قابو پایا جاسکتا ہے۔

عام کشمیری مسلمان اعتقاد و مراسم کے لحاظ سے ابھی بھی سنیت پر قائم ہیں، لیکن ان کا قبلہ دار العلوم دیوبند، ندوۃ، جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت جیسے ادارے اور تنظیمیں اور غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے بعض عوام بلکہ خواص بھی بریلی سے انفرادی ملاقاتوں اور خصوصی مجلسوں میں حقیقت کی تفہیم ہو سکتی ہے، اور لٹریچر کے ذریعہ بھی غلط فہمیاں دور کی جاسکتی ہیں، معیاری مدارس کا قیام و استحکام اس سلسلے میں سب سے اہم کردار ادا کرسکتا ہے، پورے کشمیر میں یوپی کی طرح ایک بھی بڑا تعلیمی ادارہ نہیں ہے، اولین فرصت میں اس کی طرف توجہ دی جانی چاہیے، یوپی کے بڑے مدارس کے پروردہ کچھ کشمیری علما بچوں اور بچیوں کے اچھے ادارے قائم کرنے کی پہل کر چکے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں کامیابی عطا فرمائے۔

کشمیر یونیورسٹی میں: ۵؍ بجے شام ہم کشمیر یونیورسٹی دیکھنے گئے، مگر لائبریری کے سوا تمام شعبے بند ہو رہے تھے، یا ہو چکے تھے، ریسرچ اسکالروں کے لیے مزید دو گھنٹے تک اضافی ٹائم کی سہولت کی بدولت یونیورسٹی کی "مرکزی علامہ اقبال لائبریری" کھلی ہوئی تھی، لائبریری کے ایک اہل کار نے مہربانی کر کے خندہ پیشانی کے ساتھ لائبریری کی زیارت کرائی، ہم نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا، شعبہ جاتی لائبریریوں سمیت یہاں پانچ لاکھ کتابیں ہیں، شیشے کے باہر ہی سے میوزیم کی ایک جھلک بھی دیکھی، پھر یونیورسٹی کے باہر سبزہ زاروں کے بیچ کے راستے سے کیمپس سے باہر آگئے۔

درگاہ حضرت بل میں: پھر یونیورسٹی سے قریب ہی ڈل جھیل کے ایک کنارے درگاہ حضرت بل کی مسجد اور زیارت گاہ پہنچے، اور مسجد میں نماز عصر و مغرب پڑھی، اور موئے مبارک کے بالائی حجرہ کے نیچے مسجد ہی کے ایک حصے میں کھڑے ہو کر درود و سلام کے نذرانے پیش کیے، "بل" اردو لفظ "بال" کا مخفف ہے، جس کو فارسی میں "مو" کہتے ہیں، اس درگاہ میں موئے مبارک سید عبداللہ مدنی کے ذریعہ ۱۱۱۱ھ میں لایا گیا تھا۔

باہر کے لوگ عام طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی مقبرہ ہے، جب کہ ایسا نہیں ہے، بس یہاں حضور اقدس ﷺ کے موئے مبارک رکھے ہوئے ہیں، جن کی سال میں چھ مرتبہ اور خاص طور سے ربیع الاول شریف کے موقع پر عام زیارت کرائی جاتی ہے، جس کے لیے دور دور سے کشمیریوں کی بھیڑ امنڈ

آتی ہے، اور یہ لوگ انتہائی عقیدت واحترام اور عشق ومحبت کے ساتھ باادب زیارت کرتے ہیں اور فیوض وبرکات سے مالا مال ہوتے ہیں، عام دنوں میں بھی کشمیریوں اور باہری عقیدت مندوں کا میلا لگا رہتا ہے، ہم زیارت تو نہ کر سکے، مگر چوکھٹ پر حاضری کا شرف ضرور مل گیا، مولیٰ تعالیٰ جنت ارضی میں موئے مبارک کے عشق واحترام اور درود وسلام کے صدقے میں ہماری حاضری بھی قبول فرما کر ہمیں حسنات وبرکات سے بہرہ ور فرمائے، آمین ثم آمین! صلی اللہ علیک یارسول اللہ! وسلم علیک یا حبیب اللہ!

زیارت کے بعد پھر ہم نے اپنے مستقر ڈل جھیل میں محترم عبدالمجید بٹ صاحب کے مکان پر رات کا کھانا کھایا، میزبان سے باتیں ہوئی اور رات گزار کر ۱۴ راپریل سنیچر کی صبح جنت ارضی کی مختصر اور تشنہ زیارت کے بعد دل میں بار بار آنے کی آرزو اور لافانی یادیں سمیٹے "شیکارہ" پر سوار ہو کر جھیل سے باہر آگئے، اور پھر سری نگر اور کشمیر کو خدا حافظ کہا۔

[پیام حرم مئی ۲۰۰۷ء]

چودھویں صدی ہجری کا

ایک صوفی ..... ایک مجاہد

انسان کے دل میں خود شناسی پیدا ہو جائے تو اس کی مدد سے خدا شناسی بھی پیدا ہو جاتی ہے "من عرف نفسہ عرف ربہ" یعنی عرفان ذات، اللہ تعالیٰ کی معرفت کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ اس طرح کہ بندہ جب اپنے مقصدِ وجود، نیز دنیا اور اپنی زندگی کی حیثیت وحقیقت، ان کی ناپائیداری اور زوال وفنا کے بارے میں سنجیدگی اور ٹھنڈے دل ودماغ سے سوچتا ہے، تو اس کے اندر بندگی کا احساس بیدار ہو جاتا ہے، اور وہ بلا تاخیر اپنی زندگی کو بندگی کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیتا ہے۔

جوں جوں بندہ طاعت وبندگی اور اتباعِ سنت وشریعت میں ترقی کرتا جاتا ہے، اس میں بندگی کا احساس پختہ ہوتا جاتا ہے، اور دین ودنیا کا کوئی بھی کام کرتے ہوئے وہ سنت وشریعت کو سامنے رکھتا ہے، اور اللہ ورسول کی مرضی کے مطابق ہی کرتا ہے، اور دھیرے دھیرے فرائض وواجبات اور عبادات کے ساتھ ساتھ نوافل ومستحبات اور اپنے معاملات وعادات میں بھی اتباعِ سنت وشریعت کا عادی ہوتا جاتا ہے۔ اور اس طرح بندے کی زندگی مکمل بندگی اور استقامت فی الدین کا نمونہ بن جاتی ہے، اور ایسے بندے کو خدا کی معرفت اور قرب ووصال کی عظیم دولت اور بے بہا نعمت حاصل ہو جاتی ہے، اور ایسا بندہ محبوبیت کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے، اور ایسی ہی زندگی گزارنا اللہ تعالیٰ کو مطلوب ومحبوب ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "فاستقم کما امرت" [ھود ۱۱:۱۱۲] صراطِ مستقیم پر چلو جیسا کہ تمہیں حکم ہے۔

اور قرآن کے فرمان کے مطابق یہی وہ لوگ ہیں، جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ نہ ان کو کوئی خوف ہے اور نہ یہ غمزدہ ہوں گے۔ استطاعت بھر شریعت کی کماحقہ کامل پابندی کو استقامت کہتے ہیں، اور صوفیا کی اصطلاح میں اسی کا دوسرا نام طریقت ہے، اور اسی کو احسان وسلوک اور تصوف بھی کہا جاتا ہے۔

اور اس انداز سے زندگی گزارنے والے مومن کو صوفی کہا جاتا ہے، جو اپنے ظاہر وباطن اور جسم وقلب کو معصیت کی آلائش سے پاک وصاف رکھتا ہے، اور قابلِ تعریف ظاہری وباطنی اوصاف واعمال

سے اپنے روح وبدن کو آراستہ کرلیتا ہے۔

ایسی اچھی زندگی خدا کی توفیق ہی سے ملتی ہے اور یہ خاصان خدا ہی کا حصہ ہے، یہ سب کو نصیب نہیں ہوتی، لیکن اس طرح سے زندگی گزارنے کی حتی الامکان کوشش کرنا سب کے لیے ضروری ہے، اور اصلاً اسی کوشش کا نام جہاد ہے، اور کوشش کرنے والا مجاہد۔ اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ ہر صوفی مجاہد ہوتا ہے، جو کامل بندگی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے اپنے نفس اور شیطان اور اہل دنیا سے خاموش جنگ لڑتا رہتا ہے اور ایسے ہی ایک مجاہد تھے ہمارے آقائے نعمت، مجاہد ملت، سلطان التارکین، عارف باللہ، علامہ شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری علیہ الرحمہ جو ۱۳۲۲ھ میں دھام نگر ضلع بھدرک اڑیسہ میں ایک رئیس وخوش حال اور شریف ودین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔

قسّام ازل نے چوں کہ مجاہد ملت کو ریاست میں فقیری ودرویشی کے لیے پیدا کیا تھا اور آپ سے دین وملت کا بہت عظیم کام لیا جانا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے والد ملا عبد المنان رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ اپنے اس بچے کو عالم دین اور اپنے لیے ذریعۂ آخرت بنائیں گے، چنانچہ جب مجاہد ملت سن شعور کو پہونچے تو آپ کے والد نے فرمایا کہ "میں اپنے بھتیجوں کو انگریزی پڑھاؤں گا، اسٹیٹ کی دیکھ بھال کے لیے اور اس [مجاہد ملت] کو عربی پڑھاؤں گا، اپنی آخرت کے لیے۔" (مجاہد ملت نمبر اشرفیہ ص ۴۳)

۹ رسال کی عمر میں والد صاحب چل بسے، لوگوں نے شروع میں انگریزی تعلیم کے لیے کٹک اسکول میں داخل کروادیا، مگر آپ کی دین پسند طبیعت اس تعلیم سے مطمئن نہیں تھی، آپ کا طبعی میلان دینی علوم کی تحصیل کی طرف تھا، لہذا آپ کے لیے گھر ہی پر دینی تعلیم کا انتظام کردیا گیا۔

آپ کی خصوصی تعلیم کے لیے مولانا شاہ مفتی ظہور حسام صاحب حسامی مانک پوری علیہ الرحمہ بلائے گئے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو متاع دل کے ساتھ ساتھ سوز دروں سے بھی نوازا تھا، بچپن سے طبیعت میں مذہبیت تھی ہی پھر باپ کے اخلاص اور خاندان کے سرپرستوں نے آپ کے لیے دین کا ظاہری علم سکھنے کے لیے جس شخصیت کا انتخاب کیا، اس نے اپنے اس شاگرد میں علم باطن کا ذوق محسوس فرماکر معرفت کا ابتدائی سبق بھی پڑھایا، بلکہ بقول پروفیسر شاہد اختر:

''عاشق رسول حضرت شاہ ظہور حسام صاحب حسامی مانک پوری علیہ الرحمہ نے عربی قواعد اور درسیات کی دوسری کتابوں کے علاوہ تصوف کی باریکیوں سے روشناس کرایا۔ (مجاہد ملت نمبر نوائے حبیب ص ۳۵)

۱۳۴۰ھ میں سنت نکاح ادا فرمائی اور ۱۳۴۱ھ میں شریف مکہ شریف حسین کے دور حکومت میں پہلا حج فرمایا، اور دربار رسول میں حاضر ہوئے، اسی موقع پر خلیفۂ اعلیٰ حضرت مولانا شاہ ضیاء الدین قادری مدنی علیہ الرحمہ نے مدینہ منورہ میں سلسلۂ قادریہ معمریہ چشتیہ کی خلافت مرحمت فرمائی پھر ۱۳۸۸ھ میں حدیث اور دیگر سلاسل کی اجازت عطا کی۔

صفر ۱۳۴۰ھ میں اعلیٰ حضرت کے پہلے عرس کے موقع پر پہلی بار بریلی شریف حاضر ہوئے، اعلیٰ حضرت کے وصال کے تیس دن بعد شہزادۂ اکبر حجۃ الاسلام مولانا شاہ حامد رضا خان علیہ الرحمہ نے بارگاہ اعلیٰ حضرت میں فکرمندی سے یہ عرضی پیش کی کہ اب دین وسنت کی حفاظت کون کرے گا؟ باطل قوتوں کے خلاف آواز حق اتنی شدت کے ساتھ کون بلند کرے گا؟ تو وہیں خواب میں اعلیٰ حضرت نے حجۃ الاسلام سے فرمایا کہ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ ادھر دیکھو اس شخص کا نام حبیب الرحمن ہے، یہ صوبہ اڑیسہ کے قصبہ دھام نگر میں رہتا ہے، لاکھوں کی زمین داری وصول کرتا ہے، مگر اس شاہی میں بھی فقیری کو عزیز رکھتا ہے، اس خواب کے سال بھر بعد جب مجاہد ملت پہلے عرس اعلیٰ حضرت میں شریک ہوئے، درگاہ کے ایک گوشے میں مجاہد ملت تلاوت قرآن میں مشغول تھے کہ حجۃ الاسلام کی نظر پڑ گئی، وہ خواب والا نوجوان فوراً یاد آ گیا، بے قرار ہو کر آگے بڑھے، پوچھا تمھارا نام حبیب الرحمن ہے؟ تم اڑیسہ کے رہنے والے ہو؟ زمین دار ہو؟ مجاہد ملت نے انتہائی انکساری سے ان تمام باتوں کا جواب اثبات میں دیا تو حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ نے گلے سے لگا لیا، خواب والی بات بتائی، مجاہد ملت بھی اشکبار ہو گئے۔ (نوائے حبیب مجاہد ملت نمبر ص ۴۹)

مزید تعلیم کے لیے ۲۰ سال کی عمر میں ۱۳۴۲ھ میں جب حضرت مولانا شاہ مفتی عبد الکافی نقشبندی علیہ الرحمۃ والرضوان (متوفی ۱۳۵۰ھ۔ ۱۹۳۰ء) کے مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں آئے تو مولانا عبد الکافی سے بیعت ہونے کی خواہش ظاہر کی، مولانا عبد الکافی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ نے سرکار مجاہد ملت

میں ولایت کے جواہر ریزوں کو باہر سے ہی دیکھ لیا تھا، آپ نے سرکار مجاہد ملت کو سلسلۂ قادریہ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت سے سرفراز فرمایا اور اسرار باطنی سے آگاہ فرمایا۔ [ایضاً ص ۴۸]

اس کے بعد دار العلوم معینیہ اجمیر شریف میں سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز علیہ الرحمۃ والرضوان کے جوار میں حضرت صدر الشریعہ مفتی امجد علی علیہ الرحمہ وغیرہ سے علم ظاہری کی تکمیل کے ساتھ سلوک و معرفت کی منزلیں بھی طے فرمائیں، پھر حضرت حکیم محمد احسن معروف بہ حکیم بادشاہ علیہ الرحمہ نے سلسلۂ قادریہ نقشبندیہ کی خلافت و اجازت سے نوازا۔

اجمیر شریف کے بعد صدر الافاضل سید نعیم الدین مرادآبادی کی خدمت میں جامعہ نعیمیہ مرادآباد میں حدیث شریف کی کچھ کتابیں اور کتابوں کا درس لیا، اور سند حدیث حاصل کی۔

قطب ربانی حضرت سید شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی علیہ الرحمہ [متوفی ۱۳۵۵ھ] نے سلسلۂ قادریہ معمریہ منوریہ اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ اشرفیہ کی اجازت و خلافت سے نوازا اور دعائے سیفی کی اجازت عطا فرمائی۔

حجۃ الاسلام مولانا شاہ حامد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان مجاہد ملت کی دعوت پر آپ کے چھوٹے بھائی مولانا قاری مجیب الرحمن علیہ الرحمہ کی شادی میں دھام نگر تشریف لائے، اور اس موقع پر یکم ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ کو مجاہد ملت کو تمام سلاسل طریقت اور جمیع علوم و فنون، قرآن حکیم، صحاح و سنن، ماذکار و اوراد اور وظائف و اعمال کی اجازتیں جو حجۃ الاسلام کو حاصل تھیں، سب کی سب عطا فرمائیں۔ حضرت مولانا شاہ مصباح الحسن علیہ الرحمہ پھپھوند شریف اور حضرت مولانا شاہ عبد القدیر بدایونی علیہ الرحمہ نے مجاہد ملت کو سند حدیث دی۔ اور ۱۹۵۴ء میں شاہ عبد القدیر بدایونی کی معیت میں سرکار بغداد سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے آستانے سے واپسی پر حضرت مولانا شاہ سعد اللہ مکی رحمۃ اللہ علیہ نے ممبئی میں دلائل الخیرات، قصیدہ بردہ شریف، حزب البحر، حزب اعظم اور حصن حصین وغیر کی اجازت عطا فرمائی۔

آپ کو سلسلۂ حسامیہ کی اجازت و خلافت آپ کے استاذ حضرت مولانا شاہ ظہور حسام حسامی مانک پوری علیہ الرحمہ نے دی اور آپ کے اسی استاذ و شیخ نے سلسلۂ قادریہ منوریہ کی اجازت اپنے

تلمیذ و مسترشد حضرت مجاہد ملت سے حاصل کی۔

مجاہد ملت نے زندگی میں کل چھ مرتبہ حج فرمایا، اور سات مرتبہ حرمین شریفین حاضری دی، جب کہ چھ مرتبہ سرکار بغداد میں حاضر ہوئے، پہلا حج ۱۳۳۱ھ میں ۱۹ سال کی عمر میں ترکی دور میں کیا۔ دوسرا حج ۱۹۵۵ء میں، تیسرا حج ۱۹۵۹ء میں، چوتھا حج ۱۹۷۳ء میں۔ پانچواں حج ۱۹۷۴ء میں، پھر ۱۳۹۹ھ ۱۹۷۹ء میں چھٹی مرتبہ حج و زیارت کے لیے تشریف لے گئے، مگر حج سے پہلے ہی مدینہ منورہ میں نجدیوں نے زبردستی گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا، پھر جدہ جیل میں رکھ کر ایذائیں دیں اور بغیر حج کیے ہی آپ کو ہندوستان بھیج دیا گیا۔

ہندوستان بھیجنے کے بعد سرکار بغداد میں حاضر ہو کر استغاثہ پیش کیا، چنانچہ شنوائی ہوئی اور پھر اگلے ہی سال ۱۹۸۰ء میں ساتویں مرتبہ حج و زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور چھٹا اور آخری حج ادا فرمایا۔

مجاہد ملت علیہ الرحمۃ والرضوان اللہ تعالیٰ کی توفیق سے طاعت و بندگی، عبادت و ریاضت، اتباع سنت، تسلیم و رضا، اور جہاد نفس کی بدولت معرفت اور قرب الٰہی کے عظیم منصب پر فائز تھے، اور فنا فی اللہ، فنا فی الرسول اور فنا فی الغوث ہو کر بقا اور محبوبیت کا درجہ حاصل کر لیا تھا، اس لیے بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و رحمت ان پر بہت زیادہ اور خاص طور سے مہربان رہی، اور اللہ تعالیٰ کے جوہر شناس خاص بندوں کی روحانیتیں خصوصی طور سے آپ کی طرف متوجہ ہوئیں اور اپنے فیوض و برکات سے نوازتی رہیں۔

بارگاہ رسالت میں مہمانی اور سلامی: الحاج محمد اسحٰق نوری لاہوری اسی سال ۱۹۸۰ء کے اپنے حج کا ذکر کرتے ہوئے بارگاہ رسالت میں مجاہد ملت کی پذیرائی کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

''ادھر سعودی حکومت نے حضرت مجاہد ملت کو گرفتار کر کے بیر عثمانی کے جیل میں بند کر دیا ادھر مجھے خواب میں کچھ اس طرح زیارت ہوئی کہ آپ فوجی وردی میں ملبوس بارگاہ مصطفیٰ میں عین سنہری جالیوں کے سامنے ایک وسیع و عریض دسترخوان پر بیٹھے ہوئے، رنگا رنگ کھانے، قسما قسم مشروبات آپ کے سامنے ہیں، اس دسترخوان پر چار پانچ اور بزرگ بھی جلوہ افروز ہیں، حضور سید عالم ﷺ اپنے ہاتھ

سے آپ کو اس دسترخوان سے اٹھا اٹھا کر عطا فرما رہے ہیں، اور بعد از فراغت آپ ایک فوجی مجاہد کی حیثیت سے حضور کے مواجہہ کی طرف مارچ کرتے ہوئے سلوٹ سے سلامی دیتے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں۔[مجاہد ملت نوائے حبیب ص ۱۱۰، ۱۰۹]

مجاہد ملت کی نماز: محمد رفیع حبیبی بیان کرتے ہیں کہ مجاہد ملت کی نمازوں کا عالم دیکھ کر کٹر سے کٹر فاسق کا دل بھی روحانی کیفیتوں سے سرشار ہو جاتا تھا، حضرت مجاہد ملت سفر میں ہوں یا حضر میں نماز کبھی قضا نہیں ہونے دیتے، نماز فجر کے بعد معمول کے مطابق وظیفہ پڑھتے اور نفی واثبات کا ذکر کرتے، یہاں تک کہ اشراق کا وقت ہو جاتا، پھر اشراق کی نماز پڑھ کر مصلیٰ سمیٹتے پھر چاشت کی نماز ادا کرتے، ہر نماز کے بعد طویل وظیفہ پڑھتے، زیادہ تر وظائف فجر اور مغرب کے بعد پڑھتے، مغرب کے بعد اوّابین اور صلوٰۃ غوثیہ پابندی کے ساتھ ادا فرماتے، ہر نماز کے بعد فاتحہ بھی پڑھتے، رمضان المبارک کے مہینے میں یا کسی بھی نفل روزے کا افطار پانی کے محض چند گھونٹ سے کرتے، نماز کے ساتھ دیگر معمولات کی ادائگی کے بعد منجن کرتے اس کے بعد کچھ کھاتے پیتے۔[مجاہد ملت نمبر نوائے حبیب ص ۳۱۹]

نوعمری میں دینداری کا یہ عالم تھا کہ ابھی صرف نو سال کے ہی تھے کہ روزے کے پابند ہو گئے ، اور ایسے پابند کہ رمضان المبارک شروع ہونے سے پہلے میعادی بخار کے سبب کئی دن بے ہوش رہے، نقاہت وکمزوری بہت زیادہ تھی، موسم سخت گرم تھا، لیکن رمضان آگیا تو روزے شروع کر دیے، گھر والے یا خادم سحری کے لیے نہ جگاتے اور خود سے بھی نہ جگ پاتے، تو بغیر سحری کے ہی روزہ رکھ لیا کرتے تھے۔

آپ تقویٰ وپرہیزگاری کی بنیاد پر جوانی میں بھی پیری کی دولت سے سرفراز تھے، کسی بھی باعظمت انسان کی دینی عظمت اور اس کی واقعی قدر وقیمت سمجھنے میں وقت کے اکابر ومعاصرین کے خیالات وتاثرات اور ان اصاغرین کے احساسات بڑی اہمیت رکھتے ہیں، جو انسان کی زندگی کے نشیب وفراز سے واقف ہوتے ہیں، لہذا ہم مجاہد ملت کی مجاہدانہ اور صوفیانہ شخصیت کے صحیح خدوخال سمجھنے کے لیے کچھ اہم شخصیتوں کے خیالات ذکر کر رہے ہیں۔

حضرت حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ: حضرت حجۃ الاسلام نے ۱۳۵۰ھ میں دھام نگر میں مجاہد ملت کو روحانی

سلاسل نیز جملہ علوم وفنون اور بے شمار اوراد واعمال کی اجازت عطا فرمائی تھی، آپ نے مجاہد ملت کے لیے خصوصی تحریری اجازت نامے میں آپ کو جن الفاظ واوصاف سے یاد کیا ہے، اس سے مجاہد ملت کی عظمت کا پتہ چلتا ہے، لکھتے ہیں:

''میرے پروردگار نے مجھے الہام کیا ہے کہ ان [مجاہد ملت] کو مکمل عام اجازت دوں تو میں نے نیک بخت قابل تعریف بھائی کو اجازت دی، جو اچھے، لائق، مہربان، صوفی باصفا، وفادار، مخلص، تیز، ذہین، مضبوط دل والے، اور محکم ارادے والے، بلند سنتوں کے حامی، اور قابل نفرت فتنوں کی سرکوبی کرنے والے، ہم عصروں اور فضل وکمال والوں میں قابل فخر، عمدہ عادات واطوار والے، فضل اور اونچے اخلاق والے، فاضل کامل، لائق ادیب، ذہین حبیب، میرے محبوب ومحب ہیں، میرے دل کے ٹکڑے ہیں، میرے جگر کی تسکین، میرے قلب کی راحت، میری آنکھ کے نور، اس زمانے کے بہتر فرد اور اس زمانے کے نادر شخص، بڑوں کی آنکھ کی پتلی۔ [مجاہد ملت نمبر اشرفیہ ص ۳۰]

شیخ الاسلام علامہ عبدالقدیر بدایونی: شیخ الاسلام نے مجاہد ملت کے خوف وتقویٰ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''ہمارا اور مولانا حبیب الرحمن کا یہ فرق ہے کہ ہم لوگ سب سے ڈرتے ہیں، خدا سے نہیں ڈرتے، اور مولانا حبیب الرحمن کسی سے نہیں ڈرتے، صرف خدا سے ڈرتے ہیں۔ [ایضا ص ۱۲]

صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی: حضرت مولانا عبدالرب صاحب مرادآبادی فرماتے ہیں کہ حضرت صدر الافاضل علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ عبدالرب! یہاں [یعنی دنیا میں] تو انھوں نے [مجاہد ملت] نے صرف تین کو ترایا ہے، قیامت کے دن پتہ نہیں کتنوں کو ترائیں گے۔ [مجاہد ملت نمبر اشرفیہ ص ۱۲۰]

حافظ ملت علیہ الرحمہ: راز الہ آبادی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حافظ ملت کے سامنے مجاہد ملت کا ذکر ہوا مسکرا کر فرمایا کہ مجاہد ملت کو نیکی کا ہیضہ ہو گیا ہے، وہ یہ چاہتے ہیں کہ پوری دنیا یک بیک نیک ہو جائے بہر ان کی یہ خواہش عین سنت رسول ہے۔ [ایضا ص ۲۱۲]

قاضی شمس الدین جونپوری: قاضی صاحب حضرت مجاہد ملت کے ہم عصر اور ہم درس تھے، آپ فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا امجد علی صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے لائق شاگردوں میں مولانا حبیب

الرحمٰن صاحب قادری اڑیسوی بھی تھے، عالم باعمل ہونے کی حیثیت سے بھی اپنے تمام ساتھیوں میں امتیازی حیثیت حاصل تھی، تواضع اور احباب نوازی خصوصاً شاگرد پروری میں تمام اقران وامثال پر فائق تھے۔ [ایضاً ص ۷]

حضرت مفتی رفاقت حسین علیہ الرحمہ: آپ نے ایک بار حضور مجاہد ملت کی شدت [اتباع سنت] کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ ہمیشہ کھلی تہبند اختیار فرماتے تھے، اور جب جب اس موضوع کے فنی پہلوؤں پر گفتگو ہوتی تو آپ کا یہ سوال سب کو خاموش کر دیتا کہ کھلی ہوئی تہبند زیب تن فرمانے کی کوئی سند عطا فرمائیں۔ [مجاہد ملت نمبر نوائے حبیب ص ۱۱۵]

سرکار کلاں کچھوچھہ: فرماتے ہیں: ''وہ علم وفضل اور خلوص وتقویٰ کے ایک ممتاز مقام پر فائز تھے''۔ [ایضاً ص ۱۰]

شاہ عزیز احمد ابوالعلائی الٰہ آباد: فرماتے ہیں: ''حضور مجاہد ملت کی حیات بابرکات سے نہ جانے کتنی علمی وروحانی تاریخیں وابستہ ہیں، جس سے دنیائے اسلام ہمیشہ فیضیاب ہوتی رہے گی، کردار وعمل، تقویٰ وطہارت، ہمت وبے باکی اور حق وصداقت کا ایک نیر تاباں جو تمام عمر خدمت دین میں مصروف رہا''۔ [ایضاً ص ۸]

علامہ نظام الدین الٰہ آبادی: فرماتے ہیں:

''حضرت مجاہد ملت ہمیشہ ذکر الٰہی یعنی پاس انفاس میں مشغول رہتے تھے، حضرت کی پوری زندگی پر نظر ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کی بلندی کردار کا راز ذکر الٰہی تھا، جس نے فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کی منزل پر فائز کر دیا تھا، یہی وجہ تھی کہ نہ ان کو کوڑے کا خطرہ تھا اور نہ بیڑی کا خوف''۔ [ایضاً ص ۱۱]

مولانا ارشد القادری صاحب شاہد ہیں کہ ایک اہم مقام پر مجاہد ملت کی معیت میں انھیں رہنے کا شرف ملا، تو وہاں جو کھانا نصیب ہوا، وہ چاول کی موڑھی اور اس کے ساتھ کٹھل کا کویا تھا، اسی پر دونوں نے گزر کیا۔

راہ خداوندی میں مالی جہاد فی سبیل اللہ کا وہ نمونہ حضرت نے پیش فرمایا کہ نہ معلوم کتنے طلبہ کا

وظیفہ اپنی جیب خاص سے مقرر کر کے ان کی تعلیم مکمل کرائی، ان کے مستقبل سنوارے، دین کی اشاعت کے لیے قرآن پاک کے فن قراءت اور تجوید کو حاصل کرنے کے لیے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھیجا، انھیں اپنے صرفہ سے تعلیم دلوائی، غربا اور مساکین پر بادل بن کر اس طرح برسے کہ ان کے دامن تنگ ہو گئے۔ [مجاہد ملت نمبر نوائے حبیب ص ۱۲۰]

علامہ مشتاق احمد نظامی: مجاہد ملت کی دنیا کی دولت اور عیش سے بے نیازی کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''مجاہد ملت ایک عظیم اسٹیٹ کے مالک تھے، لیکن دین کی راہ میں اسے اپنے لمبے لمبے ہاتھوں سے ایسا لٹایا کہ اس دنیائے ناپائیدار سے اس طرح گئے کہ نہ کوئی بینک بیلنس تھا، نہ کوئی تجوری اور نہ کوئی ایسی صندوقچی، جس میں ایک کانی کوڑی محفوظ ہوتی... گویا اسٹیٹ کو پاؤں کی ٹھوکر ماری اور درویشی کی چادر اوڑھ لی۔

ریاست پاؤں کی دھول تھی، لیکن کبھی بھی فرسٹ کلاس میں سفر نہ فرماتے، ۴۷ء میں اسٹیٹ ٹوٹنے کے بعد اگر منت وسماجت سے نذرانہ قبول بھی فرماتے تو بقدر ضرورت اور اکثر اسے بھی تبلیغ سیرت کے فنڈ میں جمع کرا دیتے۔ [ایضاً ص ۱۲/۱۳]

شارح بخاری مفتی شریف الحق امجدی: حضرت مفتی صاحب مجاہد ملت کے اوصاف کمال گناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت مجاہد ملت قدس سرہ جیسی جامع عبقری شخصیت پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے، وہ دیکھنے میں ایک فرد تھے، مگر اپنے اندر نہ جانے کتنی دنیا رکھتے تھے، علم وفضل، اتباع شریعت، سلوک وطریقت، زہد وورع، خشیت الٰہی، انابت الی اللہ، شجاعت، سخاوت، استقامت، حق گوئی، حق کوشی، قوم وملت کا درد، ملت کے دشمن عناصر پر کڑی نظر اور ان کی دسیسہ کاریوں سے آگاہی، ان کے انسداد کی تدابیر اور ان پر عمل درآمد کی بھرپور جدوجہد اور کبھی کسی بڑی سے بڑی طاقت سے نہ ڈرنا... محل ہوتے ہوئے جھونپڑے میں رہنا، حرص وآز، ریا ونمود، حب جاہ وحب وقار سے کوسوں دور، جملہ علوم وفنون کے عطر مجموعہ، طریقت وحقیقت کے شناور، مسند درس وتدریس کے صدر نشیں، بزم افتا کی شمع فروزاں، میدان مناظرہ کے شہ سوار، میں کیا کیا ذکر کروں اور کیا کیا رہنے دوں۔ [ایضاً ص ۵۸،۵۷]

مفتی عبدالمنان اعظمی: مفتی صاحب فرماتے ہیں:

"حضور مجاہد ملت انھیں عدیم المثال مردان حق اور خاصان خدا میں سے تھے، جو دست قدرت کا شاہکار ہوتے ہیں، ان کے قلب مبارک میں عشق شاہ مدینہ اور محبت میر بغداد کا الاؤ دہک رہا تھا، ان کا سینہ لاہوتی اسرار اور عرفان الٰہی کا مدینہ تھا......رات کا بیشتر حصہ ذکر وفکر اور یاد الٰہی میں گزارتے۔[ایضاً ص ۷۵۔۷۷]

اخیر عمر میں کپڑے میں بے حد سادگی آگئی تھی، استری کیا ہوا کپڑا کبھی کبھی دیکھا، بیشتر ہاتھ ہی کا دھلا ہوا، لیکن نہایت عمدہ صاف اور بے حد اجلا، میلا ہونے ہی نہیں دیتے تھے۔

داد و دہش اور عفو و کرم کا یہ عالم کہ معلوم ہوتا تھا حضور رسول کریم علیہ التحیۃ والثنا کی سنت کریمہ پر پورا پورا عمل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، پوری ریاست عفو و نوازش کی نذر ہو گئی۔

بے نفسی اور استغنا کا یہ عالم کہ کبھی کسی سے منفعت کی امید نہیں رکھی، جلسوں میں سفر خرچ سے جو زائد ملتا، اسے واپس کرتے میں نے دیکھا،......آپ نے اپنی مستورات کے زیور بیچ کر دین کی خدمت کی ہے، گھر، میں نے اعتکاف کے عالم میں تخت بچھا ہوا دیکھا، لیکن سفر میں سونے کے لیے زمین کا فرش ہو یا تخت و چارپائی ہو، نہ اس سے عار، نہ اس کی طلب، گویا کم خواب کا فرش اور صاف ٹاٹ کا ٹکڑا دونوں آپ کی نظر میں برابر تھا، بے شمار دعوتوں میں میرا ساتھ ہوا، مگر کسی کھانے کی طرف کوئی خاص رغبت نہ دیکھی، نہ کسی کھانے کو ناپسند فرمایا، مچھلی اور آم سے رغبت تھی، لیکن کھاتے معمول کے مطابق ہی تھے۔[ایضاً ص ۸۱]

اور علم و فضل کے ساتھ ساتھ حضرت مجاہد ملت، عارف باللہ اور صاحب باطن بھی تھے، چنانچہ علم باطن پر آپ کو فنی قدرت بھی تھی، اور عمل بھی، ایک دفعہ حضرت مولانا عبدالسلام صاحب دہلوی مرحوم و مغفور کا تذکرہ ہوا، اور ان کے وحدۃ الوجودی ہونے کے سلسلے میں بات چلی تو آپ نے اس مسئلہ پر ایک سیر حاصل بحث فرمائی کہ مولانا عبدالسلام صاحب یوں کہتے تھے، اور یوں فرماتے تھے، گویا ساری بات آپ نے "گفتہ آید در حدیث دیگراں" ارشاد فرمادی۔

اور عملی مجاہدے کا یہ عالم تھا کہ کٹک جیل میں آپ تھے تو یہ مشہور ہوا کہ رات میں حضرت جیل کی

کوٹھریوں سے باہر اور زنجیروں سے آزاد ہو کر صحن میں پھرتے ہیں، اور ذکر و نماز میں مشغول رہتے ہیں، جب آپ چھوٹے تو مجھ سے ملاقات ہوئی، میں نے پوچھا، حضرت وہ کیا قصہ تھا؟ تو کہنے لگے ارے کچھ نہیں، ایک حجام تھا، جو جیل میں میری حجامت بنانے آتا تھا، اسی نے اس کو بڑی شہرت دی، پھر تھوڑی دیر بعد فرمایا: وہاں ایک کمیونسٹ لیڈر بھی میرے ساتھ جیل میں تھا مختلف مسائل پر اس سے تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا، ایک دفعہ وہ بھی کہنے لگا، ہو سکتا ہے آپ کو یہ غیر معمولی طاقت حاصل ہو، کیوں کہ آپ محنت بہت کرتے ہیں، یہ اشارہ عبادت و ریاضت کی طرف تھا، الغرض حضرت محترم اہل سنت کی آبرو، دین کا وقار اور روحانیت کا پرچم تھے۔ [ایضاً ص ۸۲]

علامہ محمد شفیع اعظمی مبارک پور: مجاہد ملت کی مومنانہ جرأت و عزیمت اور زہد و غنا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”(مجاہد ملت) ایسے باعزیمت انسان تھے کہ سنگینوں کے سائے میں آواز حق بلند کی، اور نماز عشق ادا کی، دولت و ثروت کو ٹھوکر مار کر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے زہد و استغنا کی یاد تازہ کردی“۔ [مجاہد ملت نمبر اشرفیہ مبارک پور ص ۹]

محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری: فرماتے ہیں:

”حضرت مجاہد ملت ایک صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، اسی لیے آپ کی تبلیغ میں غضب کی تاثیر بھی تھی، آپ ہر کمال میں امتیازی شان رکھتے تھے، سنت و شریعت کی پابندی و پاسبانی میں پوری زندگی گزار دی، شریعت کے خلاف اٹھنے کا سوال ہی کیا تھا، جب کہ انھیں خالی سنتوں کا فوت ہونا بھی گوارا نہ تھا، رئیس اعظم تھے مگر زندگی فقیرانہ انداز میں گزار دی، گویا آپ روحانی و مادی دونوں طرح فیوض و برکات کا سرچشمہ تھے۔ [مجاہد ملت نمبر اشرفیہ ص ۸۵]

مولانا سید الزماں حمدوی: یقیناً آپ اس دور کے حقانی و ربانی عالم تھے، اور زمرۂ ربانیین میں بصد افتخار داخل تھے، مزید برآں آپ کی سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ آپ اہل عزیمت تھے، صاحب رخصت نہیں۔ [مجاہد ملت نمبر اشرفیہ ص ۱۰۲]

خود رئیس تھے، لیکن دین کی خاطر آخرت کے خوف سے فقیری اختیار کی، کسر نفسی اور وسیع الاخلاقی کا یہ عالم تھا کہ بڑے تو بڑے، ملتے وقت چھوٹوں کے ہاتھوں کو چومتے۔ [ایضاً ص ۱۰۲]

مولانا عبدالرب حبیبی مرادآبادی: حضور مجاہد ملت علیہ الرحمہ جتنے بڑے عالم تھے، اتنے بڑے فقیر بھی تھے، علم تصوف میں بہت بڑا کمال حاصل تھا، مجھ کو خاص طور سے علم تصوف کے بارے میں بتاتے رہتے تھے۔ [ایضاً ص ۱۳] [ماہنامہ پیام حرم جون ۲۰۰۷ء]

اسلامی ہند: عروج وزوال کی تاریخی جھلک

انیسویں صدی عیسوی عالم اسلام اور اسلامیان ہند، دونوں کے لیے زوال و انحطاط اور ادبار کی صدی رہی ہے، اسی صدی میں اسلام دشمن صلیبی طاقتوں نے اپنی ریشہ دوانیوں کے ذریعہ پوری اسلامی دنیا کے مسلمانوں کو غلام بنانے اور اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے صدیوں سے قائم ترکوں کی عظیم سلطنت عثمانیہ کی چولیں ہلا دیں اور اس کو پارہ پارہ کر کے بالواسطہ یا بلاواسطہ خود حکمراں بن گئے حتی کہ جزیرۃ العرب بھی محفوظ نہیں رہا، انگریزوں نے وہابی تحریک کے بانی محمد بن عبدالوہاب نجدی کو آلۂ کار بنا کر مسلمانوں کا بے تحاشا خون بہایا اور انگریزوں نے ذلت آمیز اور دور رس اثرات کے حامل اور انتہائی مضر معاہدوں کے ذریعہ جزیرۃ العرب پر آل سعود کو سیاسی حکمرانی اور آل الشیخ یعنی ابن عبدالوہاب نجدی کے خاندان کو حرمین شریفین کی مذہبی حکومت سونپ کر اسلامی سلطنت کا گلا گھونٹ دیا اور پردے کے پیچھے سے اب تک یہی صلیبی طاقتیں نجد وحجاز پر حکومت کر رہی ہیں۔

اور ادھر برصغیر میں اسی انیسویں صدی عیسوی میں اسلامی ہند پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ تجارت کے بہانے تقریباً سات سو سالہ مسلم حکمرانی کا خاتمہ کر کے پورے ہندوستان پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا، اور ۱۸۵۷ء میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی موت کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے مغلیہ اسلامی حکومت کا چراغ گل کر دیا۔

پیش ہے ہندوستان پر اس عظیم اور مثالی مسلم حکمرانی کے شاندار آغاز وارتقا تیز انتشار وادبار اور زوال وانحطاط کی دکھ بھری داستان کی تاریخی جھلک۔

ہندوستان کی معلوم ومنضبط تاریخ تین ادوار میں تقسیم کی جاتی ہے (۱) ابتدائی دور (۲) عہد وسطی (۳) عہد جدید۔

(۱) تقریباً ۵۰۰ ق م سے ۱۲۰۰ء تک کا زمانہ ہندوستانی تاریخ کا ابتدائی دور کہلاتا ہے، اس دور میں ظہور اسلام کے کچھ بعد تک ہندوستان میں ہندومت، بدھ مت، جین مت، کے لوگ آباد تھے اور ایک صدی سے زیادہ زمانے تک انھیں مذاہب کے پیروکاروں کی سیاسی ومذہبی حکمرانی رہی۔

(۲)اور ۱۲۰۰ء سے ۱۷۶۱ء کے زمانہ کو عہد وسطیٰ کہا جاتا ہے، جس میں ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک دہلی پر پانچ مسلم خاندانوں نے حکومت کی: (۱)البری ترک [۱۲۰۶ء تا ۱۲۹۰ء] (۲) خلجی [۱۲۹۰ء تا ۱۳۲۰ء] (۳)تغلق [۱۳۲۰ء تا ۱۴۱۳ء] (۴) سادات [۱۴۱۴ء تا ۱۴۵۱ء] (۵) لودھی [۱۴۵۱ء تا ۱۵۲۶ء]

اور ۱۵۲۶ء سے ۱۷۰۷ء تک تخت دہلی کے ذریعہ طاقت ور اور با اختیار مغل بادشاہ ہندوستان کے فرمانروا رہے اور انھوں نے مستحکم حکومت کی، ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات ہوئی، اس کے بعد برائے نام کئی کمزور اور نا اہل مغل بادشاہ باضابطہ اور بے ضابطہ ۱۷ ر مسلم بادشاہ ہوئے، آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تھے، اس طرح کل ملا کر کہنے کو ہندوستان پر مغلیہ حکومت تقریباً تین سو سال سے زیادہ رہی ، اور اگر اس کے پہلے کے ترکی، خلجی، تغلق، سادات اور لودھی مسلم سلاطین کے تقریباً تین سو سالہ دور حکومت کو جوڑ دیا جائے تو ہندوستان پر مسلم حکمرانی کا زمانہ چھ سو سال سے زیادہ عرصے کو محیط ہو جاتا ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں سندھ کے علاقہ پر عربوں کا تسلط شروع ہوا، محمد بن قاسم نے ۱۷۱۱ء میں دیبل کا قلعہ فتح کیا، پھر آگے بڑھ کر نیرون کو فتح کیا، اس کے بعد دھیرے دھیرے سندھ پر قبضہ کرنا شروع کر دیا، تین برس کے اندر کشمیر کی حد سے لے کر کچھ تک اور بحر عرب سے سرحد مالوہ، راجپوتانہ، مارواڑ اور دریائے راوی کے کنارے تک فتح کر کے سندھ میں اور آگے بڑھا، محمد بن قاسم کے بعد بہت سے لوگ یکے بعد دیگرے سندھ کے والی ہوتے رہے، نویں صدی عیسوی [۸۷۱ء] میں یعقوب بن لیث نے آزاد سندھ کی سلطنت قائم کی، اور خلفائے بغداد سے تعلق نہ رکھا، ۹۹۸ء سے ۱۰۳۰ء تک ہندوستان پر محمود غزنوی نے سترہ حملے کیے، ۱۰۲۵ء میں اس نے سومناتھ گجرات پر مشہور حملہ کیا، سب سے پہلے لاہور کو اپنی سلطنت میں شامل کیا، پھر سندھ پر قبضہ کیا، پھر کشمیر، قنوج، کالنجر، گوالیار اور گجرات وغیرہ اس کے باجگزار ہوئے، یہ پہلا بادشاہ ہے، جس نے ہندوستان کے شمال میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی ، اور اپنا سکہ رائج کیا، ۱۰۳۰ء میں محمود غزنوی "غزنہ" میں وفات پا گیا۔

بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں ۱۱۸۰ء میں سلطان شہاب الدین غوری نے لاہور پر حملہ کیا ، پھر "غزنہ" واپس چلا گیا، پھر ۱۱۸۴ء میں ہندوستان آیا، پھر جب تیسری مرتبہ ۱۱۸۶ء میں لاہور آیا تو

آخری غزنوی بادشاہ خسرو ملک کو گرفتار کر کے "غزنہ" لے گیا، جہاں خسرو کا انتقال ہوگیا، اسی وقت سے ہندوستان غزنوی حکومت سے نکل کر غوری خاندان کے قبضے میں آگیا، اور دہلی پر باقاعدہ ترکوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

۱۲۰۶ء میں جب محمد شہاب الدین غوری کا قتل ہوا تو اس کے غلام افسر قطب الدین ایبک نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا، ایبک نے پہلے اپنا پایۂ تخت لاہور کو بنایا، پھر دہلی چلا آیا، دہلی میں اس نے ایک عالیشان مسجد بنائی، جس کا نام "قوت الاسلام" رکھا، اسی مسجد کا ایک منارہ "قطب مینار" کہلاتا ہے، اور آج بھی باقی ہے، جب کہ زیرِ تعمیر مسجد کے کچھ آثار اب بھی موجود ہیں، یہ مسجد مکمل تعمیر نہیں ہو پائی۔

۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی سے پہلے مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کا مقابلہ ہوا، جس میں مغل بادشاہ بابر کو فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی، بابر ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا بانی ہے، بابر کے بعد یکے بعد دیگرے ہمایوں، شیر شاہ سوری، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب بادشاہ ہوئے۔

مسلمان بادشاہوں نے اپنے دورِ حکمرانی میں ہندوستان کو بہت کچھ دیا دہلی کا لال قلعہ، جامع مسجد، اور تاج محل مغلوں کی دین ہے، انھوں نے یہاں کی تہذیب وتمدن میں دوررس انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں، اور اس ملک کو شاندار منظم نظامِ حکومت عطا کیا، عدل وانصاف قائم کیا، ہندوستانی رعایا کو ان کے واجبی حقوق دے کر انھیں خوش اور مطیع رکھا، سیاسی، انتظامی، سماجی، تعمیری، تعلیمی اور اقتصادی اصلاح وترقی کے ہر ممکن طریقے اپنا کر ہندوستان کو قابلِ رشک سونے کی چڑیا بنا دیا، جس کی طرف فرانسیسی اور انگریز قوم میں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگیں، جو صرف اور صرف انھیں کا مرہونِ منت ہے۔

خاص طور سے مغل بادشاہوں کی خدمات آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں اور مغل بادشاہوں میں سلطان اورنگ زیب عالم گیر کا پچاس سالہ دورِ حکومت خاص اہمیت کا حامل ہے، بقول سید ابوظفر ہندوستان میں تاریخی زمانہ سے لے کر اس وقت تک کوئی ایسا بادشاہ نہیں گزرا، جیسا کہ اورنگ زیب عالم گیر تھا، اس نے پچاس برس سے زیادہ ہندوستان میں حکومت کی، اس کی نوے برس کی لمبی زندگی ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے ساری عمر اعتدال سے گزاری، بلخ سے لے کر راس کماری تک اور کراچی

(بحر عرب) سے آسام (چین کی سرحد) تک اس کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی، وہ بڑا دوراندیش اور مستقل مزاج تھا علم کے زیور سے خود بھی آراستہ تھا، دوسروں کی بھی قدر کرتا تھا، چنانچہ بڑے بڑے عالموں نے مل کر فتاویٰ عالم گیری اسی زمانے میں لکھی، فارسی زبان کا خود بڑا ادیب تھا۔ (مختصر تاریخ ص ۱۷)

ہندوستان میں خاندان مغلیہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ بابر سے عالم گیر تک [سوری پٹھانوں کی چند سالہ حکومت کے استثنا کے ساتھ] لائق حکمراں ہوئے، مغل حکومت کے قیام سے ہندوستان سے طوائف الملوکی ختم ہوگئی، اور بادشاہ گردی کا خاتمہ ہوگیا، اور اورنگ زیب عالم گیر حقیقی معنوں میں ہندوستان کا شہنشاہ ہوا۔

اس کے دور میں دین اور علم دونوں نے کافی ترقی کی، مغلوں کی علم دوستی وعلم پروری اور علما نوازی اور خاص طور سے عالم گیر کی اسلام پسندی سے مذہب کو کافی رواج ملا، اور ہندوستان میں اسلامی حنفی نظام قائم ہوا، اور عالم گیر نے اسے اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کرنے میں کامیابی حاصل کی، اور سیاست اور دین کو ایک کردیا، لیکن غیر مسلموں کو مکمل مذہبی آزادی دی اور مذہب کے اختلاف کو عدل وانصاف اور حقوق دینے میں آڑے نہیں آنے دیا۔

مسلمان مغل حکمرانوں نے ہندوستان کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھا، اور اسے دلہن کی طرح سجا کر تہذیب وتمدن اور علم وہنر سے آراستہ کر کے دنیا کے نقشے پر ایک عظیم ملک کی حیثیت دی۔

عالم گیر چوں کہ مذہب پرست تھا، اس لیے اس کے مذہبی اقدامات کے سبب انگلستان فرانس، اور دوسری یورپین اسلام دشمن اقوام کو عالم گیر بالکل نہیں بھارہا تھا، لہٰذا ان طاقتوں نے تجارت کو ذریعہ بنا کر سیاسی طالع آزمائی اور ریشہ دوانی شروع کردی، کئی صدی پہلے ہی سے تجارت کے سلسلے میں ہندوستان میں آنا جانا لگا ہوا تھا، چنانچہ ۱۶۰۰ء میں ہالینڈ کے ولندیزی تاجر ہندوستان آئے اور پچاس سال میں ہر جگہ چھاگئے، اور بحر ہند پر ان کا قبضہ ہوگیا، اس کے بعد ڈنمارک، جرمن، فرانس، انگلستان کے لوگ جہاز لے کر آئے، لیکن ان میں سے فرانسیسیوں اور انگریزوں کے علاوہ سب اکھڑ گئے، ۱۶۰۰ء میں انگلستان کی ملکہ الزبتھ کے دور میں پہلی انگریزی تجارتی کمپنی قائم ہوئی، اور کامیاب رہی، ۱۶۹۶ء میں دوسری انگریز کمپنی قائم ہوئی اور ۱۷۰۰ء میں تیسری انگریزی کمپنی کھڑی ہوئی۔

ان الگ الگ انگریز کمپنیوں میں بھی تاجرانہ نااتفاقی اور ناچاقی رہتی تھی، پھر ان کے باہمی اتفاق ومشاورت سے ساری انگریز کمپنیوں کو ملا کر "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے نام سے ایک متحدہ کمپنی بنائی گئی ،اس کمپنی نے خوب ترقی کی۔

جہاں گیر کے دور میں اس کمپنی کو چار کوٹھیاں بنانے کی اجازت ملی، ۱۶۳۸ء میں شاہجہاں نے اس کمپنی کو تجارتی حقوق دیے، ۱۶۴۰ء میں بیجانگر، دکن کے حاکم رام راج کے بھائی نے انگریزوں کو مدراس کی زمین دی، بمبئی کا جزیرہ بھی اس کمپنی نے خرید لیا۔

۱۶۸۶ء میں عالم گیر نے اپنی فراست اور دوربینی سے انگریزوں کی نیت بھانپ لی، اور ممبئی کے سوا پورے ہندوستان سے ان کو نکال باہر کیا، ۱۶۹۶ء میں شہزادہ عظیم الشان نے پھر ان کو اجازت دے دی اور انگریزوں نے کلکتہ خرید لیا، اور وہاں "فورٹ ولیم کالج" کے نام سے ایک قلعہ بنایا، اس طور سے انگریز سترہویں صدی عیسوی کے ختم ہوتے ہوتے مضبوطی کے ساتھ کلکتہ، مدراس، اور ممبئی میں جم گئے۔

فرانسیسی بھی تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے، اور کلکتہ کے پاس چندرنگر اور مدراس کے پاس پانڈیچری ان کی تجارت کا صدر مقام تھا، انگریز اور فرانسیسی دونوں قومیں ایک دوسرے پر غلبہ پانے اور اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں، اس معرکہ آرائی میں ۱۷۵۹ء میں انگریزوں کے مقابلے فرانسیسی شکست کھا کر پست ہو گئے اور ان کی کمر ٹوٹ گئی، اور انگریز اکیلے پوری قوت کے ساتھ عروج پر ہو گئے۔

انگریزوں نے ہندوستان سے مغل مسلم حکمرانوں کے خاتمے اور ہندوستان پر خود حکومت کے دیرینہ خواب کو بروئے کار لانے کے لیے اپنی فوجی قوت میں اضافہ کیا، اور ابتدا میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو زیر نگیں کرنا شروع کیا، تا کہ دہلی کی سلطنت پر قابض ہو کر شاہان مغلیہ کا چراغ گل کر دیا جائے۔

دوسری طرف مغل بادشاہوں کی عیش پرستی اور پست ہمتی اور روز بروز بڑھتے آپسی اختلافات وانتشار نے مغل مسلمان سلطنت کو مسلسل انحطاط اور زوال کی طرف ڈھکیلنا شروع کر دیا، جس نے

برطانوی سامراج اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عزائم کی تکمیل کا موقع فراہم کیا۔

کمپنی نے امراء وراجگان کے درمیان اپنے آلۂ کار چھوڑ دیے، کمپنی نے لالچ دے کر یا ڈرا دھمکا کر اور آپس میں لڑا کر ان کو اپنا محکوم بنانا اور ان کے قلمرو پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔

چنانچہ انگریزوں نے مدراس کے نواب کی مدد کے پردے میں مدراس پر قبضہ کیا، پھر انھوں نے بنگال میں دخل دینا شروع کیا، لیکن بنگال کے نوجوان نواب سراج الدولہ نے انگریزوں پر چڑھائی کر کے بے دخل کر دیا، دوبارہ انگریزوں نے ایک بھاری فوج سراج الدولہ کی سرکوبی کے لیے بھیجی، اور سراج الدولہ کے سپہ سالار میر جعفر کو نوابی کا لالچ دے کر ملا لیا، میر جعفر نے غداری کی اور سراج الدولہ ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کے ساتھ معرکہ آرائی میں پلاسی کے میدان میں مارا گیا، اور انگریزوں نے میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا، پھر میر جعفر کے داماد میر قاسم کو اس کے خسر میر جعفر سے لڑا دیا، اور انگریزوں نے اسے معزول کر کے میر قاسم کو بنگال کی گدی دے دی، جس نے بردوان، مدنا پور، اور چٹاگانگ انگریزوں کے حوالے کر دیا، ۱۷۶۴ء میں شاہ عالم ثانی نے جو اودھ کا نواب تھا، بکسر کی جنگ میں انگریزوں سے شکست کھائی اور کمپنی کی من مانی شرائط قبول کر کے بنگال، بہار، اور اڑیسہ کی دیوانی کے اختیارات کمپنی کے حوالے کر دیے، اور ان تینوں علاقوں پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

اسی کے بعد ہندوستان میں گورنر جنرل کا عہدہ مستقل طور پر قائم ہوا، ۱۷۷۲ء میں کمپنی کے ارباب انتظام نے واران ہسٹینگز کو سب سے پہلا گورنر جنرل بنایا۔

۱۷۶۵ء میں میسور کے راجہ حیدر علی کو انگریزوں نے حیدر آباد کے نظام اور مرہٹوں سے مل کر تباہ کرنا چاہا، ۱۷۸۱ء میں ایک معرکے میں حیدر علی کو شکست ہوئی، اور وہ اسی سال انتقال کر گیا، اس کے بعد اس کا بیٹا فتح علی ٹیپو سلطان میسور کا بادشاہ بنا، ۱۷۹۸ء میں لارڈ ولزلی گورنر جنرل ہوا، اس نے ٹیپو سلطان سے جنگ چھیڑ دی اور نظام کو ملا لیا، ٹیپو سلطان کے معتمد خاص میر صادق کی غداری سے انگریز سرنگا پٹم کے قلعے میں گھس آئے، نتیجے میں ٹیپو سلطان بہادری سے لڑ کر شہید ہو گیا، اور میسور پر انگریز قابض ہو گئے۔

۱۸۰۱ء میں انگریزوں نے کرناٹک کے نواب کو پنشن دے کر کل علاقہ اپنی سلطنت میں شامل

کرلیا۔

۱۸۱۸ء تک ہندوستان کا وسیع علاقہ ستلج سے برہم پترا تک اور ہمالیہ سے کنیا کماری تک برطانوی عملداری میں شامل ہو چکا تھا، صرف مشرقی اور مغربی سرحدوں کو مستحکم کرنا باقی رہ گیا تھا، ۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے سندھ کے امیروں پر بغاوت کا الزام لگا کر سندھ کو برطانوی قلمرو میں شامل کرلیا۔

انگریز لارڈ ڈلہوزی نے اودھ کے نواب واحد علی شاہ پر سخت بدانتظامی کا الزام لگا کر ۱۸۵۶ء میں ایک لاکھ ماہوار پنشن دے کر مٹیا برج کلکتہ میں نظر بند کردیا، اور اودھ انگریزی سلطنت میں شامل ہو گیا۔

پنجاب کے حاکم سکھوں کے راجہ رنجیت سنگھ نے سکھوں کی بڑی بڑی طاقتوں کو اپنا مطیع بنالیا، اور چھوٹے چھوٹے مسلمان نوابوں سے علاقے چھین لیے، اور لاہور کو مرکز بنا کر غیر منقسم پنجاب میں سکھ سلطنت کی بنیاد ڈالی، رنجیت سنگھ ۱۸۳۹ء میں مرگیا، اس کے بعد اس کا بیٹا دلیپ سنگھ راجہ بنا ۱۸۴۹ء میں ڈلہوزی نے دلیپ سنگھ کو پنشن دے کر پنجاب کو انگریزی سلطنت میں داخل کرلیا۔

۱۸۰۶ء میں دہلی کے مغل بادشاہ شاہ عالم دوم کا انتقال ہو گیا، تو معین الدین اکبر ثانی برائے نام دہلی کا بادشاہ ہوا، جس کو انگریز پنشن دیتے تھے، اور اس کی حکومت صرف دہلی کے لال قلعہ کے اندر محدود تھی، ۱۸۳۷ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا سراج الدین بہادر شاہ ابو ظفر بارہ لاکھ روپئے سالانہ وظیفے کے ساتھ حکمراں ہوا، مگر یہ بھی ۱۸۵۷ء تک دہلی کے لال قلعہ میں محدود رہا، پھر اسے قید کرکے رنگون بھیج دیا گیا، اور وہیں کی خاک کا پیوند ہو گیا، اور اسے کوئے یار میں دو گز زمین بھی نصیب نہ ہو سکی، اور اس میں مجبور و بے بس شہنشاہ ہند کی شہنشاہی بھی ختم ہو گئی، تو انگریز مطمئن ہو کر بلا شرکت غیرے اور بغیر رکاوٹ کے پورے ہندوستان کے حکمراں ہو گئے۔

انگریزی اقتدار کے خلاف ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی زندگی میں انگریزوں کو ہندوستانیوں کی طرف سخت سورش و بغاوت کا سامنا کرنا پڑا تھا، جس میں مسلمان اور ہندو بھی شریک تھے، جسے غدر سن ستاون کا نام دیا جاتا ہے، لیکن اس بغاوت میں عام مسلمانوں کی اکثریت اور خاص طور سے علما نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس کی معقول وجہ بھی تھی کہ مسلمانوں ہی سے انگریزوں نے اقتدار چھینا تھا، اور عام مسلمانوں پر علما ہی کا سب سے زیادہ سماجی، سیاسی اور مذہبی اثر تھا، اور انھیں علما سے انگریز خائف

تھے،اس لیے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے عام مسلمانوں پر ظلم وزیادتی کرنے کے ساتھ خاص طور سے مسلم علما کو انگریزوں نے اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا،ان کے گھروں کی قرقی کی گئی،ساری جائدادیں ضبط کر لی گئیں،وطن سے بے وطن کر کے جیلوں میں قید بامشقت جھیلنے پر مجبور کیا گیا اور سرعام انھیں پھانسیاں دی گئیں،انھیں کالا پانی بھیجا گیا۔

اخیر دم تک علمانے انگریزوں کا ہر طرح کا مقابلہ کیا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتوے جاری کیے،اور مسلمانوں اور آزادی کے متوالے ہندوستانیوں کی عسکری قیادت بھی کی۔

انگریزوں نے دین ومذہب،تعلیم ومعیشت کے تمام محاذوں پر خصوصاً مسلمانوں کو کچلنے کی کوشش کی،اور انھیں ان کے اقدار وروایات،تہذیبی وتمدنی تشخص اور ایمان وعقیدے سے محروم کرنا چاہا،اور سیاسی وسماجی اور معاشرتی غلام بنانے کے ساتھ ساتھ انھیں عیسائی بنانے کی سازش کی۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے قائد اور چشم دید گواہ علامہ فضل حق خیرآبادی انگریزوں کے مذموم عزائم،گھناؤنے کارناموں اور ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی اور ظلم وستم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نصاریٰ نے شہر کے گردونواح کے رئیسوں اور سرداروں کو قتل کرنا،ان کی جائداد،عمارتیں،مویشی،مال ومتاع،ہاتھی،گھوڑے،اونٹ اور ہتھیار وغیرہ کو لوٹنا شروع کر دیا،اور ان کے اہل وعیال کو بھی قتل کر ڈالا......ان لوگوں کے پاس جو چاندی سونا نکلتا وہ چھین لیتے،پھر چادر،تہبند،قمیص،پاجامہ جو کچھ ہاتھ آتا اسے نہ چھوڑتے،......وہ ان کے لیے قتل یا پھانسی کی سزا کا فیصلہ کرتے۔[باغی ہندوستان اردو ترجمہ ص۱۵]

مزید لکھتے ہیں: سب کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی،ان کا خیال تھا کہ ان کو نہ تو ان کا کوئی مددگار ومعاون نصیب ہو سکے گا،اور نہ تو انقیاد واطاعت کے سوا انھیں سرتابی کی جرأت ہو سکے گی،یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ سب لوگ انھیں کی طرح ملحد وبے دین ہو کر ایک ہی ملت پر جمع ہو جائیں ...... پوری جانفشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب وملت کو مٹانے کے لیے طرح طرح کے حیلے سے کام لینا شروع کیا۔

انھوں نے بچوں اور نافہموں کی تعلیم اپنی زبان ودین کی تلقین کے لیے اسکول قائم کیے، اور ماضی کے علوم ومعارف اور مدارس ومکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔ [ایضاً ص ۳۱]

۱۸۵۷ء کی بغاوت، اس کے اسباب، بغاوت کی ناکامی، اس کی حشر سامانی اور غدر میں پیش پیش رہنے والے علما کی قربانیوں اور تحریک آزادی میں ان کے کردار کو جاننے کے لیے زیر نظر شمارہ میں ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم کے مقالے کا مطالعہ کیجیے۔

[پیام حرم جولائی ر ۲۰۰۷ء]

ہندوستان میں اشاعت اسلام

اور صوفیہ کا کردار

عرب و ہند کے درمیان تعارف و تعلق ظہور اسلام سے صدیوں پہلے سے پایا جاتا ہے، اور یہ تعلق بیشتر اقتصاد و معیشت اور تجارت کی وجہ سے وجود میں آیا، پھر تجارتی تعلق نے ترقی کر کے علمی و ثقافتی تعلق بھی پیدا کر دیا، پھر دونوں ملکوں اور دونوں تہذیبوں میں گوناگوں نئے نئے تعلقات پیدا ہوتے گئے۔

۱۰۰۰ ق،م میں عرب کے علاقۂ یمن کی قوم سبا بھی ہندوستان میں تجارت کرتی تھی، یہ لوگ جنوبی ہندوستان سے چمڑا، زین، جاوتری، آبنوس، کچھوے کی ہڈی، گجل، رانگا، لوبان، بید، ہاتھی کے دانت، کپڑے، ہلدی، لونگ، الائچی، سیاہ مرچ، دارچینی، ڈلی، ناریل اور املی خاص طور سے عرب لے جاتے تھے، بعض چیزوں کے ساتھ لفظ ہندی لگانے سے اس تعلق کا پتہ چلتا ہے، جیسے عود ہندی، تمر ہندی اور سیف ہندی وغیرہ، نیز بعض چیزوں کے نام عربی زبان میں ہندوستان کی سنسکرت زبان سے آئے ہیں جیسے مشک، فلفل، کافور، زنجبیل، نارجیل، قرنفل اور جانفل وغیرہ۔

یوں تو ساتویں صدی عیسوی کے اختتام پر متحدہ ہندوستان کے علاقۂ سندھ پر مسلمانوں نے باضابطہ قبضہ شروع کر دیا، جس کے بعد سے برابر بارہویں صدی عیسوی تک یہ ہندوستان پر قابض ہو کر یہیں مقیم ہو گئے، ان ہی ایام میں ایران سے پارسی بھی ہندوستان آ کر آباد ہوئے، جن کی ایک خاصی تعداد آج بھی گجرات اور ممبئی میں آباد ہے۔

جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان کی شکل ایک جزیرہ نما کی سی ہے جس کے تین جانب سمندر ہیں، مغرب میں بحر عرب، جنوب میں بحر ہند، اور مشرق میں خلیج بنگال واقع ہے۔

جنوبی ہندوستان کے حصے کو بحر عرب گھیرے ہوئے ہے، اس کے سامنے عمان، اس کے دائیں خلیج فارس اور بائیں خلیج عدن ہے، جو یمن کی بندرگاہ ہے، حضرموت گجرات کے سامنے واقع ہے، اور

بحرین خلیج فارس کا بحری مرکز ہے۔

عرب جو قبل اسلام ہی سے بحری سفر اور جہاز رانی کے شوقین اور ماہر تھے، وہ عرب کے ان ہی بحری راستوں سے بادبانی کشتیوں کے ذریعہ جنوبی ہند کے ساحلوں پر اترتے تھے، اور تجارت کرتے تھے۔

عرب و ہند کے تجارتی تعلقات کے سبب دونوں جگہ کے لوگ ایک دوسرے کے علاقوں کے سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات و واقعات سے بھی روشناس ہوتے رہے، کہتے ہیں کہ مالا بار کے راجہ زمورن سامری نے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے چاند کو دو ٹکڑے کرنے کے معجزے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور جب اسے عرب کے مسلمان تاجروں کے ذریعہ پتہ چلا کہ یہ معجزہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے اشارے سے وجود میں آیا ہے تو وہ راجہ مسلمان ہو گیا، اور حضور کی زیارت کے لیے کشتی پر سوار ہو کر عرب کی طرف روانہ ہوا، لیکن راستے ہی میں انتقال کر گیا اور لاش یمن میں دفنائی گئی۔

مستدرک للحاکم کی روایت ہے کہ مشہور صحابی حضرت سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"حضور علیہ السلام نے ہندوستان کے ایک راجہ کی طرف سے تحفے میں بھیجے ہوئے زنجبیل (سونٹھ) کا ایک ایک ٹکڑا اصحاب کو دیا، اور مجھے بھی اس کا ایک ٹکڑا کھلایا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس میں سے تناول فرمایا۔ [ج ۴/۳۵]

اسلام ایک عالم گیر، سچا اور پرکشش آسمانی مذہب ہے، اس کی تعلیمات میں ایک ایسی فطری کشش ہے، جو بندوں کو اپنی طرف مقناطیس کی طرح کھینچتی چلی گئی، اور دیکھتے دیکھتے اسلام پوری دنیا پر چھا گیا" البلاد بلاد اللہ و العباد عباد اللہ "کل ملک اللہ کا، کل بندے اللہ کے، اتنی کم مدت میں شاید ہی کوئی مذہبی تحریک مقبول عام ہوئی ہو، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ ہجرت کرتے ہی عرب کے مختلف علاقوں سے مسلمانوں کی ایک بھاری اور طاقت ور جمعیت مدینے میں اکٹھا ہو گئی اور دس برس کی مختصر مدت میں پورا جزیرۃ العرب مسلمانوں کے زیر نگیں ہو گیا۔

اور خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور میں شام و مصر اور ایران کا ایک بڑا

حصہ فتح ہو گیا۔

عہد فاروقی اور ابتدائی عہد عثمانی میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ مشرق کی طرف بڑھا، اور اسی دور میں عراق، ایران، طبرستان اور افغانستان فتح ہوئے۔

ہندوستان جو آبادی کے لحاظ سے دنیا کی آبادی کا 1/5 حصہ ہے، اسے مسلمان بھلا کس طرح نظر انداز کر سکتے تھے، اسی دور میں بعض مسلمان مجاہدین نے اشاعت اسلام کی غرض سے ہندوستان کا رخ کیا۔

مسلمان مجاہدین کا اصل مقصد ہندوستان میں بھی اسلام کی روشنی پھیلانا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیث میں غزوۂ ہند میں شرکت کی اہمیت بیان کر کے خصوصی کشش اور دل چسپی پیدا فرما دی تھی۔ مورخ اسلام مولانا محمد عاصم اعظمی لکھتے ہیں:

غزوۂ ہند کا یہ ذوق محض کشور کشائی کے جذبے سے نہیں تھا، بلکہ انھوں نے جہاد ہند کے لیے پیش رفت ارشاد نبوی کی تکمیل کے لیے کی تھی۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصابتان من امتی احرزھما اللہ من النار، عصابۃ تغزو الھند وعصابۃ تکون مع عیسیٰ بن مریم علیہ السلام"

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے دو گروہوں کو اللہ تعالیٰ نے جہنم کی آگ سے محفوظ رکھا ہے، ایک وہ گروہ جو ہندوستان میں جہاد کرے گا، اور دوسرا وہ جو حضرت ابن مریم کا ساتھ دے گا۔ (خواجہ غریب نواز، ص ۱۳)

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ۱۵ھ میں جب عثمان بن ابی العاص کو بحرین وعمان کا گورنر بنایا تو ان ہی کے حکم سے دور فاروقی میں ان کے بھائی حکم بن ابی العاص نے ممبئی کے قریبی علاقہ تھانہ پر کامیاب حملہ کیا، پھر گجرات کے شہر بھڑوچ پر فوج کشی کی اور اسی دور میں سندھ کی بندرگاہ دیبل پر دوسرے بھائی مغیرہ بن ابی العاص نے حملہ کیا۔

تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں حکیم بن جبلہ سرکاری طور سے ہندوستان آئے اور تحقیقات کے بعد واپس چلے گئے۔

۳۹ھ/۶۵۹ء میں چوتھے خلیفہ حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ الکریم کے حکم سے حارث عبدی سرحد آئے، اور یہاں کا انتظام سنبھالا ۴۴ھ/۶۶۴ء میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے مہلب بن ابی صفرہ نے بڑی خوبی کے ساتھ اس علاقے کی دیکھ بھال کی، مہلب کے بعد مختلف لوگوں نے سرحد اور سندھ کے مفتوحہ علاقوں کی انتظامی نگرانی کی۔

۸۶ھ/۷۰۵ء میں جب اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے دمشق میں عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اس وقت گورنر عراق حجاج بن یوسف ثقفی کے ماتحت بلوچستان، مکران اور سندھ کے سرحدی علاقے بھی تھے، پہلی صدی ہجری کے ربع آخر میں اسلام کی حکومت ایشیا، یورپ اور افریقہ تک پھیل چکی تھی۔

اسی دور میں سندھ کے راجہ داہر نے لنکا کے عرب تاجروں کی بیواؤں اور لنکا کے راجہ کے بھیجے ہوئے تحائف کو خلیفہ ولید بن عبدالملک کے پاس عرب لے جانے والے جہازوں کو دیبل (سندھ کی بندرگاہ) کے پاس سرکشی سے روک لیا، تو حجاج بن یوسف نے پوری تیاری کے ساتھ محمد بن قاسم ثقفی کو شیراز کے راستے سندھ بھیجا۔

اور محمد بن قاسم نے ۹۳ھ/۷۱۱ء میں دیبل پہنچ کر منجنیق کے ذریعہ دیبل کا قلعہ فتح کیا، پھر دھیرے دھیرے نیروں سمیت پورے سندھ پر قبضہ کرلیا، تین برس کے اندر کشمیر سے کچھ تک اور بحر عرب سے سرحد مالوہ، راجپوتانہ، مارواڑ اور دریائے راوی کے کنارے تک فتح کا سلسلہ دراز کرلیا۔

بغداد عباسی خلفا کی کمزوری کے باعث عباسی حکومت کے صوبوں کے حاکم خودمختار ہوتے گئے، بخارا کے حاکم اسماعیل سامانی کی موت کے بعد اس کے ایک ترک امیر الپ تگین نے غزنہ میں ایک خود مختار حکومت کی بنا ڈالی، اس کے بعد اس کا داماد سبکتگین غزنہ کا حاکم بنا، پھر اس کا بیٹا محمود غزنوی تخت غزنہ پر بیٹھا، اس نے لاہور کے راجہ انند پال اور قنوج، میرٹھ، متھرا، کالنجر، مالوہ، اجمیر، گجرات اور گوالیار کے راجاؤں کو شکست دے کر یہ سارے علاقے فتح کر لیے، محمود غزنوی انتہائی دلیر مدبر اور ذہین سپہ سالار بادشاہ تھا، یہ پہلا بادشاہ ہے، جس نے شمالی ہند میں اسلامی سلطنت کی وسیع بنیاد ڈالی، اور ہندی زبان میں اپنا سکہ جاری کیا، اس کے زوردار ناگہانی حملوں سے یہ ملک کانپ اٹھا۔

۴۱۶ھ۔۱۰۲۵ء میں اس نے سومنات گجرات پر مشہور حملہ کیا اور آگے بڑھتا چلا گیا، محمود غزنوی کی فتوحات نے اندرون ہند تبلیغ واشاعت اسلام کی راہ ہموار کی، تاریخی آثار، مساجد ومقابر اور مقامی روایات وکتبات اس امر کے گواہ ہیں کہ شمالی ہند پر شہاب الدین غوری کی فتوحات سے پہلے ہی قنوج، دہلی، اجمیر، بدایوں، میرٹھ، علی گڑھ، بنارس، منیر، اناؤ، بہرائچ، حاجی پور اور جائس میں مسلمان آباد ہو چکے تھے۔

ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملوں کا سلسلہ ۳۹۰ھ سے لے کر ۴۱۹ھ تک جاری رہا، محمود غزنوی کے نوجوان بھانجے سید سالار مسعود غازی نے محمود غزنوی کے آخری عہد میں مجاہدین کی ایک منتخب جماعت لے کر ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں تبلیغ اسلام اور جہاد کا زبردست کارنامہ انجام دیا۔

آپ نے پنجاب سے لے کر مشرقی یوپی کے علاقوں میں جوش جہاد وشہادت سے سرشار نوجوان مجاہدین کے ساتھ بہت سے سرکش مشرک راجاؤں کا مقابلہ کیا، اور فتحیاب ہوئے، اخیر میں جائس ہوتے ہوئے بہرائچ پہنچے، اس علاقے کے راجاؤں نے محاذ بنا کر متحدہ فوج آپ کے مقابلے میں اتار دی، ان سے کل تین جنگیں ہوئیں، پہلی اور دوسری جنگ میں یہ راجگان شکست کھا گئے، مگر آپ کے ساتھی مجاہدین بھی بڑی تعداد میں شہید ہوئے، ۱۳؍رجب ۴۲۴ھ کو جب تیسری جنگ شروع ہوئی، تو مقابل کی کثرت کے باوجود آپ کے ساتھی پوری جوانمردی سے لڑتے ہوئے ایک ایک کر کے شہید ہوتے رہے، اور بالآخر ۱۴؍رجب ۴۲۴ھ کو آپ بھی شہید ہو گئے۔

چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں غزنویوں کے زوال کے بعد سلطان شہاب الدین غوری حکمراں ہوا، اس کی فتوحات کے نتیجے میں ہندوستان کے اندر اسلامی حکومت کی بنیادیں مزید وسیع اور مستحکم ہوئیں، اور تقریباً ساڑھے چھ سو سال تک مسلم حکمراں ہندوستان پر حکومت کرتے رہے، اس عرصے میں پورے عظیم ہندوستان میں اسلام کی روشنی عام ہوگئی، اور یہاں کے دینی وعلمی مراکز دہلی، لاہور، اور جونپور، بغداد ونیشاپور اور غرناطہ وغزنین سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گئے۔

چھٹی صدی ہجری اسلامی ہند کی تاریخ میں اسلام کی اشاعت کے تعلق سے بے حد اہم ہے، اس صدی اور بعد کی صدی میں ہندوستان اسلامی تعلیمات کی دعوت وتبلیغ کا عالم گیر مرکز اور اسلامی علوم

وفنون کی حفاظت وترقی کا مرکزی خطہ بنا۔

اس دور میں وحشی تاتاریوں کے عالم اسلام پر حملوں اور ان کے ظلم و بربریت کے سبب بڑے بڑے اسلامی شہر جو صدیوں سے دین اور علم کے اہم ترین مراکز تھے اور جہاں بڑی بڑی روحانی خانقاہیں اور مدارس آباد تھے، تباہ و برباد ہو گئے، یہاں کا امن وسکون، نظم وانتظام، اور عزت وناموس کا جنازہ نکل گیا، کیا سمرقند و بخارا؟ اور کیا ہمدان ورے؟ کیا زنجان وقزوین؟ اور کیا مرو ونیشاپور اور خوارزم؟ حتی کہ خلافت عباسی کا مرکز دارالاسلام بغداد بھی فتنۂ تاتار سے ہل گیا، اور اس کے تار و پود بکھر گئے، ہر طرف سیاسی زوال وانحطاط، فکری واعتقادی انتشار اور علمی ادبار کا بادل چھا گیا، عزت وناموس اور ایمان واسلام اور علم کی متاع گراں مایہ کی حفاظت وصیانت کے لیے دنیا میں اگر کوئی محفوظ اور پر امن علاقہ تھا تو وہ ہندوستان تھا، یہاں تاتاریوں اور مغلوں کی دال بالکل نہیں گلی۔

اس لیے عالم اسلام کا بہترین دل ودماغ متاع ایمان وعزت اور دولت، علم وہنر کی بقاوترقی کی خاطر ایران وعراق اور ترکستان سے سیلاب کی صورت میں ہندوستان کی طرف ہجرت کر آیا، جس کے سبب بقول شخصے: دہلی ایک بین الاقوامی شہر اور رشک بغداد وقرطبہ بن گئی، نہ صرف دہلی بلکہ ہندوستان کے دوسرے شہر اور قصبات شیراز ویمن کی ہمسری کرنے لگے" ان نامور علماومشائخ اور بزرگان دین نے ہندوستان میں درس وتدریس، ارشاد وتبلیغ اور اصلاح وتربیت کی ذمہ داریاں سنبھال کر ہندوستان کو دین اور علم کے معاملے میں عالم اسلام کے ماتھے کا جھومر بنا دیا۔ اس دور میں مہاجر مشائخ وصوفیہ اور ان کے پروردہ اور جانشین بزرگوں نے خاص طور سے اپنی قوت روحانی، اپنے اعلیٰ اسلامی اخلاق واعمال کے ذریعہ اشاعت اسلام کے میدان میں جو خاص خاموش روحانی وفکری انقلاب پیدا کیا، وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

اسلامی حکمرانوں نے شمشیر وسنان کے ذریعہ بلاد ہند کو فتح کیا اور دینی دعوت اور اسلام کی اشاعت کے لیے ایک نئی وسیع زمین ہموار کی، جب کہ ان علماومشائخ اور دعاۃ وصوفیہ نے اپنی روحانی وتبلیغی مساعی اور اپنے نبوی اخلاق کی تلوار سے ہندوستان کے دلوں کی سرزمین فتح کی۔

دور فاروقی سے لے کر چھٹی صدی ہجری میں سلطان شہاب الدین غوری کے حملوں تک تمام

مسلمان فاتحین اور مجاہدین سلاطین کا بنیادی مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوۂ ہند کی بشارت والے فرمان کی بجا آوری اور ہندوستان میں وسیع پیمانے پر اسلام کی اشاعت تھا، بعد کے مسلم سلاطین میں مرور زمانہ کے ساتھ اشاعت وتبلیغ کے جذبۂ حسن کی یہ لو مدھم ہوتی گئی، اور باستثنائے چند، ان کا مقصد جہاں گیری وجہاں بانی اور دنیاداری اور جاہ پسندی رہ گیا، اس لیے مشائخ وصوفیہ نے دین کی دعوت وتبلیغ اور اصلاح وتربیت اعمال واخلاق کا فریضہ اپنے ذمہ لیا، اور درحقیقت ان ہی بزرگوں کی مخلصانہ کوششوں کے نتیجے میں آج اسلام ہم تک پہنچا، اور ہم اسلام تک، اور ہندوستان میں اسلام کی حقیقی عظمت وشوکت ان ہی کی دم قدم سے اب تک قائم ہے۔

اور آج بھی ہندوستان کے چپے چپے پر موجودہ روحانیت کے تاجدار اپنے مزاروں میں رہ کر حقیقی حکمرانی کر رہے ہیں، اسی لیے بلاتفریق دین ومذہب ہندوستانی عوام کے ساتھ ساتھ ہر دور کے ارباب حکومت ان بزرگوں کے آستانوں پر حاضر ہوکر بطور شکرانہ جبین عقیدت ونیاز جھکاتے رہے ہیں۔

ہندوستان میں اشاعت اسلام میں سب سے نمایاں کردار حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری علیہ الرحمۃ والرضوان کا ہے، جن کے قدم کی برکت سے ہندوستان پر مسلم فاتحین وسلاطین کے قدم جمے، ان بزرگوں نے غیر مسلم راجاؤں اور ہندو جوگیوں، دونوں کا بیک وقت مقابلہ کیا، اور اپنی روحانی طاقت سے متاثر ہی نہیں کیا، بلکہ انھیں قبول اسلام پر بھی مجبور ہونا پڑا، اس طرح ان غیر مسلم سیاسی ومذہبی حکمرانوں کے زیر اثر رعایا لاکھوں کی تعداد میں مسلمان ہوئی۔

آپ کو ہندالولی، عطائے رسول، اور سلطان الہند کہا جاتا ہے، اس لیے کہ آپ وارث النبی فی الہند ہیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی حکم اور اپنے پیر کی ہدایت پر آپ تبلیغ اسلام کے لیے ہندوستان تشریف لائے تھے۔

ہندوستان کی فتح سے پہلے چاروں مشہور روحانی سلسلوں سلسلۂ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ کے بزرگان دین ہندوستان آکر اپنا کام شروع کر چکے تھے، اور ہر سلسلے کے بزرگوں نے یہاں اشاعت دین کا کام کیا، خاص طور سے لاہور میں سید اسماعیل بخاری، حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری

مشرق سندھ میں سید جلال بخاری، پنجاب میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت، کچھ اور گجرات میں امام شاہ پیرانوی، ملک عبداللطیف، بنگال میں جلال الدین تبریزی، اخی سراج الدین اودھی، علاء الحق پنڈوی کشمیر میں بلبل شاہ اور سید علی ہمدانی، دہلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، اور خواجہ نظام الدین، دیار پورب میں مخدوم اشرف سمنانی، بہار میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، جنوبی ہند میں بندہ گیسو دراز علیہم الرحمہ نے اپنی دعوت و روحانیت سے ان علاقوں میں دینی انقلاب پیدا کیا۔

ان بزرگ صوفیۂ کرام کی تبلیغی مساعی، ان کے اخلاص و استقلال، توکل و قناعت، محنت و مجاہدہ، ایثار و قربانی اور ان کے درد و سوز کی بدولت ہندوستان کی سرزمین ایمان و عرفان اور توحید کے نغموں سے گونج اٹھی، اور یہاں کی فضاؤں سے اذان کی صدا سنائی دینے لگی۔

سیر الاولیا کے مصنف ہندوستان میں تبلیغ اسلام کے باب میں بزرگان دین کی زبردست کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مملکت ہندوستان تاحد بر آمدن آفتاب همه دیار کفر و کافری و بت پرستی بود، ومتمردان هند هر یکے دعوائے انا ربکم الاعلیٰ می کردند وخدائے را جل وعلا شریک میگفتند وسنگ و کلوخ ودار ودرخت دستور و گاؤ و سرگین آں را سجده می کردند وبظلمت قفل دل ایشان مظلم ومحکم بود"

همه غافل از حکم دین و شریعت | همه بے خبر از خدا و پیمبر
نه هرگز کسے دیده نهجار قبله | نه هرگز شنیده کس الله اکبر

وصول قدم مبارک آں آفتاب اهل یقین که به حقیقت معین الدین بود ظلمت ایں دیار بنور اسلام روشن ومنور گشت۔

از تیغ او بجائے صلیب وکلیسا | در دار کفر مسجد ومحراب ومنبر است
آنجا که بود نعره و فریاد مشرکاں | اکنوں خروش نعرۂ الله اکبر است

وهر که ازیں دیار مسلمان شد وتاروز قیامت مسلمان خواهد شد وفرزندان ایشاں تاتوالد وتناسل است مسلمان خواهند بود وآں طائفه را که به تیغ اسلام از دار

حرب در دار اسلام خواھند آورد الیٰ یوم القیامۃ مثوبات آں بارگاہ باجاہ شیخ الاسلام معین الدین حسن سجزی قدس اللہ سرہ العزیز بمتابعت حضرت او واصل ومتواصل خواھند بود انشاء اللہ العزیز (سیر الاولیاء ص ۴۷)

ملک ہندوستان اپنے آخری مشرقی کنارہ تک کفر وشرک کی بستی تھی، اہل تمرد" انا ربکم الاعلیٰ" کی صدا لگا رہے تھے اور خدا کی خدائی میں دوسری ہستیوں کو شریک کرتے تھے، اور اینٹ، پتھر، درخت، جانور، گائے و گوبر کو سجدہ کرتے تھے، کفر کی ظلمت سے ان کے دل تاریک اور مقفل تھے، سب دین وشریعت کے حکم سے غافل، خدا و پیمبر سے بے خبر تھے، نہ کسی نے کبھی قبلہ کی سمت پہچانی، نہ کسی نے اللہ اکبر کی صدا سنی، آفتاب اہل یقین حضرت خواجہ معین الدین علیہ الرحمہ کے قدم مبارک کا اس ملک میں پہنچنا تھا کہ اس ملک کی ظلمت نور اسلام سے متبدل ہوگئی، ان کی کوشش وتاثیر سے جہاں شعائر شرک تھے، وہاں مسجد ومحراب ومنبر نظر آنے لگے، جو فضا شرک کی صداؤں سے معمور تھی، وہ نعرہ اللہ اکبر سے گونجنے لگی۔

اس ملک میں جس کو دولت اسلام ملی، اور قیامت تک جو بھی اس دولت سے مشرف ہوگا، نہ صرف وہ بلکہ اس کی اولاد در اولاد ونسل در نسل سب ان کے نامۂ اعمال میں ہوں گے اور اس میں قیامت تک جو بھی اضافہ ہوتا رہے گا اور دائرۂ اسلام وسیع ہوتا رہے گا، قیامت تک اس کا ثواب شیخ الاسلام معین الدین حسن سجزی کی روح کو پہنچتا رہے گا۔

[پیام حرم اگست ۲۰۰۷ء]

علامہ تحسین رضا بریلوی کا وصال

صدر العلما حضرت علامہ تحسین رضا خان قادری بریلوی بن علامہ حسنین رضا خان قادری بن استاذ زمن مولانا حسن رضا خان بریلوی برادر اعلیٰ حضرت علیہم الرحمہ کے حادثاتی سانحۂ ارتحال نے خانوادۂ رضویہ بریلی شریف اور جماعت اہل کے ایک ایک فرد کو ایک دم سکتے میں ڈال دیا، اس عظیم ناگہانی حادثے نے ہر سننے والے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اولاً اس خبر پر یقین نہیں آرہا تھا، لیکن جو کچھ سنایا گیا وہ حقیقت میں صحیح تھا۔

۱۸ رجب ۱۴۲۸ھ، ۳ اگست ۲۰۰۷ء بروز جمعہ تقریباً چار بجے شام محب محترم عزیز سعید مولانا محمد شاہد رضا علیمی استاذ جامعۃ الرضا بریلی شریف نے موبائل پر ناچیز کو اس حادثے کی اطلاع دیتے ہوئے کہا: آج ۱۱ بجے دن میں حضرت علامہ تحسین رضا خان قادری کا وصال ہوگیا، آپ اپنے ایک عزیز مولانا ظہیر رضا خان اور کچھ عقیدت مندوں کے ساتھ بولیرو گاڑی سے شہر ناگپور سے چندر پور جا رہے تھے، جہاں آپ کو نماز جمعہ کی امامت کرنی تھی، موقع واردات پر ہی حضرت کی روح پرواز کر گئی، اور آپ کے عزیز بھی چل بسے۔

دوسرے دن آپ کی میت بذریعۂ طیارہ ناگپور سے دہلی لائی گئی، اور پھر وہاں سے ایمبولینس کے ذریعے شام چھ بجے بریلی پہنچی، تیسرے دن ۲۰ رجب، ۵ اگست کو دوپہر بعد اسلامیہ انٹر کالج بریلی شریف کے وسیع میدان میں نماز جنازہ پڑھی گئی، جس میں ملک کے گوشے گوشے سے اور بیرون ملک سے لاکھوں فرزندان اسلام نے شرکت کی، نماز جنازہ کا مجمع عرس رضوی کا منظر پیش کر رہا تھا، آپ کی نماز جنازہ نے آپ کی خاموش شخصیت کی عظمت واہمیت اور مقبولیت ومحبوبیت سے پردہ اٹھا دیا، میرا خیال ہے کہ آپ کی زندگی میں شاید بہت کم ہی لوگوں کو آپ کی حقیقی عظمت کا پتہ رہا ہو۔

تاج الشریعہ علامہ اختر رضا خان قادری ازہری دامت برکاتہم العالیہ نے نماز جنازہ کی امامت فرمائی، حادثاتی موت، خاندان رضویہ سے تعلق، اور اس پر مزید علم وفضل اور تقدس وتقویٰ جیسی ذاتی

خوبیوں نے آپ کی آخری رسوم میں شرکت پر بہتوں کو مجبور کر دیا۔ ملک کے گوشے گوشے سے اور بیرون ملک کے بے شمار لوگ ایک بڑی سعادت سمجھ کر شریک نماز جنازہ ہوئے اور اپنے محبوب رہنما کو خراج عقیدت پیش کیا، دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی سے بھی اساتذہ وطلبہ پر مشتمل ایک وفد نے شرکت کی سعادت حاصل کی، دوسرے دن دارالعلوم علیمیہ میں قرآن خوانی اور ایصال ثواب کی مجلس منعقد کی گئی، جس میں اساتذہ وطلبہ نے شرکت کی، میں اپنی علالت کے باعث شریک نماز جنازہ نہ ہو سکا، جس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔

آپ انتہائی مرنجان مرنج شخصیت کے مالک تھے، آپ نے اپنے اخلاق عالیہ، خاموش طبعی، شرافت نفسی اور تقویٰ وطہارت اور بے انتہا سادگی کی وجہ سے ملنے والوں کے دلوں پر گہرا نقش چھوڑا ہے۔

آپ علم وعمل، طہارت وتقویٰ اور عمر میں خانوادۂ رضویہ کے موجودہ علما میں سب سے بزرگ عالم دین اور محبوب ترین وقابل قدر ہستی تھے، جس کا عام احساس اب سب کو ہو رہا ہے۔

آپ ۱۴رشعبان ۱۹۳۰ء کو محلہ سوداگران بریلی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم شہر بریلی کے ایک مدرسے میں حاصل کی، پھر دارالعلوم مظہر اسلام بریلی اور جامعہ رضویہ منظر اسلام بریلی میں عربی کی تکمیل تعلیم حاصل کی، حضرت مفتی اعظم ہند کے حکم پر فراغت سے قبل ۱۹۵۲ء ہی میں دارالعلوم مظہر اسلام میں تدریس کا آغاز کر دیا۔

پھر اپنے والد ماجد علامہ حسنین رضا خان علیہ الرحمہ کی خواہش پر ۱۹۵۶ء میں پاکستان جا کر جامعہ رضویہ مظہر اسلام فیصل آباد میں محدث اعظم پاکستان علامہ شاہ محمد سردار احمد رضوی علیہ الرحمہ کے پاس دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

وہاں سے واپس آ کر دارالعلوم مظہر اسلام بریلی میں پھر درس کا سلسلہ شروع کر دیا، اور ۱۹۷۲ء تک درس دیتے رہے، اس کے بعد دو سال صدر المدرسین کے فرائض بھی انجام دیے۔

پھر ۱۹۷۵ء میں صدر المدرسین بن کر منظر اسلام آ گئے، یہاں ۱۹۸۲ء تک تدریسی خدمات انجام دیں۔

علامہ تحسین رضا بریلوی کا وصال

۱۹۸۲ء میں جامعہ نوریہ رضویہ بریلی کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث کی حیثیت سے کام کرتے رہے، علامہ ازہری مدظلہ العالی نے اپنے قائم کردہ ادارہ جامعۃ الرضا بریلی میں صدر المدرسین کے عہدے پر بلالیا اور تادم آخر یہیں پر تدریسی خدمت انجام دی۔

۱۹۸۶ء میں حج وزیارت سے مشرف ہوئے، مفتی اعظم ہند سے بیعت تھے اور انھیں سے اجازت وخلافت بھی حاصل تھی۔

حضرت مفتی اعظم ہند بھی آپ کی خوبیوں کو سراہتے تھے، ایک بار فرمایا:

"صاحب (یعنی علامہ حسنین رضا خان علیہ الرحمہ) کے جتنے لڑکے ہیں، سبھی خوب ہیں، باصلاحیت وبالیاقت ہیں، مگر ان میں تحسین رضا کا جواب نہیں"۔ [مفتی اعظم اور ان کے خلفا/۲۶۵]

آپ نے زندگی بھر تدریس کا کام کیا اور یگانۂ روزگار علما وفضلا پیدا کیے، شعروشاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے۔

اخیر عمر میں درویشی اور رجوع الی اللہ کا غلبہ ہوگیا تھا، سفر بہت کم کیا، لیکن زندگی کے آخری دور میں عقیدت مندوں کے شدید تقاضوں پر سفر کرنے لگے تھے، کئی مرتبہ دوبئی اور افریقہ کا سفر بھی فرمایا اور بہتوں کو سلسلۂ رضویہ میں داخل کیا۔

فقیر کو زندگی میں آپ سے دو بار زیارت وملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

ایک بار کوئی سات آٹھ سال پہلے دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی کے سالانہ جلسۂ دستار بندی اور جشن ختم بخاری شریف کے موقع پر غالباً ۲۰۰۰ء میں جمدا شاہی میں اور دوبارہ عرس رضوی کے موقع پر جامعہ نوریہ رضویہ بریلی شریف میں۔ ان دونوں ملاقاتوں اور ان مواقع کی مختصر گفتگو اور آپ کی شخصیت کے سرسری مطالعے نے مجھے آپ سے بہت زیادہ متاثر اور قریب کردیا، اور گویا میں انھیں کا ہوکر رہ گیا، آپ کا سراپا آج بھی اسی طرح آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔

میں اگرچہ آپ کی شخصیت کا بہت گہرا مطالعہ تو نہیں کرسکا، لیکن آپ کو سمجھنے کے لیے یہی دو مختصر ملاقاتیں کافی ثابت ہوئیں، ایک خاص بات جو میں نے محسوس کی، وہ یہ تھی کہ آپ کے اندر خوردنوازی اور قدردانی کا وصف بھرپور طور سے تھا، اس کا اندازہ اس بات سے ہوا کہ میں نے بریلی

ملاقات سے قبل بدایوں شریف کے علامہ شاہ عبد القادر بدایونی اور اعلیٰ حضرت کے تعلق سے جشن صد سالہ کے موقع پر منعقدہ سیمینار کے لیے مقالہ لکھا تھا، جو ماہنامہ ''مظہر حق'' بدایوں میں چھپا بھی تھا، اسے حضرت علیہ الرحمہ نے کہیں پڑھ لیا تھا، ملتے ہی آپ نے اس مضمون کا تذکرہ فرمایا، پسندیدگی کا اظہار کیا، اور کلمات تحسین سے نواز کر حوصلہ افزائی فرمائی اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

مجھ ہیچ مداں کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی، ورنہ آج کے دور میں ایک مضمون لکھنے پر کون کس کو سراہتا ہے، وہ بھی ایک بہت چھوٹے آدمی کو ایک بہت بڑا شخص، یہ صرف اور صرف ان کا بڑکپن تھا۔

ان اوصاف عالیہ کے مالک بزرگ ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں، اور بزم ہستی سونی ہوتی جا رہی ہے۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

صدمے ہی صدمے

جولائی اور اگست ۲۰۰۷ء کے مہینوں برصغیر میں اہل سنت کی علمی و دینی شخصیات کی وفات کا ایک سلسلہ قائم رہا ہے۔ جس سے اہل سنت کا حلقہ مسلسل سوگ کی حالت میں ہے۔ اس دوران ہندو پاک کے کئی نامور اور مقتدر علمائے دین اور قرائے کرام نے عالم فانی کو الوداع کہا۔

۷؍ جولائی ۲۰۰۷ء کو دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی کے درجۂ اولی کے ایک ہونہار طالب علم حافظ عبد التحسین بہرائچی اپنے وطن نانپارہ سے آتے ہوئے بستی ریلوے اسٹیشن پر حادثے کا شکار ہو کر موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے، اس ناگہانی واقعے نے پورے ادارے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، بذات خود میں بھی بہت زیادہ متاثر ہوا، اور اس صدمے سے اب تک دوچار ہوں، مولیٰ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرما کر ان کے درجات بلند فرمائے، اور ہم سوگواروں سمیت ان کے تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مرحوم نہایت شریف، ذہین اور محنتی طالب علم تھے، دو نشستوں میں پورا قرآن شریف ختم کر لیتے تھے۔

جولائی ہی میں میرے وطن کے تعلیمی ادارے شمس العلوم گھوسی ضلع مئو کے پرانے خادم اور نہایت شریف و سنجیدہ عالم دین حضرت مولانا شمس الدین صاحب اعظمی سابق ناظم اعلیٰ و سابق صدر شمس العلوم گھوسی نے لمبی بیماری کے بعد اچانک انتقال فرمایا۔

اسی دوران پاکستان کے دو اہم علمائے دین، مشہور مصنف و خطیب مولانا ابوالنور بشیر کوٹلی لوہاران اور مولانا غلام یسین اعظمی گھوسوی طیر کراچی نے بھی وصال فرمایا۔

پھر ۵ راگست کو خانوادۂ رضویہ کے مشہور محدث علامہ تحسین رضا خان قادری بریلوی کا وصال ہوا۔

پھر چند دنوں بعد مولانا یونس فیضی صدر المدرسین جامعہ سراج العلوم لطیفیہ تہال گڑھ سلطان پور نے طویل علالت کے بعد انتقال فرمایا۔

۱۰ راگست کو دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی کے سابق شیخ التجوید و التحفیظ حضرت قاری حافظ عبد الحکیم عزیزی نے تقریباً ۹ رسال فالج شدہ ہو کر وصال فرمایا۔

پھر اطلاع ملی کہ کانپور کے قاضی شہر حضرت مولانا قاری عبد السمیع صاحب کانپوری بھی رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جماعت کے ان علما و قرا کی وفات سے جہاں پوری جماعت مغموم ہے، وہیں جماعت کا ایک بڑا اور اہم ادارہ ہونے کی حیثیت سے دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی کی فضاؤں میں بھی رنج و غم اور سوگ و ماتم کا ماحول چھایا رہا اور ان پیہم حوادث سے تمام اساتذہ و طلبہ متاثر ہوئے، کئی بار اجتماعی قرآن خوانی ہوئی، اور تعزیتی مجلسیں منعقد کی گئیں، اور ان مرحومین کی روحوں کو ایصال ثواب کر کے خراج عقیدت پیش کیا گیا:

یہ تمام مرحومین اپنی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتے تھے، اور تعلیم و تبلیغ دین اور قوم و ملت کی خدمت کا شاندار ریکارڈ ان سے وابستہ ہے۔

مولیٰ تعالیٰ ان بزرگوں کو اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے، اور ان کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے، اور جماعت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔ [پیام حرم ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۷ء]

آہ! شرف ملت

اہل سنت کے علمی اور دینی حلقوں میں یہ خبر انتہائی حسرت وافسوس کے ساتھ سنی گئی کہ شرف ملت علامہ عبدالحکیم شرف قادری [پ ۱۹۴۴ء] سابق شیخ الحدیث وصدرالمدرسین جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور ۱۸/ شعبان المعظم ۱۴۲۸ھ/ یکم ستمبر ۲۰۰۷ء کو چند سالہ علالت کے بعد تریسٹھ سال کی عمر پا کر لاہور میں انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ع　کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

آپ ایک سادہ، سنجیدہ، بے نفس شخصیت کے مالک، کام سے کام اور دین کا سچا درد رکھنے والے مخلص اور سچے متبع سنت وشریعت اور اصول ومعمول کے حد درجہ پابند بزرگ عالم دین تھے۔

آپ مدرس ومفتی بھی تھے اور مصنف ومترجم بھی، آپ مبلغ وداعی بھی تھے اور امام وخطیب بھی، آپ مورخ وتذکرہ نگار بھی تھے، اور محدث ومحقق بھی، مزید یہ کہ اشاعت کتب آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا، درجنوں تصنیفی واشاعتی اداروں اور اکیڈمیوں سے تعلق تھا، جن میں مرکزی مجلس رضا لاہور، رضا اکیڈمی لاہور، رضا دارالاشاعت لاہور، الممتاز پبلیکیشنز لاہور، مرکز تحقیقات اسلامیہ لاہور، اور ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، خود بھی نجی ملکیت کا ایک خودمختار اشاعتی ادارہ مکتبہ قادریہ لاہور چلاتے تھے، سنی رائٹرز گلڈ پاکستان کے صدر بھی رہے۔ خود بھی لکھتے، چھاپتے تھے اور دوسروں کو ترغیب ورہنمائی اور ہر ممکن امداد وتعاون بھی دیتے تھے، شخصی وجماعتی تنازعات سے بہت دور ونفور اور ممکنہ حد تک اتحاد وہم آہنگی برقرار رکھتے ہوئے ساتھیوں کے ساتھ ہو کر اور انھیں ساتھ لے کر کام کرنے کے عادی اور انتشار وافتراق یقینی ہونے کی صورت میں خاموشی کے ساتھ الگ ہو کر کام کرنے کے خوگر تھے، یقیناً اس وصف کو اس دور بلا میں انتہائے شرافت، کمال اخلاص وبزرگی اور انداز مومنانہ ہی کہا جا سکتا ہے، جو اس دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ آپ کی زندگی خاص طور پر آج کے علما وطلبہ کے لیے مثالی اور نمونۂ عمل ہے۔

میں دور حاضر کے موجودہ علمائے ہند وپاک میں بلندیٔ فکر ونظر، مثالی کردار وعمل، مومنانہ

طرزِ حیات، عالمانہ انداز، اور مخلصانہ مسلسل دینی وعلمی خدمات، قدردانی وقت، اور اصول ومعمول کی پابندی اور روحانی عظمتوں کے سبب جن شخصیتوں سے بہت زیادہ متاثر ہوا، ان میں شرف صاحب قبلہ سرفہرست ہیں، مولیٰ تعالیٰ ان کے اوصاف کے حامل امثال پیدا فرمائے۔ آمین! ثم آمین۔

آپ کا ذہن بچپن ہی سے مذہبی تھا۔ خود لکھتے ہیں:

''بچپن میں یہ سوچا تھا کہ بڑا ہو کر بندۂ مومن بنوں گا، مدرس بنوں گا، خادم دین بنوں گا، اور تصنیف واشاعت کے ذریعہ مسلک اہل سنت کی خدمت کروں گا''۔ [محسن اہل سنت ص ۳۸]

الحمدللہ اس ننھی مومنانہ سوچ کے مطابق بڑی ہی لگن اور اخلاص ومحنت سے محدث اعظم پاکستان علامہ سردار احمد گورداس پوری، علامہ اشرف سیالوی، علامہ غلام رسول رضوی اور پاکستان کے مدرس علی الاطلاق، ملک المدرسین علامہ عطا محمد بندیالوی، جیسے اکابر علماء سے علوم عقلیہ ونقلیہ کی بھرپور تحصیل کی، اور علم دین کا وافر حصہ اور علمی فیض حاصل کیا، اور علم کے ہتھیار سے لیس ہو کر درسگاہ سنبھالی۔

۱۹۶۵ء میں جامعہ نعیمیہ لاہور سے تدریسی سفر شروع کیا، پھر جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور میں پہلی بار سال بھر رہے، پھر دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف، جامعہ اسلامیہ رحمانیہ ہری پور ہزارہ اور مدرسہ اشاعت الاسلام چکوال میں چند سال گذار کر دوبارہ ۱۹۷۳ء میں جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور میں صدر مدرس بن کر آ گئے، حدیث میں ابوداؤد شریف خاص طور سے آپ کو تدریس کے لیے دی گئی، پھر شیخ الحدیث بنا دیے گئے، اور ۱۹۸۳ء سے لے کر چند سال پہلے تک شیخ الحدیث کی حیثیت سے بخاری شریف کا درس دیا اور علم حدیث اور دیگر فنون میں اپنے علمی جوہر دکھائے، اور بے شمار باصلاحیت شاگرد پیدا کیے۔

آپ نے تدریس اور تصنیف واشاعت کو دین کی خدمت کا ذریعہ بنایا، اور اردو، عربی، فارسی زبانوں میں درجنوں کتابیں لکھیں اور علمائے اہل سنت کی کتابوں کی اشاعت کی تصنیف واشاعت کی طرف خصوصی توجہ کی۔

اس کی داعی ایک بدمذہب مقرر کی تقریر بنی، جس نے علمائے اہل سنت کو عار دلاتے ہوئے کہا تھا: تمہارے مدارس میں وہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، جن پر ہمارے علما نے حواشی لکھے ہیں، تمہارے علما

نے علمائے دیوبند کی مخالفت کے سوا کیا کام کیا ہے؟ دیوبندی مولوی کی بات آپ کے دل کو لگ گئی ،اور تصنیف وتحریر اور نایاب کتب کی اشاعت کی طرف آپ نے عنان توجہ ایسی موڑی کہ تاحیات اس کام سے جڑے رہے،اور اس باب میں حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا۔

آپ اردو کے ساتھ فارسی وعربی لکھنے اور بولنے میں پوری مہارت رکھتے تھے،الحدیقۃ الندیہ پر عربی مقدمہ اور احسان الٰہی ظہیر غیر مقلد کی کتاب ''البریلویہ'' کے جواب میں آپ کی عربی تصنیف'' من عقائد اہل السنۃ'' اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے،علامہ ارشد القادری نے اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''بڑا ہی پر مغز، جاندار،فکر انگیز اور معلوماتی مقدمہ ہے،زبان سے بھی عجمیت نہیں ٹپکتی''

آپ نے عالم عرب اور علمائے عرب سے علمی روابط پیدا کرنے میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا ،جامع ازہر مصر کا بھی دورہ فرمایا،اور علمائے ازہر اور دیگر ملکوں کے عرب علما سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بغیر مرعوبیت کے تبادلۂ خیال اور علمی بحثیں کیں۔

۱۹۹۸ء تک کے اعداد وشمار کے مطابق آپ کے مطبوعہ عربی کتب ومقالات کی تعداد ۱۲ ر ہے۔جب کہ قاضی مبارک ،مطول،اور صدرا سمیت سات عربی کتابوں پر حواشی لکھے، ۲۲ ر عربی کتابوں پر وقیع مقدمات تحریر فرمائے ،تین اردو کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا،انیس عربی کتابوں کو اردو میں منتقل فرمایا،پانچ فارسی کتب پر مقدمات اور اشعۃ اللمعات چہارم ،پنجم ،ششم ،سمیت سات فارسی کتابوں کے اردو ترجے فرمائے ،پانچ فارسی کتب پر اردو میں حاشیے لکھے،اردو مقالات کی تعداد سینتالیس (۴۷) ہے۔ایک سو انسٹھ اردو مقدمات ،تقریظات اور پیش لفظ لکھے،اور مختلف زبانوں میں مختلف سیمناروں اور جلسوں میں اٹھارہ مقالات پڑھے،اخیر میں ترجمۂ قرآن کیا اور اسی پر خاتمہ بالخیر ہوا۔

جس نے زندگی بھر لکھا ہو،اور بلاناغہ روزانہ کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہو ،اور اپنی نگارشات اور بزرگوں کی تحریرات کی اتنی اشاعت کی ہو،اگر زندگی ہی میں اس کے حالات وخدمات پر تحریریں لکھی اور شائع کی جانے لگیں،تو یہ اس کا حق ہے،جو قدر دانوں پر واجب ہے۔

چنانچہ آپ کی حیات ہی میں آپ کی شخصیت اور خدمات پر مقالات اور کتابوں کی صورت میں کئی تحریریں شائع ہوئیں، جنھیں آپ نے ملاحظہ بھی فرمایا، اور دنیا کے قدر دانوں کی قدر دانی سے خوش ہو کر دنیا سے تشریف لے گئے، جب کہ بعد وصال عالم آخرت میں حقیقی اور شایان شان قدر دانی اور نعمت ارزانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو رہی ہوگی، اُس دنیا میں بھی آپ یقیناً شاد کام ہوں گے، اور یہی اصل کامیابی وشاد کامی اور قدر دانی ہے، اللہ ہم سب کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے اور حضرت شرف صاحب کے طریقے پر چلائے۔

چودہویں صدی ہجری میں مسلک اہل سنت کے دفاع وحمایت، ناموس رسالت کی حفاظت اور تحریک عشق رسول کے سب سے بڑے علم بردار اور محقق علی الاطلاق شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور عہد رسالت سے لے کر اپنے دور تک کے حقیقی وارثان علم نبوت کے صحیح ومتوارث اسلامی عقائد ونظریات کے حامل وحامی اکابرین واساطین دین کی فکر وعمل کے ترجمان امام احمد رضا حنفی قادری محدث بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات اور ان کے پاکیزہ وصالح مشن کے تعارف اور سنجیدہ علمی واستدلالی انداز میں ان کے فکر کی عالمی سطح پر اشاعت کے سلسلے میں شرف صاحب کی خدمات آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں، امام احمد رضا قدس سرہ کے تحریری سرمائے اور ان پر کتب ورسائل کی تصنیف واشاعت کے باب میں جن لوگوں کو اولیت کا درجہ حاصل ہے، ان میں آپ کا نام نامی اسم گرامی سرفہرست ہے۔ فکر رضا سے گہری وابستگی ہی نے ان کو اس کام پر آمادہ کیا، اور اس کی وجہ سے ہی محدث بریلوی کے خلیفہ حضرت ابوالبرکات علامہ سید احمد قادری علیہ الرحمہ کے ہاتھ پر سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی، اور اپنے ابتدائی عہد خدمت اشاعت ۱۹۶۸ء میں مکتبہ رضویہ قائم کر کے محدث بریلوی کے محبّ خاص علامہ احمد حسن کانپوری علیہ الرحمہ کا نایاب حاشیہ شرح سلم العلوم شائع فرمایا۔

پھر اعلیٰ حضرت کے عربی رسائل "الحجۃ الفائحۃ"، "اتیان الارواح" اردو میں ترجمہ کر کے ہری پور ہزارہ سے شائع کیے۔ اعلیٰ حضرت کے تعارف پر مشتمل کتاب "یاد اعلیٰ حضرت" لکھ کر اس وقت شائع کیا، جب کہ شاید ہی کوئی کتاب اس موضوع پر شائع ہوئی ہو۔

صوبہ سرحد میں آپ ہی کی تحریک پر یوم رضا منانے کی بنیاد پڑی، مرکزی مجلس رضا سے اساسی

حیثیت کا انتظامی وقلمی اور اشاعتی ربط وتعلق پھر رضا اکیڈمی لاہور کی سرپرستی، اور اس کے بعد رضا دارالاشاعت کی علمی وقلمی سرپرستی اور تعاون فروغ رضویت میں آپ کی زبردست حصہ داری کی واضح دلیلیں ہیں۔

آپ نے اپنے تینوں صاحبزادگان مولانا ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی مولانا مشتاق احمد قادری حافظ نثار احمد قادری کو بھی دینی تعلیم سے آراستہ کر کے تعلیم، تصنیف وتحقیق اور نشر واشاعت کے کام میں لگایا، بڑے صاحبزادے مولانا ممتاز احمد سدیدی مدرسے کے عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ عصری علوم والسنہ سے بھی مالامال ہیں، جامع ازہر میں بھی تعلیم حاصل کی ہے، اور اس سے پہلے اسلام آباد کی اسلامی یونیورسٹی سے گریجویشن بھی کیا ہے، اس وقت فیصل آباد کی یونیورسٹی میں تدریس کا کام کر رہے ہیں، اردو اور عربی کے اچھے صاحب قلم اور محقق ہیں، کئی کتابیں لکھ چکے ہیں اور اپنے والد کے مشن کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

حضرت شرف صاحب اسلام اور مسلمانوں کی دنیوی واخروی فلاح و بہبود، ان کی سیاسی، سماجی، اخلاقی، عملی، معاشی اور تعلیمی ترقی کے لیے بھی فکر مند رہتے تھے، ان کے سینے میں قوم وملت کے لیے دھڑکتا ہوا دل تھا ان کے تذکروں میں یہ تو ملتا ہے کہ انھوں نے صوبہ سرحد میں جمعیۃ علماے پاکستان کی بنا ڈالی، اور اس کے لیے راہیں ہموار کیں، اور اہل سنت کی سیاسی بالادستی کے لیے کچھ دنوں کام بھی کیا، مگر سرگرم سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا۔

البتہ پاکستان کی تحریک تحفظ ختم نبوت اور تحریک نظام مصطفیٰ میں ضرور کردار ادا کیا، اور طلبہ وعلما اور نوجوانوں میں تحریک وترغیب پیدا کی، اور موقع بہ موقع ان کی قیادت ورہنمائی فرمائی۔

حضرت شرف صاحب کی ہشت پہل شخصیت کا روحانی پہلو بھی کچھ کم اہم اور کم تابناک نہیں ہے۔ وہ ایک قلب صافی رکھتے تھے، جس میں اخلاص وللہیت کے جلوے آباد تھے، وہ اخلاص، تقویٰ، شرعی احتیاط، سنت وشریعت کی سخت پابندی کے باعث عمل صالح اور اخلاق وعادات میں قدیم بزرگوں کے پرتو تھے، بغض وحسد، غیبت وچغلی اور دوسری عام سماجی واخلاقی برائیوں سے حد درجہ گریزاں رہے۔

سادگی، سنجیدگی، عجز وانکسار، چھوٹوں پر شفقت، بڑوں کے ادب واحترام میں مثالی شخصیت

تھے، کسی کی برائی اور بے جا تنقید نہ کرتے تھے، نہ سننا پسند کرتے تھے نظریاتی غلو اور فکری وعملی بے اعتدالی سے اعتقاداً اور عملاً ہمیشہ فاصلہ بنائے رکھا۔

فکر وعمل کی پاکیزگی، اخلاق وعادات کی بلندی، خدمت دین کے سچے مخلصانہ جذبے، اصلاح وتبلیغ کی جدوجہد، احساس بندگی اور عشق رسالت نے ان کے باطن کو جلا بخش دی تھی، اور ان کے دور کے اکابر اور بزرگ ان کی دینی خدمات کے قائل اور ان میں روحانی بادشاہی کی جھلک محسوس کرتے تھے شارح بخاری علامہ مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ نے ایک موقع پر فرمایا:

''وہ (شرف صاحب) تقریر کے بھی بادشاہ ہیں تحریک کے بھی بادشاہ ہیں، تدریس کے بھی بادشاہ ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے چاہا تو روحانیت کے بھی بادشاہ ہوں گے [محسن اہل سنت ص ۱۷۵]

حضرت شرف صاحب بحر العلوم علامہ مفتی عبد المنان صاحب اعظمی دامت برکاتہم العالیہ کے پسندیدہ لوگوں میں تھے، ایک مرتبہ آپ نے حضرت شرف صاحب کے بارے میں فرمایا، لاہور میں مجھے جو لوگ پسند آئے ان میں آپ [شرف صاحب] کی ذات بھی ہے اپنی وضع قطع، متانت وسنجیدگی، علم وفضل، اور کام کی وسعت وگہرائی غرض کہ ہر لحاظ سے آپ خوب سے خوب تر ہیں، مجھے قوی امید ہے کہ ان شاء اللہ آگے چل کر آپ بھی بزرگان سلف کی یادگار ہوں گے۔ [ایضاً ص ۲۹۰]

حضرت شرف صاحب نے پیری مریدی کا دھندا نہیں کیا اور روحانیت کا شوروم نہیں سجایا، بلکہ ہمیشہ علم ظاہر کے پردے میں اپنے علم باطن اور اپنی روحانیت کو چھپائے رکھا، فقیر نے ایک بار کریدنا چاہا تو بڑی انکساری کے ساتھ ایک مکتوب میں بات کا رخ موڑتے ہوئے جواباً تحریر فرمایا:

''فقیر تو خود روحانیت کی کسی منزل تک نہیں پہونچ سکا، دعا فرمائیں مولائے کریم احسان وحضوری کے مقام تک پہنچائے، اللہ کریم راضی ہو اور اس کے حبیب کریم ﷺ راضی ہوں، فقیر آپ کو ان تمام علوم دینیہ، حدیث، تفسیر، فقہ، عقائد وتصوف کی اجازت پیش کرتا ہے، جن کی مجھے مشائخ کرام سے اجازت ہے۔ الوظیفۃ الکریمہ کے مطابق سلسلۂ قادریہ کے اوراد ووظائف معمول بنائیں اور علوم دینیہ کی تعلیم واشاعت اور تصنیف کے لیے اپنی تمام توانائیاں صرف کردیں کہ یہی وظیفۂ انبیاء وصلحا ہے۔ صلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ محمد وعلی آلہ واصحابہ وعلیہم وسلم [مکتوب محررہ ۲۰۰۲ء]

حقیقت یہ ہے کہ تعلیم، اشاعت اور تصنیف ہی کے وظیفہ میں آپ نے زندگی بھر اپنی پوری توانائی صرف فرمائی اور مجھے بھی اس کی تلقین فرمائی، اور انھیں راہوں سے روحانیت کی ان بلندیوں پر فائز ہوئے، جن کی توقع اور جس کی دعا مذکورہ اکابر علما و مشائخ نے فرمائی تھی۔ مولیٰ تعالیٰ ہم لوگوں کو بھی اسی ڈگر پر چلا کر مخلصانہ خدمت دین کی توفیق عطا فرمائے اور اس کے ثمرات سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین ثم آمین!

[پیام حرم نومبر ۲۰۰۷ء]

مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال: اسباب وعلاج

تعلیم فرد اور سماج کو مہذب بناتی ہے، تعلیم مالی خوشحالی لاتی ہے، تعلیم حقوق کے تئیں ہوشیاری وبیداری پیدا کرتی ہے، تعلیم فرائض کے معاملے میں ذمہ داری کا احساس دلاتی ہے، تعلیم ماضی سے آگاہ رکھتی ہے، اور روشن مستقبل کے لیے فکر وعمل کو مہمیز لگاتی ہے۔ ملی تشخص کی بقا، افرادِ ملت کے ایمان وعقیدے کی حفاظت وپختگی، اعمالِ صالحہ سے آراستگی اور اخلاق وعادات کی درستگی کا سب سے اہم اور بنیادی ذریعہ تعلیم ہی ہے، تعلیم کے بغیر قوم بہت زیادہ دنوں تک اپنے صحیح وصالح اعتقادی وعملی اور اخلاقی وروحانی اقدار وروایات کا تحفظ نہیں کرسکتی۔ غیر تعلیم یافتہ قوم جہالت کی وجہ سے بہت جلد اپنے اعتقادات وروایات سے اور معمولات سے دور ہوکر اپنا ملی تشخص کھو بیٹھتی ہے، جاہل قوم اور ناخواندہ افراد بڑی جلدی اور بہت آسانی سے غیروں کی نظریاتی وتہذیبی یلغار کا شکار ہوجاتے ہیں۔

پڑھا لکھا آدمی تعلیم کی وجہ سے دین اور علم کے بنیادی سرچشموں اور دیگر مصادر سے براہ راست استفادہ کرکے اپنے ایمان وعمل کی معلومات میں اضافہ کرتا رہتا ہے، اور اپنے لیے اعتقادی وعملی اور اخلاقی وروحانی اصلاح اور تحفظ کا سامان بھی کرلیتا ہے، اس کے بعد اپنے کنبے، پاس پڑوس کے لوگوں، رشتہ داروں اور اہلِ تعلق کی اصلاح وتربیت اور ان کے ایمان وعقیدے کی حفاظت اور انھیں باعمل اور بااخلاق بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

مزید یہ کہ عظیم پیمانے پر دین ومذہب اور فکر ونظر کی اشاعت وترقی بھی بغیر تعلیم کے ممکن نہیں ہے، تعلیم تحریک پیدا کرتی ہے، اور تحریک کو زندہ رکھتی ہے، اور اسے مقبول ومشہور اور عام بناتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ زندہ قومیں اپنے دین ومذہب اور اپنے افکار ونظریات کی حفاظت اور ترقی واشاعت کے لیے تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دیتی ہیں، اور تعلیم کو ایک ہتھیار اور اوزار کی طرح استعمال کرتی ہیں، اس کی سب سے واضح مثال عیسائی قوم ہے، جس نے پوری دنیا میں نیچے سے اوپر تک کے مختلف قسم کے تعلیمی ادارے کھول کر اور بہترین تعلیمی سہولیات فراہم کرکے عیسائی اور غیر عیسائی طبقے پر اپنی تہذیب وثقافت کا گہرا رنگ چڑھا دیا ہے، اور مشن اسکول کا تعلیم یافتہ مسلمان بچہ بھی لاشعوری طور سے فرنگی

تہذیب کا پتلا نظر آتا ہے، پوری دنیا پر عیسائی قوم کے تعلیمی مشن، ان کی تہذیبی رنگت کے غلبے کا سب سے بڑا اور اہم سبب ہے۔

اس کے برخلاف مسلمان قوم نے تعلیم کی طرف وہ توجہ نہیں دی، جو دی جانی چاہیے تھی، اسی لیے دینی تشخص اور اسلامی تہذیب کی لو مدھم سے مدھم ہوتی جارہی ہے، اور مسلمان اپنے دینی تشخص سے دور ہوتا جارہا ہے، اور تعلیمی پسماندگی کے باعث اس کی معیشت اور سماجی حیثیت بھی دن بدن کمزور ہوتی جارہی ہے، خواہ عالمی سطح پر ہو یا ملکی ومقامی سطح پر، اس وقت تعلیمی حیثیت سے ہندوستان کا مسلمان زیر ہو چکا ہے، ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد اسلامیانِ ہند کی تعلیمی صورت حال اور زیادہ خراب ہوگئی، سچر کمیٹی کی رپورٹ اگر حقائق پر مبنی جایے تو مسلمانوں میں تعلیم کی شرح صرف چار فیصد ہے، یہ رپورٹ ہمیں چونکانے اور بیدار کرنے کے لیے کافی ہے، لیکن ابھی بھی ہمارے کانوں پر جوں نہیں رینگ رہی ہے، اور کچھ کرنا تو کجا ہم کچھ سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔

تعلیم کی کمی اور کمزوری ہی ہماری دینی وروحانی کمزوری اور سیاسی وسماجی بدحالی اور معاشرتی ومعاشی ابتری وپسماندگی کی وجہ ہے، جب کہ ہمارے دین اسلام نے دینی اور دنیوی دونوں طرح کی تعلیم کو اہم اور ضروری قرار دیا ہے اور علم وعلما کی فضیلت وضروری بیان کر کے حصول تعلیم کی خوب حوصلہ افزائی کی ہے۔

صرف ہندوستان ہی کو سامنے رکھ کر تجزیہ کیجیے اور آزادی کے بعد کی تعلیمی صورت حال کا جائزہ لیجیے تو بہت مایوس کن صورت نظر آئے گی، مذہبی تعلیم ہو یا عصری تعلیم دونوں کی صورت حال خرابی وابتری میں یکساں ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذہبی تعلیم میں شمالی ہندوستان ضرور قدرے بہتر ہے، کہ یہاں جنوبی ہند (کیرلا کو چھوڑ کر) کے مقابلے مذہبی تعلیمی ادارے اور مکاتب ومدارس زیادہ ہیں۔

لیکن شمالی ہند کے ہر صوبے اور ہر ضلع اور ہر آبادی میں ابھی بھی ضرورت کے مطابق مطلوبہ تعداد میں مکاتب ومدارس نہیں ہیں، اور جو ہیں، ان میں سے اکثر چوکس نظام تعلیم اور مفید ومعیاری نصاب تعلیم سے بہت حد تک محروم ہیں، نیز انتظامیہ، اساتذہ، طلبہ اور سرپرستوں میں تعلیم اور اس کے مقاصد واغراض کے سلسلے میں فکری جمود، نافرض شناسی، خودغرضی، تن آسانی اور غفلت ولاپروائی کا دور

دورہ ہے۔

بہت سے مکاتب ومدارس تعلیم کے بنیادی وسائل، اچھے اساتذہ، اچھی لائبریری کی کمی اور ضروری سہولیات سے محرومی کا شکوہ اور بہانہ کر رہے ہیں۔

ملکی سطح پر ضرورت ہے کہ ہر بڑی مسلم آبادی میں ایک دارالعلوم اور ہر چھوٹی آبادی اور بڑے محلے میں ایک مکتب قائم کیا جائے اور ضرورت بھر باصلاحیت اساتذہ کی تقرری اور اساتذہ وطلبہ کی تعلیمی وشخصی ضروریات وسہولیات کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے، اور فرائض سے غفلت پر حیثیت عرفی کے لحاظ کے ساتھ احتساب وباز پرس کا نظام بھی ہو اور حسن کارکردگی اور محنت کے مظاہرے پر انعام واکرام سے نوازش بھی کی جائے، تاکہ تعلیم نتیجہ خیز ثابت ہو، باصلاحیت افرادکار پیدا ہوں، اور تعلیم پر صرف کیا جانے والا خطیر سرمایہ مفت خوری کی نذر نہ ہونے پائے۔

بہر حال موجودہ مدارس پر مزید توجہ اور مزید محنت کی ضرورت ہے، اسی احساس کا اظہار امین ملت پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں قادری برکاتی سجادہ نشیں خانقاہ برکاتیہ مارہرہ نے اپنے حالیہ انٹرویو میں کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''میرا ماننا ہے کہ ابھی جتنے مدارس موجود ہیں، ان پر محنت کی جائے، ان کے ساتھ عوام تعاون کر کے ان کو شاہکار دینی اداروں کی شکل دیں، تا کہ ان مدارس سے باصلاحیت وباوقار علمائے حق فارغ ہو کر دین وسنیت کی خدمات انجام دے سکیں۔'' [جام نور ص ۲۹، دسمبر ۲۰۰۷ء]

سب سے پہلے سرپرستوں اور بچوں میں حصول تعلیم کی بیداری پیدا کرنا ضروری ہے، پھر ضرورت کے مطابق اچھے اور معیاری نیز سہولیات سے مالا مال مزید مدارس ومکاتب قائم کرنا اور جو قائم ہیں، انھیں مستعد وچوکس اور معیاری بنانا لازمی ہے۔

تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے لیے زبردست تحریک چلانی پڑے گی، جب تک تعلیمی تحریک برپا نہیں ہوگی، اور تعلیم کو ایک مشن کی حیثیت نہیں دی جائے گی، اور منصوبہ بند مہم نہیں چلائی جائے گی، امت مسلمہ کے فرزند اپنے تعلیمی ہدف تک نہیں پہونچ سکتے۔

تعلیمی بیداری مہم میں ہمارے اہل علم وقلم، خاص طور سے بااثر خانقاہوں کے مشائخ

اور مقررین وخطباے عظام، ائمۂ مساجد اور سماجی قائدین ودانشوران اپنے اپنے حلقۂ اثر میں موثر کردار ادا کرسکتے ہیں، دینی اجلاسوں، کانفرنسوں اور خصوصی مجالس ومحافل میں تعلیم اور مدارس کی طرف زیادہ سے زیادہ قوم کے صاحب ثروت اہل خیر اور عوام کو توجہ دلائی جائے، اور مدارس کی اہمیت بتائی جائے، اور مادی تعاون کے لیے آمادہ کیا جائے، اور سیمینار، سمپوزیم منعقد کر کے موجودہ تعلیمی صورت حال کا جائزہ لے کر کمیوں اور کمزوریوں کو دور کیا جائے، اور منصوبہ بند طریقے سے معیاری مدارس کے قیام اور تعلیم وتربیت کے نظام ونصاب کی اصلاح وتحسین پر مخلصانہ مشورے اور بحثیں ہوں اور عمل درآمد کے لیے اسکیمیں بنائی جائیں، اور اس کی پیش رفت کا جائزہ بھی لیا جاتا رہے، تنظیم المدارس بنا کر ایک تعلیمی نیٹ ورک سے سارے مدارس کو جوڑ دیا جائے۔

فی الحال پورے ملک میں چند ہی ایسے مدارس ہیں، جو کسی حد تک نتیجہ خیز نصاب ونظام کی پابندی کر رہے ہیں، اور ان کے باصلاحیت پروڈکس کی اور اس کے سالانہ پیداوار قدرے اطمینان بخش کہی جاسکتی ہے، جن میں الجامعۃ الاشرفیہ کی کارکردگی بہرحال سب سے نمایاں ہے، اور اس کی فکر اور طریقہ عمل سے متاثر اداروں کے پیدا کردہ افراد ملی وجماعتی ضرورتیں پوری کرنے میں عددی اور کیفیتی برتری رکھتے ہیں، جن میں دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی بھی سرفہرست ہے۔

حال کی دو دہائیوں کے اندر تھوڑی موڑی تعلیمی بیداری نظر آ رہی ہے، کچھ خانقاہیں بھی تعلیمی کروٹ لے رہی ہیں، بریلی شریف، کچھوچھہ شریف، بدایوں شریف اور پھپھوند شریف میں تعلیمی حرکت کا آغاز ہو چکا ہے، قادری سلسلے کی مشہور خانقاہ برکاتیہ کے سجادگان وذمہ داران نے اپنے حلقۂ احباب ومریدین میں تعلیمی مہم چھیڑ رکھی ہے، اور اپنے متعلقین سے مختلف انداز سے مدارس کو مادی تعاون فراہم کرا رہے ہیں، اور خود بھی تعلیم کو عام کرنے اور تعلیمی نظام کو مضبوط ومستحکم کرنے میں اور زیادہ سے زیادہ مفید بنانے میں اپنی بھرپور توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔

پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں صاحب مدظلہ العالی قوم کے نام اپنے ایک پیغام میں اپنی فکرمندی اور دل سوزی کے جذبے کا اظہار فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

"اپنے بچوں کی صحیح پرورش کریں، اچھی تعلیم دیں، اور اس سے اچھی تربیت دیں، نئی نسل کو

اسلامی اقدار کا پاسدار بنائیں، تعلیم کے فروغ کے لیے کوشاں رہیں، روٹی چاہے آدھی کھائیں، لیکن بچوں کو ضرور پڑھائیں"۔ [ایضاً ص ۹۴]

کاش! یہی پیغام ہر خانقاہ سے بلند ہوتا تو پھر امت مسلمہ میں ایک خوشگوار تعلیمی انقلاب پیدا ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اللہ کرے ایسا ہو۔

اپنے یہاں اچھے مکاتب ومدارس کی کمی اور متحرک وفعال تبلیغی نظام وتنظیم کے فقدان اور بے حسی کے سبب تقسیم ہند کے بعد وہابیت ودیوبندیت نے میدان خالی پاکر نئے مکاتب ومدارس قائم کیے، اور موجود سنی مکاتب ومدارس اور مساجد پر قبضہ کیا، اور تبلیغی جماعت کا جال بچھادیا، اور منظم تعلیمی وتبلیغی تحریک چلا کر اکثریتی خوش عقیدہ مسلمان آبادیوں پر اعتقادی یلغار شروع کر دی، اور ساٹھ سال میں اہل سنت کی عددی برتری کو زبردست نقصان پہونچایا۔

اس یلغار سے اہل سنت کی حفاظت کے لیے حافظ ملت علیہ الرحمہ نے الجامعۃ الاشرفیہ قائم فرمایا، اور بہت حد تک تعلیم کے ذریعہ اہل سنت کو سنبھالا دیا، پھر پاسبان ملت علامہ مشتاق احمد نظامی علیہ الرحمہ تبلیغی جماعت کے متوازی سنی تبلیغی جماعت بنائی، لیکن اسے بہت زیادہ ہمہ جہت کامیابی نہیں ملی، ہاں راجستھان میں مفتی ظہور احمد اشرفی علیہ الرحمہ کی زیر قیادت قصبہ باسنی کی سنی تبلیغی جماعت متحرک رہی، اور اس یونٹ نے راجستھان کے سیکڑوں گاؤں میں مبلغین بھیج کر تبلیغ وتعلیم کے ذریعہ جہالت وبدعقیدگی سے مسلمانوں کی حفاظت فرمائی، ان کے بعد ان کے عملی جانشین مولانا مفتی ولی محمد صاحب نے سنی تبلیغی جماعت باسنی یونٹ کی کمان سنبھال کر کئی اضلاع میں سیکڑوں مکاتب ومدارس کا جال بچھادیا ہے۔

[پیام حرم دسمبر ۲۰۰۷ء]

گجرات حکمرانی کا تاریخی سفر عہد بہ عہد

[ماضی سے حال تک]

قدرتی نعمتوں سے مالامال گجرات: ہندوستان کا وہ صوبہ ہے، جہاں قدرت کی خاص کرم فرمائی سے روحانی ومادی زندگی کی بے پناہ اور بیش قیمت نعمتیں موجود ہیں، اللہ تعالیٰ نے اسے جغرافیائی اہمیت ،ماحولیاتی دل آویزی ،ارضیاتی زرخیزی ،اقتصادی وتجارتی گرم بازاری ،صنعت وحرفت کی بہتات اور روزگار کے گوناگوں مواقع ،نیز علمی اور دینی وروحانی آسودگی جیسی عظیم نعمتوں سے بڑی فیاضی کے ساتھ نوازا ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر نے اسے ہندوستان کی زیب وزینت کہا ہے، گجرات نے اپنی ان ہی اہم خوبیوں اور دلکشی ودلآویز خصوصیتوں کے سبب دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا، اور ملک وبیرون ملک کے حکمرانوں، تاجروں، علم وہنر کے دیوانوں، روزی کے خواستگاروں اور روحانیت کے پیاسوں کو گجرات آنے پر مجبور کیا۔

ہر دور اور ہر زمانے میں ملک وبیرون ملک سے ہر قوم کے لوگ گجرات آئے ،اور خوب فیض اٹھایا، کچھ آئے اور فیض اٹھا کر چلے گئے ،اور کچھ نے یہیں بساط حیات بچھائی، گجرات پر قبضہ کیا ،اور پھر یہیں پیوند خاک ہو گئے۔

اسی لیے گجرات کے چپے چپے پر مختلف قوموں کے رنگارنگ تمدنی جلوے اور تہذیبی آثار آج بھی نظر آتے ہیں۔

گجرات کی کشش عربوں کو بھی گجرات لائی، گجرات سے عربوں کے تعلقات کی شروعات ،گجرات پر ان کی باضابطہ حکمرانی بعہد سلطان علاء الدین خلجی (م ۶۹۶ھ) کے آغاز کے صدیوں پہلے سے ہوئی۔

محل وقوع اور عربوں کی آمد: جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے گجرات ملک عرب کے سامنے ہے

گجرات حکمرانی کا تاریخی سفر عہد بہ عہد

، گجرات اور عرب کے درمیان بحر عرب کا ایک حصہ واقع ہے، اس سمندری راستے سے اہل عرب قبل مسیح کے دور سے یہاں آتے جاتے اور تجارت کرتے تھے، پھر جب عرب سے لے کر ترکستان تک اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو اس وقت گجرات سے لے کر لنکا تک تجارتی جہازوں کی آمدورفت بہت بڑھ گئی اور جب کبھی ان تاجروں کو کوئی تکلیف پہنچتی تو ان کی امداد کے لیے بصرہ، سیراف، وغیرہ سے جنگی بیڑا فوراً آجاتا، چنانچہ تھانہ، بھروچ، دیول وغیرہ میں متعدد بار آیا۔ سندھ پر ۹۲ھ میں محمد بن قاسم کی حکومت قائم ہونے کے بعد تعلقات میں مزید اضافہ ہوا، اور دھیرے دھیرے عرب کے لوگ تجارتی، علمی اور مذہبی ضرورتوں کے لیے بڑی تعداد میں گجرات آنا شروع ہوئے، سومنات، کھنبایت، بھروچ، چیمور، (متصل ممبئی) سوپارہ اور تھانہ میں عربوں کی بڑی بڑی کوٹھیاں تعمیر ہوئیں (گجرات کی تمدنی تاریخ از ابوظفر ندوی ص ۴،۳)

گجرات کے پہلے حکمراں: گجرات پر ابتدا میں کولیوں اور راجپوتوں کی حکومت تھی، جو گجرات کے چھوٹے چھوٹے علاقوں پر قابض تھے، اور آپس میں نبرد آزما رہتے تھے، ان کی چھوٹی بڑی ۲۵ خودمختار حکومتیں تھیں، ان کی باہمی چپقلش کا فائدہ اٹھا کر جاوڑہ خاندان کے راجہ بھوردیو نے گجرات پر قبضہ کرلیا، یہ راجہ جب گجرات کا بادشاہ بنا تو اپنا نام راج چتر رکھا، دس برس حکومت کے بعد یہ مرگیا، جاوڑہ خاندان نے گجرات پر ۱۹۴ ربرس حکومت کی، اس کے بعد گجرات پر سولنکی خاندان نے ۲۵۶ رسال حکمرانی کی، اس کے بعد واگھیلا خاندان حکمراں ہوا، اس خاندان کے چھ بادشاہوں نے ۱۵۶ ربرس تک حکومت کی۔

گجرات قرون اولیٰ میں: یوں تو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے ہی میں گجرات کے ساحل پر مسلمانوں کے قدم پڑ چکے تھے، تاریخی شہادتوں کی روشنی میں اعظم شہاب گجرات میں مسلمانوں کی آمد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے صرف ۵ ربرس بعد ہی سرزمین گجرات اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی تھی، ۱۵ھ مطابق ۶۳۶ عیسوی میں حضرت فاروق اعظم نے بحرین وعمان کی حکومت پر عثمان بن ابی العاص ثقفی کو نامزد فرمایا، انھوں نے اپنے بھائی حکم بن ابی العاص کو بحرین کی حکومت پر نامزد کرکے حکم دیا کہ وہ ہندوستان پر فوج کشی کریں، حکم نے کشتیوں کے ذریعہ سے

دریائی سفر کی منزلیں طے کیں، اور اپنی فوج کو لیے ہوئے سب سے پہلے سواحل گجرات پر قدم رکھا، اس فوج کشی میں جن سعادت مندوں کو مرتبہ شہادت نصیب ہوا، ان میں غالباً وہ نفوس قدسیہ بھی تھے، جنھوں نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال جہاں آرا دیکھا،.............ان کی قدسی صورتیں اسی سرزمین کی آغوش میں گنج بے رنج کی طرح مدفون ہیں۔ اگر چہ ہم کو اس کنز مخفی کا پتہ نہیں ہے، مگر یقین ہے کہ ممبئی اور بھروچ کے گردونواح میں یہ خزانہ سپرد خاک ہوا ہوگا، [یاد رہے کہ اس وقت ممبئی کا علاقہ بھی گجرات ہی کے حدود میں شامل تھا، اعظمی] اس زمانے میں ممبئی کا نام ونشان بھی نہیں تھا، وہاں جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا ایک غیر آباد ٹاپو تھا، مگر اسی کے پاس تھانہ بہت بارونق اور آباد تھا، یہیں پر سب سے پہلے مسلمانوں کی آمد ہوئی تھی۔

گجرات پر دوسرا حملہ بھی حکم بن ابی العاص نے کیا، اس بار (گجرات) کی سرزمین بھروچ کو یہ شرف حاصل ہوا، کہ اللہ کے ان سپاہیوں کے قدم مبارک چومے،۔۔اس زمانے میں یہ ہندوستان کا سب سے پررونق بندرگاہ تھا، جو تاجروں کے لیے ایک اہم منڈی تھی،۔۔۔

۸۶ھ/۷۰۵ء میں سندھ پر محمد بن قاسم کی فتح کے بعد گجرات سے مسلمانوں کے روابط بڑھے، ۱۰۷ھ/۷۲۵ء میں عباسی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے زمانے میں حاکم سندھ جنید بن عبدالرحمن مرّی نے ایک لشکر "کچھ" روانہ کیا، یہ لشکر بھروچ پر فتح کا پرچم لہراتا ہوا "مالوہ" پر قابض ہوگیا۔

خلیفہ مہدی باللہ نے عبدالملک بن الشہاب مسمعی کو ہندوستان جہاد کے لیے بھیجا، ان کے ساتھ مشہور تابعی ابوبکر ربیع بن صبیح سعدی بصری بھی تھے، ابوبکر ۱۰۶ھ/۷۲۲ء میں گجرات کے شہر کھمبایت پہنچے، اور یہیں ان کا انتقال ہوا اور یہیں مدفون بھی ہوئے۔ [گجرات کے جلتے دن رات ص ۲۶/۲۵ ملخصاً]

محمود غزنوی کا حملہ: پھر وقت گزرتا رہا اور گجراتی لوگ اسلام اور مسلمانوں سے آشنا ہوتے رہے، یہاں کے کچھ مظلوم ہندو راجاؤں نے گجرات کے ظالم راجاؤں کے ظلم سے عاجز آکر سلطان محمود غزنوی کو گجرات آنے کی دعوت دی، سلطان محمود غزنوی ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء میں ملتان آیا، اور وہاں سے کالنجر، قنوج، متھرا، اور گجرات کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کرلیا، سلطان محمود غزنوی انہل واڑہ (پٹن) پہنچا، جو واگھیلا راجہ بھیم دیو کا دارالحکومت تھا، اور اسے فتح کرکے یہاں سے سومنات گیا، جو گجرات کے ساحل پر

ہندوؤں کا مشہور مندر ہے، سلطان محمود غزنوی نے ستائیس (۲۷) برس میں ہندوستان پر سترہ (۱۷) حملے کیے، سومنات فتح کرنے کے بعد سلطان محمود خود یہاں سے چلا گیا۔

غوری کا حملہ: ۵۷۴ھ/۱۱۷۸ء میں غزنی اور غور کے بادشاہ سلطان شہاب الدین غوری نے گجرات پر حملہ کیا، مگر ناکام رہا، پھر اس کے دہلی کے نائب قطب الدین ایبک نے گجرات پر حملہ کیا، پھر دوبارہ شہاب الدین غوری نے ایبک کو ۵۹۷ھ/۱۲۰۰ء میں گجرات پر دوبارہ حملے کے لیے بھیجا، تو اس وقت کا راجہ اپنی راجدھانی انہل واڑہ (پٹن) خالی کر کے فرار ہو گیا، اس راجہ کا نام بھی بھیم دیو ہی تھا۔

واگھیلا خاندان کے آخری راجہ کرن کے دور میں سلطان علاء الدین خلجی نے ۶۹۶ھ/۱۲۹۲ء میں گجرات پر الغ خان کو حملے کا حکم دیا، راجہ کرن نے شکست کھائی، اور راجہ کرن سب کچھ چھوڑ کر فرار ہو گیا، اہل خانہ قید ہوئے، علاء الدین خلجی نے اپنے بڑے لڑکے خضر خان کی شادی راجہ کی لڑکی دیولدی سے کر دی، سلطان علاء الدین خلجی نے ہی گجرات کو باضابطہ اور مستقل فتح کیا، اور یہ حکومت دہلی کا ماتحت صوبہ بن گیا۔

مسلم سلاطین گجرات کی خودمختار حکومت: الغ خان نے دہلی حکومت کے گورنر کے طور پر بیس برس تک حکومت کی، اس کے طرز حکمرانی سے گجرات کے لوگ بہت زیادہ گرویدہ ہو گئے، الغ خان کے بعد گجرات پر دہلی سے برابر دوسرے امرا نامزد ہوتے رہے، اور امن وامان کے ساتھ حکومت کرتے رہے، اور گجرات کو خوب ترقی دی۔ یہ سلسلہ فیروز شاہ تغلق کے دور تک جاری رہا، اس کے انتقال کے بعد حکومت دہلی کے زیر انتظام بیشتر علاقوں میں شورش پیدا ہوئی، گجرات کے گورنر نے بھی بغاوت کی، مگر فیروز شاہ کے بیٹے محمد شاہ تغلق نے ۷۹۳ھ/۱۳۹۰ء میں امیر ظفر خان کو گجرات کا حاکم بنایا، یہی شخص سلاطین گجرات کا مورث اعلیٰ ہے   امیر ظفر خان نے اپنی انتظامی صلاحیتوں سے نہ صرف گجرات کی بغاوت ختم کر کے امن وامان قائم کیا، بلکہ حکومت گجرات کے حدود میں اضافہ بھی کیا۔

۸۱۰ھ/۱۴۰۷ء میں امیر ظفر خان نے مظفر خان کا لقب اختیار کر کے اپنی خودمختار حکومت کا اعلان کر دیا، اور چار سال تک گجرات کو ہر طرح کے فتنہ وفساد اور شورش سے پاک حکومت دینے کے بعد مظفر شاہ ۸۱۴ھ/۱۴۱۱ھ میں انتقال کر گیا۔

مسلم سلاطین گجرات کے مورث اعلیٰ امیر ظفر خان ملقب بہ مظفر شاہ اول کے وقت ہی سے گجرات کی تاریخی اہمیت غیر معمولی ترقی اور انقلابی تبدیلی کا دور شروع ہوا۔

یہ خود مختار حکومت [از مظفر شاہ اول ۸۱۰ھ/۱۴۰۷ء تا مظفر شاہ رابع ۹۶۸ھ/۱۵۸۰ء تقریباً پونے دوصدی تک قائم رہی]۔

مسلم گجراتی راجپوت خاندان میں اٹھارہ بادشاہ ہوئے، لیکن قابل ذکر پانچ ہیں:

(۱) مظفر شاہ اول (۲) احمد شاہ اول (۳) محمود شاہ اول (۴) مظفر شاہ ثانی (۵) بہادر شاہ۔ ان اولوالعزم بادشاہوں نے علم وفن کی قدر دانی، دینی ومذہبی سرپرستی، توسیع حدود سلطنت، عسکریت اور زراعت وتجارت، صنعت وحرفت، اور تعمیرات کے حوالے سے گجرات کو اتنی حیرت انگیز ترقی دی کہ گجرات نے رقبے کے لحاظ سے نصف ہندوستان کو گھیر لیا، اور وسائل قوت کے اعتبار سے ہندوستان کا سب سے برتر صوبہ بن گیا۔

اور سرزمین گجرات سے ایسے ایسے حکمراں اور ہر فن کے ایسے ایسے ارباب کمال اور دین ومذہب کے ایسے ایسے علما اور مشائخ پیدا ہوئے، جن کے علمی کارناموں، فنی کمالات، دین پروری، امن وسلامتی، خدمت خلق، عدل گستری، رواداری، اور روحانی ارشاد وتلقین سے پورے ملک نے فیض پایا، اور آج بھی گجرات کا کوئی علاقہ اسلامی عہد کے آثار سے خالی نہیں ہے۔

احمد شاہ ۸۱۳ھ/۱۴۱۰ء میں گجرات کا بادشاہ ہوا، اس نے دریائے سابرمتی کے کنارے احمد آباد شہر بسایا، اس کی رحم دلی، دینداری اور عدل وانصاف کے قصے مشہور ہیں۔

محمود شاہ اول [م ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء] علما اور صوفیہ کی بڑی عزت کرتا تھا، محمود اول کے دور میں قاضی اور محتسب برملا بادشاہ کے عیوب بیان کرتے تھے۔ اس کے بعد اس کا لڑکا مظفر حلیم گجرات کا بادشاہ ہوا، یہ حافظ قرآن تھا، اور بڑا بردبار تھا، مدعی کے ساتھ عدالت میں کھڑا رہتا تھا۔

خود مختار سلاطین کے پونے دوسو سالہ عہد حکومت میں گجرات نے ہمہ جہت ترقی کی، ان کا دارالحکومت چانپانیر اور احمد آباد رہا، ان بادشاہوں نے بہت سے گاؤں اور شہر آباد کیے، سلطان پور، احمد نگر، محمود آباد، مظفر آباد، اور احمد آباد اسی عہد میں آباد ہوئے، پتھر کی عمارتیں بکثرت بنیں، خاص طور سے

بعض مسجدیں اس طرح بنیں کہ ایک مینارہ ہلانے سے دوسرا ہلنے لگتا ہے، بکثرت مقبرے، مدرسے، حمام سرائیں تعمیر ہوئیں، اس زمانے میں عالموں کی بڑی عزت تھی۔

گجرات مغلیہ عہد میں: ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر شاہ دہلی نے گجرات پر قبضہ کیا اور اس وقت سے مغل بادشاہ اپنے ناظموں کی مدد سے حکومت کرتے رہے، چنانچہ جہاں گیر شاہ جہاں، اورنگ زیب اور محمد معظم بہادر شاہ[۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء] تک تو نظامت کا یہ سلسلہ ٹھیک طریقے سے چلا، مگر اس کے بعد خانہ جنگی شروع ہوگئی، تو یہ سلسلہ ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء میں ختم ہوگیا، مسلمان امرا کی باہمی اقتدار کی کشمکش کے نتیجے میں ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء میں انگریزوں کی مدد سے احمد آباد پر مرہٹوں کا قبضہ ہوگیا، اور چند چھوٹے بڑے ضلعوں پر مسلمان امرا حاکم رہ گئے۔

مرہٹوں کا قبضہ: مغل عہد میں احمد آباد میں صنعتی کارخانے قائم ہوئے اور کافی عمارتیں بنیں، مرہٹوں نے ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں گجرات کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کرلیا، اور گجرات پر مسلمانوں کا تقریباً ۵سو سالہ اقتدار جاتا رہا۔

انگریزی سازش: انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا قدم جمانے اور اپنی خطرناک پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' پر عمل کرکے اپنے زرخرید سیاسی ومذہبی ایجنٹوں کی مدد سے گجرات سمیت پورے ہندوستان میں امن وسکون اور رواداری کے ساتھ رہنے والے ہندو عوام کے ذہنوں میں مذہبی اور سماجی منافرت کا بیج بویا، جس کی فصل ہندو مسلم فسادات کی صورت میں تقسیم ہند وپاک کے سانحے اور ملک کی آزادی کے بعد ملک چھوڑ جانے کے باوجود انگریز آج تک کاٹ رہے ہیں، اس منافرت کے نتیجے میں فرقہ پرست اکثریتی طبقے میں ہندو مہا سبھا، شدھی تحریک، اور آر، ایس، ایس کے نام سے کچھ منظم ومتحرک، متعصب گروپ وجود میں آئے، جو سماج سیوا اور ہندو ثقافت کے احیا اور بقا کے نام پر اکثریتی طبقے کے پر امن اور سادہ لوح ہندوستانی عوام کے ذہن کو مذہبی منافرت سے زہر آلود کرتے رہے، اور جگہ جگہ فسادات بھڑکاتے اور مسلم اقلیت کا قتل عام کرتے آرہے ہیں۔ ۱۸۵۶ء میں ''ہندو مہا سبھا'' نام کی تنظیم قائم ہوئی، آزادی سے پہلے اور بعد کے ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کے تسلسل کی ایک بھیانک تاریخ ہے، تب سے آج تک ہزاروں فسادات ہو چکے ہیں، جن کا سلسلہ آج بھی جاری ہے، صوبۂ گجرات

خاص طور سے بار بار فسادات کا نشانہ بنا، اور یہاں کے بیشتر علاقوں میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی، اور منظم اور ہمہ گیر طریقے سے مسلمانوں کی نسل کشی کی گئی۔

پورے ملک میں ۱۹۴۷ء سے ۲۰۰۰ء تک حکومت کے ریکارڈ کے مطابق ۶۶۳۵ رفسادات ہو چکے ہیں، اور ۱۹۹۲ء سے ۲۰۰۲ء تک آٹھ فسادات کا ریکارڈ ہے، ۲۷ر فروری ۲۰۰۲ء کو ضلع پنچ محل کے گودھرا ریلوے اسٹیشن پر سابرمتی ایکسپریس کے ایک
ڈبے کو آگ لگادی گئی، جس میں ایودھیا سے لوٹ رہے ۵۸ر گجراتی کارسیوک لقمۂ اجل بن گئے تھے، اس کے ردعمل میں پورے گجرات میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں انتہائی منصوبہ بند انداز سے زبردست پیمانے پر دل دہلانے والے مسلم کش فسادات ہوئے، جن کی ہولناکی اور بے رحمی سے پوری دنیا چیخ اٹھی، اور پورا ہندوستان شرمسار ہوا۔

آزادی کے بعد گجرات پر بھی کانگریس پارٹی حکومت کرتی رہی، جن سنگھ اور کانگریس دونوں ہی فسادات کے ذمہ دار رہے ہیں، جن سنگھ نے ۱۹۸۰ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی نام اختیار کرلیا، کانگریس اپنے دوغلے پن، منافقانہ رویے اور اقتدار کے نشے میں چور ہوکر ۱۹۷۷ء میں اقتدار سے باہر ہوگئی، اور گجرات سمیت کئی صوبوں میں غیر کانگریسی حکومتیں بنیں، غیر کانگریسی پارٹیوں کے ملغوبے جنتا پارٹی نے ڈھائی سال حکومت کی، جس میں آر،ایس،ایس کے سیاسی بازو جن سنگھ نے بھی اپنے کو ضم کر کے اقتدار کی دہلیز تک رسائی حاصل کرلی، جنتا پارٹی کے ٹوٹ جانے کے بعد جن سنگھی عناصر نے بھارتیہ جنتا پارٹی بنائی، جس نے بعد میں دہلی کے مرکزی اقتدار تک آر،ایس،ایس کے مشہور پرچارک اٹل بہاری باجپئی کو بحیثیت وزیر اعظم پہونچادیا، مرکزی حکومت کے ساتھ کئی ریاستوں میں بھاجپا نے تنہا یا شریک پارٹی کی حیثیت سے صوبائی حکومتوں پر قبضہ کیا، جن میں سے ایک اہم اور مضبوط ریاست گجرات کا صوبائی اقتدار بھی ہے۔

مودی کا گجرات: گجرات میں جنتا پریڈ ۱۹۷۷ء سے آج تک غالباً بھارتیہ جنتا پارٹی ہی حکومت کررہی ہے، ۱۹۸۵ء کے بعد کانگریس گجرات میں دن بدن کمزور ہوتی گئی، اور ۱۹۹۵ء میں پوری طرح یہاں سے کانگریس کا پتہ کٹ گیا، اس کی بڑی وجہ ۱۹۹۲ء کا بابری مسجد سانحہ تھا، مسٹر نریندر مودی کے گجرات کے

بھاجپا صوبائی حکومت کی کمان سنبھالنے کے بعد ۲۰۰۲ء میں گودھرا کا فرین حادثہ پیش آیا، اور اس کے بہانے مودی نے گجرات کے مسلمانوں پر گجرات کی زمین تنگ کردی، مودی نے فسادات کے علاوہ مسلم کشی اور مسلمانوں کو ہراساں کرنے اور دبانے کا ایک اور نیا طریقہ فرضی ان کاؤنٹر کی شکل میں ایجاد کیا، اور ۲۰۰۵ء میں اس سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر مودی کے اشارے پر سہراب الدین شیخ کے قتل کا واقعہ پیش آیا، یہ معاملہ ابھی سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے، اور ادھر گجرات میں پنج سالہ ریاستی الیکشن کی گہما گہمی ہے، الیکشن مہم کی ابتدا میں نریندر مودی نے ترقی کو موضوع بنایا، پھر کامیابی ملتے نہ دیکھ کر اور اپنے خلاف اٹھتے ہوئے عوامی طوفان اور بے جے پی کی اندرونی بغاوت سے خائف ہو کر ایک بار پھر مسلم دشمنی کا کارڈ کھیلنے کا فیصلہ کرلیا، بلی تھیلے سے باہر آگئی اور پہلے راؤنڈ کی پولنگ سے ایک ہفتہ پہلے جنوبی گجرات کے منگرول شہر میں نریندر مودی نے ایک جلسۂ عام میں فخریہ انداز سے اور بڑی ڈھٹائی سے سہراب الدین شیخ فرضی ان کاؤنٹر کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کہا:

"گجرات میں کانگریس سہراب الدین شیخ ان کاؤنٹر کے خلاف آواز اٹھا رہی ہے، لیکن سونیا گاندھی یہ بتائیں کہ جو شخص غیر قانونی اسلحہ اور ہتھیار جمع کر رہا تھا، اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا...؟ مجھے بتائیے، سہراب الدین شیخ کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا...؟ تب جذباتی طور پر برہم مجمع نے کہا..... قتل قتل۔ مودی نے جواب میں کہا: جی ہاں، تو کیا اس کے لیے مجھے سونیا گاندھی سے اجازت لینے کی ضرورت ہے؟" [روزنامہ اردو سہارا گورکھپور ۶ دسمبر ۲۰۰۷ء ص ۱]

اس بیان پر اخبار سہارا لکھتا ہے: اپنے اس فرقہ وارانہ کھلواڑ سے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر نریندر مودی نے یہ اعتراف کرلیا ہے کہ سہراب الدین شیخ کا فرضی ان کاؤنٹر ان کی اجازت سے ہوا ہے۔ [ایضاً]

اس بیان کو لے کر سپریم کورٹ میں مودی کے خلاف کارروائی کے مطالبے کا مقدمہ دائر ہے اور سپریم کورٹ نے مودی کو نوٹس جاری کرتے ہوئے ان سے پوچھا ہے کہ کیوں نہ ان کے بیان کو توہین عدالت کا معاملہ مانا جائے، کورٹ نے ہر ہفتے کے اندر ان سے جواب طلب کیا ہے، تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ "مودی نے سہراب الدین شیخ قتل معاملے کو اس لیے جائز ٹھہرایا

ہے، تا کہ موجودہ الیکشن میں ہندو ووٹ کو منظم کیا جا سکے" باخبر ذرائع کے مطابق سہراب الدین شیخ کے بھائی رباب الدین شیخ کے وکیل اور اس معاملے میں عدالت کے معاون وکیل کے طور پر کام کرنے والے ایڈیشنل سالیسیٹر جنرل گوپال سبرامنیم نے کہا ہے کہ ریاستی حکومت محض ایک بہانہ کر رہی ہے، اور یہ عدالتی توہین کا معاملہ ہے، مودی کے اس بیان کو ریاستی حکومت کے وکیل کے. ٹی. ایس تلسی نے بھی غیر مناسب قرار دیا تھا، اس کے بعد ہی سرکار نے تلسی کی جگہ رنجیت کمار کو پیروی کا حکم دیا ہے۔

چوں کہ پہلے مرحلے کی پولنگ گزر چکی ہے اور اگلی سماعت ۳ر جنوری کے بعد ہی ہوگی تب تک دوسرے مرحلے کا الیکشن بھی ہو چکا ہوگا، اس لیے اگر مودی کے خلاف بھی فیصلہ جاتا ہے، تو اس الیکشن میں مودی کے خلاف ووٹروں کے رجحان میں منفی تبدیلی کا امکان صفر ہے، ہم مسلمان اپنے کردار کے سبب اپنی مظلومیت کے خود زیادہ ذمہ دار ہیں، ہمیں خود اپنے اندر تبدیلی لانی ہوگی، اس لیے کہ۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

[پیامِ حرم جنوری ۲۰۰۸ء]

یکساں نصاب ونظام تعلیم کے لیے تنظیم المدارس کا قیام

اور

نصاب وطریقہ تدریس میں ترمیم وتحسین:

اسلام اور اجتماعیت: اسلام، اجتماعیت اور تنظیم کا داعی وعلم بردار مذہب ہے، اجتماعیت اسلامی زندگی کا جزو اہم واعظم ہے، مسلمانوں میں جب تک اور جس قدر اسلامی اوصاف کے اعتبار سے شخصی جامعیت اور معاشرتی مسائل کے حل کے لیے باہمی مشاورت ومعاونت، جماعتی تنظیم واجتماعیت اور اتحاد وجمعیت رہی، وہ کامیاب وسرخرور ہے، اور بحیثیت قوم دنیا ان کا لوہا مانتی رہی اور جوں جوں ان کی جامعیت واجتماعیت میں نقص وخلل بڑھتا گیا، توں توں مسلمان کمزور ہوتے چلے گئے۔

اسلام نے اجتماعیت اور ربط باہم کی ضرورت واہمیت پر بہت زور دیا ہے، حتی کہ اس نے اس کی ترغیب وتحریک کے لیے نظام عبادات کو عملی وسیلہ بنا کر پیش کیا ہے، اس کی واضح ترین مثال فریضۂ حج، نماز عیدین، نماز جمعہ اور نماز پنج گانہ کے مختلف سطح کے بڑے چھوٹے سالانہ، ہفت روزہ اور روزینہ اجتماعات ہیں۔

پھر یہ کہ اسلام نے مسلم معاشرے اور اس کے افراد کے مختلف النوع مسائل کے حل کے لیے باہمی مشاورت کا درس دیا ہے، اور اسے امت مسلمہ کی خصوصیت اور کامیابی کی ضمانت بتایا ہے "وامرھم شوریٰ بینھم" اور مشاورت کے لیے اجتماعیت ضروری ہے، اس مختصر گفتگو سے اجتماعیت کی عمومی افادیت اور ضرورت واہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

اسلام چوں کہ زندگی کے تمام شعبوں کے لیے واضح ہدایات اور رہنما اصول وضوابط رکھتا ہے، اور فرد اور معاشرے کی فلاح وبہبود کے لیے قدم قدم پر مخلصانہ رہبری کرتا ہے، لہذا وہ تعلیم اور تعلیم کے مراکز یعنی مدارس ومکاتب کے مسائل سے بھی غافل نہیں ہے، اور بہتر سے بہتر اور مفید سے مفید تر تعلیمی

وسائل اپنانے کی وکالت وحوصلہ افزائی کرتا ہے۔

تنظیم المدارس کی ضرورت: جس طرح اچھی تعلیم کے لیے اچھا تعلیمی نصاب ونظام اچھے اساتذہ، اچھا تعلیمی ماحول، اچھی لائبریری، اور اچھے تعلیمی انتظام کار کی ضرورت واہمیت ہے، اور ان مذکورہ وسائل تعلیم کے بغیر باصلاحیت افراد کی خاطر خواہ بہتر پیداوار ممکن نہیں ہے، اسی طرح مدارس ومکاتب کا ایک باہمی تعلیمی نیٹ ورک بھی نہایت ضروری اور اہم ہے، جسے ہم تنظیم المدارس یا وفاق المدارس کا نام دے سکتے ہیں۔

بین المدارس تعلیمی تنظیم ویکسانیت اور نصاب ونظام تعلیم کی وحدت کی وجہ سے جہاں من حیث الجماعت تعلیمی ترقی وبہتری پیدا ہوگی اور بین المدارس طلبہ میں مقابلہ آرائی اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے جذبے سے جان توڑ محنت کے سبب زیادہ سے زیادہ تعداد میں زیادہ سے زیادہ باصلاحیت افراد کار پیدا ہوں گے، وہیں جماعت کے مختلف طبقوں اور مشربوں کے افراد کو ایک ساتھ مل بیٹھنے کے مواقع بھی فراہم ہوں گے، اور تعلیمی مسائل کے ساتھ دوسرے جماعتی مسائل بھی حل ہونے کے امکانات پیدا ہوں گے، گلے شکوے، دور ہوں گے، بدگمانیاں اور غلط فہمیاں دور ہوں گی، اور روٹھے دل آپس میں مل بھی جائیں گے۔

تنظیم کی برکت سے مدارس عربیہ کا اندرونی تعلیمی وتربیتی اور انتظامی ڈھانچہ بھی مضبوط ومنظم اور تندرست وطاقت ور ہوگا، مدرسے کے منتظمین مطلوبہ مقدار کے مطابق باصلاحیت اور مخلص ومحنتی اساتذہ کے تقرر پر مجبور ہوں گے، طلبہ واساتذہ اصول ومعمول کی پابندی کریں گے، طلبہ کا ہر سال ایک مدرسہ چھوڑ کر دوسرے مدرسے میں جانے کا سلسلہ بند ہو جائے گا، اور طلبہ یکسوئی کے ساتھ ایک جگہ رہ کر تعلیمی تشنگی بجھائیں گے۔

تمام مدارس یا زیادہ سے زیادہ مدارس کے ایک تنظیم اور ایک وفاق سے جڑے ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ حکومت اور حکومتی تعلیمی بورڈس، پرائیویٹ تعلیمی ادارے، اور ملک وبیرون ملک کی یونیورسٹیاں ان مدارس کو اہمیت دیں گی، اور ایسے تمام مدارس کو مادی اور علمی فوائد یکساں طور سے حاصل ہوں گے، مثلاً اگر تنظیم یا وفاق کی سند کا کسی بورڈ یا یونیورسٹی سے معادلہ ہوتا ہے، تو تمام متعلقہ مدارس کے

طلبہ کو یونیورسٹیوں میں داخلے، تعلیمی ترقی، اور ملازمتوں کے حصول کے مواقع ملیں گے، اور معاشی خوشحالی آئے گی، اور نئی نسل میں حصول تعلیم کا رجحان آگے بڑھے گا، اور ناخواندگی کی شرح کم ہوگی، اور جب تنظیم ووفاق سے تعلق نہ رکھنے والے اداروں کے طلبہ ان مادی وعلمی فوائد سے محروم ہوں گے، تو یہ طلبہ بھی متعلقہ مدارس ہی کا رخ کریں گے، اور پھر دیگر مدارس بھی تنظیم اور وفاق سے جڑنے پر مجبور ہوں گے، اس طرح تنظیم کا دائرہ بھی وسیع ہوگا، اور فوائد بھی عام ہوں گے، اور نتیجۃً اس وسیلے سے پوری جماعت مربوط ومنظم اور مضبوط ومستحکم ہوگی، اس کا تعلیمی معیار بلند ہوگا، تعلیم اقتصاد سے جڑ جائے گی، اور جماعت سے علمی انحطاط، تعلیمی پستی، اور جہالت کا بدنما داغ دھل جائے گا، اور مدارس سے ناکارہ اور غیر سود مند افراد پیدا کرنے کا الزام بھی بہت حد تک اٹھ جائے گا۔

تنظیم المدارس پاکستان کا تجربہ: ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں آج سے تقریباً تیس سال سے زیادہ پہلے اہل سنت کے کچھ حساس علما اور دانشوروں نے تنظیم المدارس اہل سنت کے نام سے پاکستان کے مدارس اہل سنت کا ایک وفاق قائم کیا تھا، جو بحمدہ تعالیٰ کامیابی کے ساتھ آج بھی کام کر رہا ہے، جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور کے ناظم اعلیٰ حضرت علامہ مفتی عبدالقیوم ہزاروی علیہ الرحمہ نے بڑی تندہی اور اخلاص کے ساتھ تقریباً دو دہائی تک تنظیم المدارس کی خدمت کی، اور ملک کے بہت سے مدارس اہل سنت کو تنظیم سے جوڑا اور اس کی عالمیت اور فضیلت کی سندات کو حکومت پاکستان سے منظور کرایا، جس سے بہت سے سنی طلبہ نے علمی اور مادی فائدے حاصل کیے، اور یونیورسٹیوں میں داخلہ لیا، اور اعلیٰ دینی وعصری تعلیم حاصل کر کے ڈگریاں پائیں، برسر روزگار ہوئے، اور ہو رہے ہیں، اور علم اور دین کی بہترین خدمت کے ساتھ ساتھ خوش حال اور مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔

ایک حالیہ زبانی رپورٹ کے مطابق گزشتہ سال تنظیم المدارس اہل سنت پاکستان سے ملحق مدارس کے چھبیس ہزار طلبہ نے تنظیم کے سالانہ امتحانات میں شرکت کی ہے، جب کہ ابھی بہت سے ایسے سنی مدارس ہیں، جو تنظیم سے ملحق نہیں ہیں، بلکہ میرے خیال سے ایسے مدارس اکثریت میں ہیں، جن کے ذمہ داران نے جماعتی بے حسی، یا کسی مصلحت، یا واقعی مجبوری یا وسائل تعلیم کی قلت کے سبب اپنے مدرسوں کو تنظیم سے ابھی تک نہیں جوڑا ہے، اور فوائد سے محروم ہیں۔

تنظیم المدارس اور ہندوستان: ہندوستان میں اہل سنت کے کچھ اکابر ونوجوان علما بالخصوص الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور اور دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف کے ارباب تعلیم کی پہل پر ۲۲ رمحرم الحرام ۱۴۰۰ھ کو عرس یار علوی کے موقع پر براؤں شریف ضلع سدھارتھ نگر میں صوبائی سطح کی تنظیم المدارس کے قیام کے لیے ایک تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اور تنظیم کی ایک ایڈہاک کمیٹی تشکیل دے کر تنظیم المدارس کی دستور سازی اور نصاب سازی کا کام سپرد کیا گیا تھا۔

تنظیم کی پہلی تعلیمی کانفرنس منعقدہ براؤں شریف کی قرارداد کے مطابق دوسری تعلیمی کانفرنس الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں عرس عزیزی کے موقع پر ۲۹ رجمادی الاولی ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۶ اپریل ۱۹۸۰ء زیر صدارت حضور مجاہد ملت مولانا الحاج شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری علیہ الرحمۃ والرضوان منعقد ہوئی تھی، جس میں دستور ساز اور نصاب ساز کمیٹی کے دستور العمل اور نصاب تعلیم کے مسودوں پر بحث وتمحیص کے بعد ایک متحدہ نصاب تعلیم منظور کر کے شوال ۱۴۰۰ھ سے اس کے نفاذ کا اعلان بھی ہوا، اسی کانفرنس میں دستور العمل بھی پاس ہوگیا۔

اور یہ بھی طے ہوا کہ دستور کی روشنی میں تنظیم کی دو کمیٹیاں ہوں گی، (۱) مجلس شوریٰ (۲) مجلس عاملہ۔ مجلس شوریٰ ملحقہ مدارس کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی اور وہی مجلس عاملہ کا انتخاب کرے گی، اور جب تک صوبہ اتر پردیش کے کم از کم پچاس مدارس تنظیم سے ملحق نہ ہو جائیں، اس وقت تک عارضی کمیٹی کام کرتی رہے گی۔

مبارک پور میں منعقدہ اس دوسری کانفرنس میں منظور شدہ دستور العمل کے مطابق طے پایا تھا کہ عبوری دور تک کے لیے تنظیم المدارس کے دو دفتر ہوں گے (۱) دفتر بریلی شریف، برائے مدارس مغربی یوپی، (۲) دفتر مبارک پور، برائے مدارس مشرقی یوپی، اور تنظیم کا دائرۂ عمل ابتداءً یوپی ہوگا، پھر تدریجاً پورا ہندوستان ہو جائے گا۔

تنظیم المدارس کا دستور اور نصاب چھپ بھی گیا تھا، لیکن کسی وجہ سے عملی طور سے کام آگے نہ بڑھ سکا، اور نشستند وگفتند وبرخاستند ہی پر معاملہ ختم ہوگیا۔

یاد رہے کہ فقیر اس وقت الجامعۃ الاشرفیہ میں زیر تعلیم تھا، اور کانفرنس میں شریک ہو کر پوری

کارروائی بھی ملاحظہ کی تھی ضرورت ہے کہ اسی ادھورے کام کو آگے بڑھایا جائے اور ایک نئی ایڈہاک کمیٹی بنالی جائے، بعد میں باضابطہ مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ تشکیل دی جائیں، اور مدارس کے الحاق اور نظام امتحانات اور دیگر ضروری امور کی انجام دہی کے لیے دفتری عملہ مقرر کیا جائے جس کا ذمہ دار رجسٹرار ہو۔ لیکن پہلے سنی رسائل وجرائد میں نصاب کی تعیین، اصلاح وتحسین اور نظامِ تعلیم (یعنی نظام داخلہ، نظام درس اور نظام امتحان) دستور العمل، تشکیلی ڈھانچہ (یعنی انتظامی مجالس اور دفتری عملے) اور الحاق کے شرائط اور اس کے فوائد اور دیگر ضروری امور پر سال بھر تک بحث کی کھلی دعوت دی جائے اور تحریری تجاویز لی جائیں، اور تنظیم کے قیام اور اسے موثر طریقے سے چلانے اور اس سے مدارس کے الحاق کی ترغیبی مہم چلائی جائے، پھر سال بھر کی عام بحث کو سامنے رکھ کر رہبر اصول کی روشنی میں چند منتخب ماہرین تدریس وتعلیم ایک ماہ کی مدت میں کم از کم چار مسودۂ نصاب تیار کرلیں، اس کے بعد چاروں نصابوں کو سامنے رکھ کر یہی منتخب حضرات ایک متحدہ حتمی نصاب پر اتفاق کر کے اسے نفاذ کے لائق شکل دیں اور اسی دوران دستور العمل بھی تیار کرلیا جائے، پھر ایڈہاک کمیٹی مدارس کے اساتذہ اور ذمہ داران کی ایک تعلیمی کانفرنس بلاکر دستور العمل پاس کرائے اور تنظیم کی باضابطہ مجلس عاملہ بھی منتخب کرلی جائے اور ایڈہاک کمیٹی اپنا کام مجلس عاملہ کے حوالے کردے۔

نصاب میں ترمیم کی ضرورت اور عصری علوم کی شمولیت: موجودہ نصاب درس نظامی کی اساسی دینی روح کو مجروح کیے بغیر عصری علوم والسنہ کو بطور آلہ موجودہ دنیوی ودینی ضرورت کے بقدر محدود حصہ داری دی جائے، اور بہرحال مقصود اصلی رائج دینی علوم کی غالب حصہ داری باقی رکھی جائے، خاص طور سے سائنس اور ریاضی کو درجۂ ششم (اعدادیہ) تا ہشتم (ثانیہ) میں شامل نصاب کیا جائے، اور انگریزی زبان کو اعدادیہ سے سادسہ (عالمیت سال اخیر) تک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جائے، معقولات کی کتابیں نصاب سے کم کر کے ریاضی، سائنس اور انگریزی کے لیے گنجائش نکالی جاسکتی ہے، اس سے نصاب کا حجم جوں کا توں باقی رہے گا۔ فضیلت کے دو سالوں کے نصاب میں ہی رائج عمومی مقررات کے ساتھ یہ گنجائش ہو کہ علوم تفسیر یا علوم حدیث یا فقہ وافتا یا ادب عربی یا تقابل ادیان میں جزئی طور سے تخصص ہوجائے، اختصاص کے لیے دو یا تین گھنٹیاں خاص کردی جائیں۔

فضیلت کے دو سالوں میں جو بچے اختصاص نہ کرنا چاہیں، ان کے لیے فضیلت کے رائج عمومی مقررات کے علاوہ اختصاص کی دو یا تین خالی گھنٹیوں میں کمپیوٹر کی ٹریننگ حاصل کرنے کی سہولت فراہم کی جائے۔

ماہنامہ ''پیامِ حرم'' جنوری ۲۰۰۷ء کے شمارے میں نصاب میں ترمیم وتحسین، معقولات میں تخفیف، جدید علوم والسنہ کے شمول اور طریقۂ تدریس میں بدلاؤ سے متعلق ہم نے کچھ اظہار خیال کیا تھا، موقع کی مناسبت سے اس گفتگو کا اعادہ کیا جارہا ہے، تاکہ اس موضوع پر ہماری گزارشات اور تجاویز ان حضرات تک بھی پہنچ جائیں، جن تک ہم اپنی باتیں نہیں پہنچا سکے تھے۔

درس نظامی کی معنویت وجامعیت اور افادیت مسلم ہے، مگر ہم بدلتی حالت وضرورت سے بھی آنکھ بند نہیں کرسکتے۔تبدیلی تو درس نظامی کے نصاب میں بھی ہمیشہ سے ہوتی آرہی ہے۔اور بہت کچھ تبدیلی کے بعد بھی ابھی موجودہ نصاب کے علوم اور کتابوں میں مزید تبدیلی وتخفیف اور جدید وموثر طریقۂ تدریس اپنانے کی ضرورت

ہے۔موجودہ دور میں نئی ایجادات اور کھیل کود سے دل چسپیاں چوں کہ بڑھ گئی ہیں اس لیے بچوں کی نفسیات کا اور زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔اور ایسا دل چسپ نفسیاتی طریقۂ تدریس اختیار کرنا چاہیے، جس سے تعلیم کی طرف بچے کی رغبت زیادہ سے زیادہ ہو اور وہ پوری لگن کے ساتھ تعلیم حاصل کرے، لگن ہی سے بچہ محنت کرے گا اور جب محنت کرے گا تو باصلاحیت بنے گا، ورنہ وقت کی بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

مدارس کے نصاب میں قواعد کی مشق اور اجرا کی کمی بہت بڑا بنیادی عیب ہے، مشق واجرا نہ تو زبانی ہوتا ہے نہ تحریری، نتیجہ میں قواعد یاد نہیں رہ پاتے، اور یاد رہتے ہیں تو بول چال اور تحریر میں طلبہ انھیں برت نہیں پاتے۔لھذا زبانی اور تحریری دونوں طریقوں سے یا کم از کم تحریری طور سے مشق واجرا ضرور کرایا جائے۔

روزانہ کم از کم کسی ایک کتاب کے پڑھے ہوئے سبق کا خلاصہ ضرور لکھوایا جائے۔اس کے بے شمار فائدے ہیں، اور یہ کوئی نئی چیز نہیں، چار صدی سے پہلے شیخ عبد الحق محدث دہلوی اس پر عامل

تھے۔اور ہر گھنٹی میں ہر کتاب کے ہر سبق کی نئی یا مشکل مفید
وضروری باتوں کو نوٹ بک پر دورانِ درس یا بعد میں لکھتے رہنے کی عادت ڈلوائی جائے۔
تختۂ سیاہ یا نئی ایجاد کمپیوٹر کا استعمال سبق کے خلاصے یا مشکلات کی تشریح کے لیے ضرور کیا جانا چاہیے۔چوں کہ وقت کی قلت علوم عقلیہ کی وقعت، طلبہ کی بے رغبتی وغفلت اور کچھ نئے علوم والسنہ کو داخل نصاب کرنے کی ضرورت نے منطق وفلسفہ کی اہمیت پہلے سے بہت کم کر دی ہے۔اس لیے مجبوراً منطق وفلسفہ کی کتابیں عام نصاب تعلیم سے مزید کم کر دی جائیں۔فلسفہ میں ہدایۃ الحکمت، اصطلاحات جاننے کے لیے ضروری اور کافی ہے منطق کی بھی صرف دو یا تین ہی کتابیں پڑھائی جائیں، لیکن تخفیف تدریجاً ہونی چاہیے، منطق وفلسفہ کی موجودگی نصاب میں اس لیے ضروری ہے کہ اصول اور گرامر یعنی صرف ونحو وبلاغت کی بہت سی کتابوں پر معقولی رنگ چڑھا ہوا ہے،اس طرح کی معقولیت زدہ کتابوں کے نصاب میں موجود رہنے تک اصطلاحات جاننے کی حد تک منطق وفلسفہ کی دو ایک کتابوں کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی، پھر ذہنی ورزش اور دماغی جولانیت کے لیے بھی معقولات کا وجود مفید ہے،اس لیے نصاب سے ایک دم معقولات کا دیس نکالا کسی حد تک مضر ہوگا۔لیکن ایسا بھی نہیں کہ معقولات پڑھے بغیر کوئی قابل نہیں ہوسکتا،ورنہ پھر جلیل القدر فقہائے صحابہ، تابعین اور ائمۂ فقہ وتفسیر وحدیث یعنی امام اعظم اور امام بخاری جیسے نابغۂ روزگار بزرگوں کی قابلیت وصلاحیت کے بارے میں سوالات اٹھ کھڑے ہوں گے۔فارسی کی کتابیں بھی مزید کم کر دی جائیں۔ منطق وفلسفہ اور فارسی کی کتابوں کی تخفیف سے نصاب تعلیم میں انگریزی زبان، ابتدائی ریاضی اور سائنس کے لیے جگہ نکل آئے گی۔چوں کہ انگریزی عالمی زبان بن چکی ہے،اس لیے اس میں بولنے اور لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ضروری ہے۔نیز کمپیوٹر کی زبان بھی انگریزی ہی ہے اور کمپیوٹر ہر فرد کے لیے ناگزیر بنتا جا رہا ہے۔لھذا انگریزی کو اعدادیہ سے سادسہ تک پڑھایا جائے۔دین ودنیا دونوں میں ریاضی کی ضرورت ہے، سائنس کو مڈل کلاس یعنی فوقانیہ کے تین سالوں اعدادیہ، اولی اور ثانیہ تک لازم کیا جائے سائنس کی تعلیم کے لیے بھی ریاضی کی ضرورت ہوگی اور علم فرائض کو سمجھنے کے لیے تو اس کی ضرورت مسلم ہی ہے۔
صرف ونحو اور بلاغت کی جو رائج کتابیں، فارسی زبان میں ہیں یا ایجاز مخل کا نمونہ ہیں یا

منطقیانہ وفلسفیانہ رنگ میں رنگی ہوئی ہیں، جن کی وجہ سے قواعد کو سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے ان کی جگہ آسان عربی زبان میں انتہائی سہل اور دل پذیر انداز میں صرف ونحو اور بلاغت کی وہ کتابیں داخل درس کی جائیں، جو عرب جامعات میں پڑھائی جارہی ہیں، جن میں مشق واجرا کا اہتمام نصاب وکتاب کا جزء لاینفک ہوتا ہے۔ اور ان کی دست یابی اب ناممکن یا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہ گئی ہے۔ کم از کم کچھ بڑے مدارس کے لیے نسبتاً حصولیابی آسان ہو گئی ہے اور مزید ہوتی جارہی ہے۔

صرف ونحو وبلاغت ہی کیا، اب تو فقہ اور تفسیر واصول تفسیر وغیرہ علوم کی کتابیں بھی نئی ترتیب وتسہیل کے ساتھ آچکی ہیں۔ نصاب میں پرانی کتابوں کی جگہ ان کتابوں کے انتخاب پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر درس نظامی کے نصاب میں مجوزہ تبدیلی وترمیم، تخفیف واضافہ اور اصلاح وتحسین ہو جائے اور طریقۂ تدریس بدل دیا جائے تو یقیناً یہ نصاب نئی شکل میں سب سے بہتر اور پہلے سے زیادہ مفید ونتیجہ خیز نصاب ہو جائے گا"۔

اختصاص: نو سالہ نصاب کی تکمیل کے لیے عام طلبہ کے پاس وقت نہیں ہوتا، اس لیے بہتر یہ ہے کہ عالمیت کے دو سالہ کورس کی تکمیل پر عام طلبہ کو فارغ کر دیا جائے اور اس کے بعد فضیلت کے دو سالوں میں صرف مخصوص باذوق اور ذہین طلبہ کو اختصاص کرایا جائے۔

نصاب میں اختصاص کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ درس نظامی کے نصاب سے صدیوں پہلے بھی مخصوص لوگ اپنے ذوق وفرصت کے مطابق کسی فن، تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، معقولات، نحو اور بلاغت میں اختصاص کرتے تھے۔ اس کی ضرورت واہمیت جیسے کل تھی ویسے ہی آج بھی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ فضیلت کے دو سالوں ہی میں اختصاص کا اہتمام کیا جائے۔ مدرسے کے وسائل آمدنی جہاں تک ساتھ دیں اتنے ہی زیادہ فنون میں اختصاص بڑھاتے جائیں، بڑے مدارس میں کم از کم دو فنوں حدیث یا فقہ اور تفسیر یا ادب یا تقابل ادیان میں اختصاص کا انتظام ہونا چاہیے۔

نصاب سازی کا طریقۂ عمل: نصاب سازی کے سلسلے میں ہم نے اس سے پہلے بھی اظہار خیال کرتے ہوئے ایک بار لکھا تھا، اس کا اعادہ بھی مناسب رہے گا۔

نصاب سازی کا کام صرف ایک آدمی کا نہیں خواہ وہ کتنا ہی قابل ذہین اور ماہر وتجربہ کار کیوں

نہ ہو بلکہ انتہائی ذہین صاحب نظر تجربہ کار اور ماہر نفسیات اساتذہ کا منتخب نصاب ساز بورڈ ہی یہ کام بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ تاکہ وہ اپنی ذہانت اور مشق و تجربے کی مدد سے اس نازک ترین کام کے ہر مفید و معتبر پہلو پر نظر رکھ کر نصاب کی تدوین کرے، اس کے لیے بہت جلد بازی بھی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ منصوبہ بند طریقے سے کام شروع کیا جائے اور مناسب وقت دیا جائے، بہتر یہ ہوگا کہ مختلف علاقوں اور مختلف مدارس کے لائق اساتذہ پہلے نصاب سازی کے رہبر اصول طے کریں اور بنیادی امور پر اتفاق کریں، پھر ان اصول و امور کی روشنی میں دو، دو، چار، چار کی ٹیم، دو چار نصابوں کا مسودہ تیار کرے، پھر یہی لوگ ایک سیمینار میں ان مسودوں پر بحث کریں اور کسی ایک مسودۂ نصاب پر، یا معجون مرکب پر اتفاق کریں، اس کے بعد اسے نافذ کیا جائے۔

[پیام حرم فروری ۲۰۰۸ء]

امام احمد رضا ایک مظلوم مصلح

چودہویں صدی ہجری کے مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری علیہ الرحمۃ والرضوان [ولادت ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء، وفات ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء] نے اپنی قیمتی عمر کا بیشتر حصہ یعنی پچاس سال سے زائد وقت تجدید واحیائے دین وملت، تبلیغ واصلاح امت، نصرت وحمایت سنت وشریعت اور ان اعتقادی ونظریاتی نیز عملی واخلاقی بدعات وخرافات کی تردید واستیصال میں گزارا، جو خاص طور سے برصغیر کے مسلم سماج کو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑے ہوئے تھے، اور امت مسلمہ دن بہ دن حقیقی دینی مزاج اور معتدل اسلامی رویے سے دور ہوتی جارہی تھی، جاہلانہ اوہام وخیالات اور غیر اسلامی رسم ورواج کی اصلاح اور بدعات ومنکرات کا رد واستیصال اعلیٰ حضرت کی حیات طیبہ کا انتہائی روشن باب ہے، آپ نے جس سرگرمی اور دل جمعی سے سنت کی نصرت وحمایت اور بدعت کی مخالفت کی اور زبردست قلمی جہاد فرمایا، اس کی نظیر کئی صدیوں کی تاریخ تجدید واحیائے دین میں مشکل سے ملے گی، آپ نے فرائض وواجبات کی ادائگی اور طبعی حاجات کی تکمیل کے بعد کنج خمولی میں بیٹھ کر بلا خوف لومۃ لائم اپنا سارا وقت اس اہم کام میں گزارا۔

وقت کی قدردانی کے احساس اور حفاظت واشاعت دین کے اس غیر معمولی اور بے مثال جذبے کے ذریعے قدرت نے آپ سے ایسا عظیم تصنیفی کام لیا کہ علامہ جلال الدین سیوطی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے آپ نے ضخیم بارہ جلدوں میں فتاویٰ رضویہ سمیت تقریباً ایک ہزار کتابیں یادگار چھوڑیں، جو آج بھی دنیا کو اصلاح وتبلیغ کا فیض پہنچارہی ہیں۔ اس عظیم خدمت کے لیے آپ کے اندر عشق رسول کے بے پناہ جذبے اور علم وعرفان کی لازوال دولت نے مہمیز کا کام کیا، اور صحیح اسلامی عقیدہ وعمل سے منحرف ہونے والی نئی تحریکوں اور ان کے حاملین وتبعین کے علمی تعاقب اور غیر اسلامی عقائد ونظریات ، باطل اوہام وخیالات ، لادینی اعمال وکردار اور جاہلانہ مراسم وعادات اور رائج بدعات وخرافات میں مبتلا عام انسانوں اور مسلمانوں کی اصلاح کا اہم وبے مثال مجددانہ فریضہ بحسن وخوبی انجام دلوایا، جو رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ امام احمد رضا قادری علیہ الرحمۃ والرضوان کے وصال کو ایک صدی پوری ہونے کو

ہے، لیکن علم وقلم کے ذریعے آپ نے جو تجدیدی واصلاحی خدمات انجام دیں، ان کے مثبت ومفید اثرات آج بھی بہت نمایاں طور سے محسوس کیے جارہے ہیں۔

قدرت کی خصوصی عنایت سے امام احمد رضا قدس سرہ کی خوبی اور خوش نصیبی کہیے کہ ان کے اخلاص عمل کی برکت سے عظیم واہم تحریری ذخیرے کے ساتھ تلامذہ وخلفا کی شکل میں برصغیر کی بے شمار عالی دماغ، انتہائی وفادار و باصلاحیت، حد درجہ مستعد ومحنتی اور مخلص وصاحب اثر دینی وعلمی اور روحانی شخصیات کی ایک بھاری تعداد نے آپ کے دامن علم وعمل سے وابستہ ہوکر آپ سے کسب فیض کیا اور آپ کی حیات میں اور پھر اس کے بعد تجدید واحیائے دین اور اصلاح اعتقاد وعمل کے سلسلے کو پوری دل چسپی اور تندہی کے ساتھ جاری رکھا، پھر پورے تسلسل کے ساتھ رضوی تلامذہ وخلفا سے فیض یاب علما ومشائخ پوری لگن کے ساتھ امام احمد رضا کے تجدیدی واصلاحی مشن کو آگے بڑھا رہے ہیں، اور امام احمد رضا کا یہ دعوتی مشن ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے، جس کے قافلہ سالار دور حاضر کے علما ومشائخ اہل سنت ہیں، جو اسلام کے سواد اعظم کی فکری واعتقادی، علمی وروحانی اور سیاسی وسماجی قیادت ورہنمائی فرمارہے ہیں۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز نے خود کوئی خانقاہ نہیں بنائی اور نہ منظر اسلام بریلی کے سوا کوئی اور مدرسہ قائم کیا، بلکہ آپ نے تصنیف وشخصیت سازی پر زیادہ توجہ دی اور ہر فلڈ کے ایسے کارآمد علما ومشائخ تیار کیے، جن کے ذریعہ برصغیر اور اس کے باہر دوسرے ممالک میں مدرسوں، خانقاہوں، مسجدوں، اور تصنیفی واشاعتی اداروں کی صورت میں ہزاروں دینی واصلاحی اور دعوتی وتعلیمی مراکز قائم ہوئے، جن کے فیض سے برصغیر ہی نہیں، بلکہ پوری دنیا فیض یاب ہورہی ہے، برصغیر کے بیشتر مسلمانان اہل سنت رضوی فکر ہی سے وابستہ ہیں۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز کی تصنیفات کے ذریعے اور بلاواسطہ وبالواسطہ ان کے تلامذہ وخلفا کی مساعی جمیلہ سے تدریس وافتا، تصنیف واشاعت، دعوت وارشاد، تقریر ومناظرہ، اور روحانی تعلیم وتربیت کے ذرائع سے برصغیر کے اندر دین اسلام کی حفاظت واشاعت اور اعتقادی وعملی بدعات کے خاتمے کا جو کام ہوا، وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

امام احمد رضا قدس سرہ نے بدعات کے خاتمے کے لیے اپنی پوری قلمی توانائی صرف کر دی اور سیکڑوں کتابوں اور طویل ومختصر فتاویٰ کے ذریعہ بدعات ومنکرات کا خاتمہ کیا۔ ان شاء اللہ ہم حوالے کے ساتھ شہادت وثبوت کے لیے ان کی تصانیف اور فتاویٰ سے کچھ نمونے ذکر کریں گے۔

تجدید واحیائے دین اور اصلاح فکر وعمل ایک جوکھم بھرا کام ہے، مجددین امت وارث انبیا بن کر یہ کام انجام دیتے رہے ہیں، انبیائے کرام کو دعوت کے کام میں قدم قدم پر جاں گسل مشکلات اور صبر آزما مزاحمتوں کا سامنا ہوا، اسی لیے ان کا رتبہ بھی بندوں میں سب سے زیادہ بلند ہوتا ہے: ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

مجدد وقت امام احمد رضا قدس سرہ کو بھی تجدید دین واصلاح امت اور بدعات کے استیصال کی مہم میں قوم کے کچھ خواص وعوام کی طرف سے بے شمار مخالفتوں اور ایذا رسانیوں سے واسطہ پڑا، ان کی عزت پر حملے کیے گئے، گالی بھرے خطوط بھیجے گئے، تحریر وتقریر کے ذریعہ انھیں جی بھر کے بدنام کیا گیا، انھیں برابر شدت پسند، کافر ساز، بدعت نواز، قبر پجوا، امت مسلمہ میں تفریق پیدا کرنے والا اور نئے فرقے کا بانی کہا اور لکھا گیا، امام احمد رضا قدس سرہ ایشیا کے وہ مظلوم بدعت شکن مصلح ہیں، جنھوں نے زندگی بھر بدعات کے خلاف سخت قلمی جہاد کیا، مگر الٹے انھیں بدعات کا حامی مشہور کر دیا گیا۔

امام احمد رضا نے جب قادیانیت، شیعیت، وہابیت، ندویت، نیچریت، تحریک خلافت اور متحدہ قومیت جیسے غیر اسلامی افکار ونظریات اور گمراہ کن تحریکات کا علمی محاسبہ اور تعاقب کیا اور ان تحریکوں کی اعتقادی بدعات کی گرفت کر کے اصلاح کی دعوت دی اور صحیح اسلامی نظریہ پیش کیا، تو جہاں بہت سے لوگ حقیقت سے آگاہ ہو کر تائب ہوئے اور اصلاح قبول کی، وہیں ان نئی تحریکات اور نئے نظریات کے بعض بانیان اور بہت سے حاملین ومعتقدین خاص طور سے اہل توہب اصلاح حال کی بجائے ضد میں آکر اور اپنی تحریک اور نظریے کو زد میں آتے دیکھ کر ان کے سخت مخالف ہو گئے، اور مخالفت وایذا رسانی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اندھی مخالفت میں آپ کی شخصیت پر انتہائی گندی کیچڑ اچھالی گئی اور آپ کے دامن عزت کو ہر ممکن حد تک داغ دار کرنے کی کوشش کی گئی، ان کی شخصیت پر ذاتی نوعیت کے بے سروپا جھوٹے الزامات لگائے گئے، ان کے علم پر حملہ کرتے ہوئے انھیں "قلیل البضاعة فی الحدیث"

کہا گیا۔ان کے عقیدے پر وار کرتے ہوئے کہا گیا کہ وہ رسول کو بڑھا کر خدا تک پہنچا دیتے ہیں، اسی طرح کے جھوٹے الزامات میں ایک بڑا الزام یہ بھی ہے کہ امام احمد رضا نے بدعات کو رواج دیا، اور ان کی حوصلہ افزائی کی، اور ان کے ماننے والے قبروں کو سجدہ کرتے ہیں، جب کہ حقیقت سے اس بات کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ سب کچھ صرف اور صرف فطری ردِعمل کے طور پر ان کے فکری مخالفین کی جھنجھلاہٹ اور سوچی سمجھی منصوبہ بند ناپاک مہم کا ایک حصہ ہے، جو حقائق سامنے آنے کے بعد ناکام ہوتی جارہی ہے۔

ہمارا فرض ہے کہ بدعات کی مخالفت اور ان کی بیخ کنی سے متعلق امام احمد رضا کی تصانیف میں جو وافر ذخیرہ ہے، اسے زیادہ سے زیادہ غلط فہمی میں مبتلا سادہ لوح اور بے خبر حق پسند اور انصاف پسند لوگوں کے سامنے لائیں اور تحریر وتقریر کے ذریعہ حوالے کے ساتھ بتایا جائے کہ اصل میں حقائق یہ ہیں ،جن پر پردہ ڈال دیا گیا،ایک بدعت شکن کو بدعت نواز
بنا کے پیش کیا گیا، جو بتایا گیا، وہ جھوٹا پروپیگنڈہ تھا، اصل حقیقت یہ ہے، جو کتابوں میں موجود ہے، امام احمد رضا قدس سرہ نے عوام میں رائج جن غیر اسلامی رسومات اور بدعات وخرافات کا رد کیا، اور قرآن کی روشنی میں سخت موقف اور رویہ اختیار فرمایا، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

(۱) سجدۂ تعظیمی (۲) قبروں کا بوسہ وطواف (۳) مزارات پر عورتوں کی حاضری (۴) فرضی قبر بنانا (۵) قبر پر یا قبر کی طرف نماز (۶) قبر پر لوبان، چراغ اور اگربتی جلانا (۷) مزامیر کے ساتھ قوالی (۸) پیر سے بے پردگی (۹) مردہ کا کھانا (۱۰) تعزیہ داری (۱۱) مراسم محرم (۱۲) مراسم شادی (۱۳) بزرگوں کی تصویر بنانا، رکھنا (۱۴) آخری بدھ (۱۵) امام ضامن باندھنا (۱۶) بدمذہب کی امامت۔

سجدۂ تعظیمی: امام احمد رضا قدس سرہ کا قرآن وحدیث اور اجماع امت کے مطابق عقیدہ تھا کہ کسی غیر اللہ یعنی پیر یا مزار وغیرہ کے سامنے تعظیم کا سجدہ کرنا ناجائز وحرام ہے، سجدہ کی دو قسمیں (۱) سجدۂ عبادت یعنی لائق عبادت سمجھ کر سجدہ کرنا (۲) سجدۂ تعظیمی یعنی احترام وتعظیم کے اظہار کے لیے سجدہ کرنا۔

امام احمد رضا قدس سرہ نے سجدۂ تعظیمی کی حرمت پر" الزبدة الزكية لتحريم سجود

التحیۃ'' کے نام سے ۸۰ صفحات پر مشتمل پورا ایک رسالہ ہی تحریر فرمادیا ہے، جس میں ۷۰ نصوص سے ثابت کیا ہے کہ سجدہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، غیر کے لیے کسی نیت سے ہو، مطلقاً ناجائز و حرام اور گناہ کبیرہ ہے، اور ان متصوفین و مجاورین کا زبردست رد فرمایا ہے، جو سجدۂ تعظیمی کے قائل اور عامل ہیں اور دنیا کمانے کے لیے بھولے بھالے عوام کو بھی اس پر مجبور کرتے ہیں، امام احمد رضا قدس سرہ تفصیل سے تحریر فرماتے ہیں:

''سجدہ حضرت عزت جل جلالہ کے سوا کسی کے لیے نہیں، اس کے غیر کو سجدۂ عبادت تو یقیناً شرک مبین و کفر مبین، اور سجدۂ تحیت (تعظیمی سجدہ) حرام و گناہ کبیرہ بالیقین، اس کے کفر ہونے میں اختلاف علمائے دین، ایک جماعت فقہا سے تکفیر منقول اور عند التحقیق کفر صوری پر محمول، ہاں مثل صنم وصلیب و شمس و قمر کے لیے سجدے پر مطلقاً اکفار، کما فی شرح المواقف وغیرہ من الاسفار، ان کے ماسوا مثل پیر و مزار کے لیے ہرگز ہرگز نہ جائز و مباح جیسا کہ زید کا ادعائے باطل، نہ شرک حقیقی نامغفور جیسا کہ وہابیہ کا زعم باطل، بلکہ حرام اور کبیرہ... یغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء۔ ابطال شرک کے لیے تو وہی واقعۂ حضرت آدم اور مشہور جمہور پر واقعۂ یوسف علیہما الصلوٰۃ والسلام بھی دلیل کافی۔ (الزبدۃ الزکیہ ص۵)

قرآن عظیم نے ثابت فرمایا کہ سجدۂ تحیت ایسا سخت حرام ہے کہ مشابہ کفر ہے، صحابۂ کرام نے حضور کو سجدۂ تحیت کی اجازت چاہی، اس پر ارشاد ہوا، کیا تمھیں کفر کا حکم دیں؟ معلوم ہوا کہ سجدۂ تحیت ایسی قبیح چیز ہے، جسے کفر سے تعبیر فرمایا، جب خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے سجدۂ تحیت کا یہ حکم ہے پھر اوروں کا کیا ذکر، واللہ الہادی۔ (ایضاً ص۱۰)

قبر کا بوسہ و طواف: امام احمد رضا قدس سرہ سجدۂ تعظیمی اور قبر کے بوسے کو بھی ناجائز اور اس کے طواف کو ممنوع قرار دیتے ہیں، ایک سوال کے جواب میں فرمایا: ''بلاشبہ غیر کعبہ معظمہ کا طواف تعظیمی ناجائز ہے ......اور بوسۂ قبر میں علما کو اختلاف ہے، اور احوط منع ہے۔'' (احکام شریعت سوم ص۳) فتاویٰ میں فرماتے ہیں:

''مزار کا طواف کہ محض بہ نیت تعظیم کیا جائے، ناجائز ہے، کہ تعظیم بالطواف مخصوص بخانۂ کعبہ ہے، مزار کو بوسہ دینا نہ چاہیے، علما اس میں مختلف ہیں، اور بہتر بچنا اور اسی میں ادب زیادہ ہے، آستانہ بوسی

(یعنی چوکھٹ چومنے) میں حرج نہیں۔ [فتاویٰ رضویہ ج ۴/۸]

فرضی مزار: امام احمد رضا قدس سرہ فرماتے ہیں: فرضی مزار بنانا اور اس کے ساتھ اصل کا سا معاملہ کرنا ناجائز و بدعت ہے"۔ [ایضاً ص ۱۱۵]

ایک اور جگہ فرماتے ہیں: "قبر بلا مقبور کی طرف بلانا اور اس کے لیے وہ افعال کرانا گناہ ہے اور جب کہ وہ اس پر مصر ہے اور باعلان

اسے کر رہا ہے، تو فاسق معلن ہے اور فاسق معلن کو امام بنانا گناہ اور نماز پھیرنی واجب، اس جلسۂ زیارت قبر بلا مقبور میں شرکت جائز نہیں"۔ [ایضاً]

قبر کی طرف اور قبر پر نماز: فرماتے ہیں "قبر پر نماز پڑھنا حرام اور قبر کی طرف نماز پڑھنا حرام .... اگر مسجد میں کوئی قبر آ جائے تو اس کے آس پاس چاروں طرف تھوڑی دیوار، اگر چہ پاؤ گز ہو، قائم کر کے اس پر چھت بنائیں کہ اب نماز قبر کی طرف نہ ہوگی"۔ [عرفان شریعت ج ۳/۲]

قبر پر چراغ، لوبان اور اگربتی: فرماتے ہیں: "عود، لوبان وغیرہ کوئی چیز نفس قبر پر رکھ کر جلانے سے احتراز چاہیے، اگر چہ کسی برتن میں ہو" [فتاویٰ رضویہ ج ۴/ ۱۴۱] "اگربتی قبر کے اوپر رکھ کر نہ جلائی جائے کہ اس میں سوئے ادب اور بدفالی ہے...... قریب قبر زمین خالی پر سلگائیں کہ خوشبو محبوب ہے"۔ [ایضاً ص ۱۸۵]

مزارات پر عورتوں کا جانا: امام احمد رضا قدس سرہ مزارات پر عورتوں کے جانے کو ناجائز اور باعث لعنت سمجھتے ہیں، فرماتے ہیں: "اصح یہ ہے کہ عورتوں کو قبروں پر جانے کی اجازت نہیں" [ایضاً ص ۱۶۵] غنیہ میں ہے یہ نہ پوچھو کہ عورتوں کا مزارات پر جانا جائز ہے یا نہیں؟ بلکہ یہ پوچھو کہ اس عورت پر کس قدر لعنت ہوتی ہے؟ اللہ کی طرف سے اور کس قدر صاحب قبر کی جانب سے، جس وقت وہ گھر سے ارادہ کرتی ہے لعنت شروع ہو جاتی ہے اور جب تک واپس آتی ہے ملائکہ لعنت کرتے رہتے ہیں۔ سوائے روضۂ انور کے کسی مزار پر جانے کی اجازت نہیں، وہاں کی حاضری البتہ سنت جلیلہ عظیمہ قریب بواجب ہے اور قرآن عظیم نے اسے مغفرت ذنوب کا تریاق بتایا۔ [الملفوظ حصہ ۲ ص ۶]

تعزیہ داری: امام احمد رضا سے سوال ہوا کہ جو شخص تعزیہ بنانا سنت جانے وہ کیسا ہے؟ تو فرمایا: "وہ جاہل خطاوار، مجرم ہے، مگر کافر نہ کہیں گے، تعزیہ آتا دیکھ کر اعراض و روگردانی کریں، اس کی طرف دیکھنا ہی نہ

چاہیے"۔[عرفان شریعت حصہ ا؍ص ۱۵]

تعزیہ داری کہ اس طریقہ نا مرضیہ کا نام ہے، قطعاً بدعت و ناجائز و حرام ہے، ان خرافات کے شیوع نے اس اصل مشروع کو بھی اب محذور و ممنوع کر دیا کہ اس میں اہل بدعت سے مشابہت اور تعزیہ داری کی تہمت کا خدشہ اور آئندہ اپنی اولاد یا اہل اعتقاد کے لیے ابتلائے بدعات کا اندیشہ ہے"۔[بدرالانوار؍ص ۴۹]

محرم کی رسمیں: آپ سے سوال ہوا کہ (۱) بعض سنت جماعت عشرۂ محرم میں نہ تو دن بھر روٹی پکاتے ہیں اور نہ جھاڑو دیتے ہیں (۲) دس دن کپڑے نہیں اتارتے (۳) ماہ محرم میں کوئی شادی بیاہ نہیں کرتے، تو آپ نے فرمایا: "تینوں باتیں سوگ ہیں اور سوگ حرام ہے"۔[احکام شریعت ج ا؍ص ۷۵]

قوالی: آپ سے سوال کیا گیا کہ قوالی اس طریقے سے ہو رہی ہے کہ ایک ڈھول دو سارنگی بج رہی ہیں اور چند قوال پیران پیر دستگیر کی شان میں اشعار کہہ رہے ہیں اور رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت کے اشعار اور اولیاء اللہ کی شان میں اشعار گا رہے ہیں، ایسی قوالی جائز ہے یا نہیں؟ تو فرمایا:

"ایسی قوالی حرام ہے، حاضرین سب گنہ گار ہیں اور ان سب کا گناہ ایسا عرس کرنے والوں اور قوالوں پر ہے اور قوالوں کا بھی گناہ اس عرس کرنے والے پر بغیر اس کے کہ عرس کرنے والوں کے ماتھے قوالوں کا گناہ جانے سے قوالوں پر سے گناہ کی کچھ کمی آئے یا اس کے اور قوالوں کے ذمہ حاضرین کا وبال پڑنے سے حاضرین کے گناہ میں کچھ تخفیف ہو"۔[احکام شریعت ج ا؍ص ۲۹]

پیر سے بے پردگی: سوال ہوا کہ (۱) پیر سے پردہ ہے یا نہیں؟ (۲) ایک بزرگ عورتوں سے بے حجاب حلقہ کراتے ہیں اور حلقہ کے بیچ میں خود بزرگ صاحب بیٹھتے ہیں.....ایسی بیعت ہونا کیسا ہے؟ جواب میں ارشاد فرمایا: (۱) پیر سے پردہ واجب ہے، جب کہ محرم نہ ہو (۲) یہ صورت محض خلاف شرع و خلاف حیا ہے، ایسے پیر سے بیعت نہ

چاہیے"۔[ایضاً ج ا؍ص ۲۹]

آتش بازی: فرماتے ہیں: "آتش بازی جس طرح شادیوں اور شب برات میں رائج ہے، بیشک حرام ہے، اور پورا جرم ہے کہ اس میں تضییع مال ہے"۔[ہادی الناس؍ص ۴]

میت کے غسل کا گھڑا: سوال ہوا کہ گھڑے بدھنے میت کو غسل دینے کے بعد پھوڑ ڈالنا چاہیے؟ تو فرمایا: ''گناہ ہے کہ بلاوجہ تضییع مال ہے کہ اگر وہ ناپاک بھی ہو جائیں تاہم پاک کر لینا ممکن..... اور اگر یہ خیال کیا جائے کہ ان سے مردے کو نہلایا ہے، تو ان میں نحوست آگئی، تو یہ خیال اوہام کفار ہند سے ملا ہے''۔ [فتاویٰ رضویہ ج ۴ ص ۱۷۶]

جاہلانہ اوہام: سوال ہوا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ فلاں درخت پر شہید مرد ہیں اور فلانے طاق میں شہید مرد رہتے ہیں اور اس درخت اور اس طاق کے پاس جا کر ہر جمعرات کو فاتحہ، شیرینی اور چاول وغیرہ پر دلاتے ہیں، ہار لٹکاتے ہیں، لوبان سلگاتے ہیں، مرادیں مانگتے ہیں...... یہ اشخاص حق پر ہیں یا باطل پر؟ آپ نے جواب دیا: ''یہ سب واہیات، خرافات اور جاہلانہ حماقات و بطالات ہیں، ان کا ازالہ لازم ''۔ [احکام شریعت ج ۱ ص ۱۳]

امام ضامن باندھنا: سوال ہوا کہ امام ضامن کا پیسہ باندھا جاتا ہے، اس کی کوئی اصل ہے؟ فرمایا: ''کچھ نہیں''۔ [الملفوظ حصہ ۳ ص ۳۵]

بزرگوں کی تصویر: سوال ہوا کہ بزرگان دین کی تصاویر بطور تبرک لینا کیسا ہے؟ فرمایا: ''کعبہ معظمہ میں حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل و حضرت مریم کی تصاویر یہی تھیں کہ یہ متبرک ہیں، ناجائز فعل تھا، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود دست مبارک سے انہیں دھویا''۔ [ایضاً حصہ ۴ ص ۸۷]

[پیام حرم مارچ ۲۰۰۸ء]

آہ! مولانا محمد نعمان خان قادری علیہ الرحمہ

۲۱ صفر ۱۴۲۹ھ / ۲۹ فروری ۲۰۰۸ء جمعہ کا دن گذار کر شب میں ۱۱ بج کر ۱۰ منٹ پر استاذ العلما حضرت مولانا محمد نعمان خان اعظمی قادری مصباحی صدر المدرسین جامعہ حنفیہ رحمت گنج شہر بستی یوپی ستر سال کی عمر میں مختصر علالت کے بعد شہر بستی میں اچانک انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت علیہ الرحمہ عمر طبعی کو پہنچنے کے بعد بھی بظاہر کسی ایسے مرض میں مبتلا نہیں تھے، جس کی بنا پر یہ سوچا جاسکتا ہو کہ وقت موعود اتنا قریب آپہونچا ہے، اس لیے موت کا یہ حادثہ ناگہانی ہی کہا جائے گا، اسی وجہ سے موت کی خبر پانے والا ہر شخص دم بخود رہ گیا۔ کبھی کبھی سانس پھولنے کی تکلیف ہو جاتی تھی مگر جلد ہی پھر افاقہ ہو جاتا تھا، موت سے چند ایام پہلے ٹائیفائڈ کی شکایت ہوگئی تھی، علاج چل رہا تھا، مگر معمول کے مطابق سارا کام بغیر خلل کے جاری تھا، انتقال سے چند دن پہلے خود مجھ سے دو بار فون پر رابطہ ہوا، مگر اپنی بیماری کا اظہار نہیں فرمایا، اور نہ آپ کی گفتگو ہی سے ایسا کچھ اندازہ ہو سکا، ہاں دو چار روز پہلے اپنے شاگرد اور دارالعلوم علیمیہ کے استاذ مفتی مولانا اختر حسین قادری علیمی سے فون پر خیریت دریافت کرنے پر فرمایا کہ بخار رہتا ہے، مگر سب کام ہو رہا ہے، انتقال کے روز رکشے پر کسی کام سے شہر بھی گئے تھے، دن میں جامعہ کے سکریٹری عالی جناب امیر اللہ صاحب عزیزی سے فرمایا: سکریٹری صاحب! اب میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں، انھوں نے کہا: پھر بھی ٹائیفائڈ ہے، دوا بند نہ کریں گے۔

اپنی عادت کے مطابق جامعہ حنفیہ کے طلبہ کو مدرسے کے بغل کی نورانی مسجد میں لے جا کر باجماعت نماز عشا پڑھی، پڑھائی، کھانا بھی کھایا، آرام کے لیے لیٹے، حسب معمول مخصوص طلبہ ہاتھ پیر دبانے کی روزینہ خدمت کے بعد مطمئن ہو کر چلے گئے، نو بجے کے بعد استنجا کے لیے ٹوائلٹ گئے، ٹوائلٹ سے اپنے کمرے کی طرف واپس ہوتے ہوئے درمیان میں واقع جامعہ حنفیہ کے استاذ مولانا نفیس احمد علیمی کے کمرے کے سامنے ان سے گھبراہٹ کے ساتھ فرمایا:

مولانا نفیس صاحب! میری سانس پھول رہی ہے، اب میں نہیں بچوں گا، سکریٹری صاحب کو

بلایئے، شہر کے باہر ہونے کی وجہ سے ان کی آمد سے مایوس ہو کر فرمایا: یہ ڈیسک کی چابی ہے، سکریٹری صاحب کو دے دیجیے گا، موت کا احساس ہو چکا تھا، اس لیے اساتذہ کے کہنے کے باوجود کسی طرح ڈاکٹر کے پاس جانے کو تیار نہیں ہو رہے تھے، زیادہ اصرار کرنے پر تیار ہو گئے، کرتا پہنا، اور گاڑی میں لیٹ کر ڈاکٹر کے پاس جا رہے تھے، ڈاکٹر کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی ساتھ کے اساتذہ حضرات نے اترنے کے لیے اٹھانا چاہا، اور حضرت! حضرت! کہہ کر کئی بار مخاطب کیا، لیکن حضرت تو لذت دیدار یار میں محو دوسری دنیا کو سدھار چکے تھے، ملک عدم کا مسافر اس دنیا سے اُس دنیا میں چلا گیا تھا، اور جس کی آغوش میں سر رکھ کر لیٹے ہوئے تھے، اسے ذرہ برابر احساس بھی نہیں ہوا۔

یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ" رات ڈیڑھ بجے ایمبولنس کے ذریعہ آپ کی میت آپ کے وطن دیوگاؤں اعظم گڑھ روانہ کر دی گئی، دوسرے دن بعد نماز عصر نماز جنازہ کا اعلان تھا، مگر مغرب سے کچھ پہلے نماز جنازہ ہوئی، الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے سربراہ اعلیٰ عزیز ملت حضرت مولانا شاہ عبد الحفیظ مدظلہ العالی نے نماز جنازہ پڑھائی، عوام الناس کے علاوہ درجنوں مدارس کے سیکڑوں اساتذہ و طلبہ اور دیگر علما و مشائخ اور اہم شخصیات نے نماز جنازہ میں شرکت کی ٹھیک غروب آفتاب کے وقت علم و فضل کا یہ آفتاب عالم تاب غروب ہو گیا، اور ہزاروں سوگواروں نے فاتحہ پڑھ کر غمناک آنکھوں سے اپنے محبوب دینی رہنما کو الوداع کہا۔

الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی، الجامعۃ الاسلامیہ روناہی، دار العلوم نور الحق چرہ محمد پور، جامعہ حنفیہ بستی، مدرسہ ضیاء العلوم پرانا گورکھ پور، دار العلوم حبیب الرضا گنجی روڈ علاول دیوریا گونڈہ، مدرسہ اشرف العلوم ڈیوہاری بستی، دار العلوم اشاعت الاسلام پرتاول بازار مہراج گنج، دار العلوم حق الاسلام لال گنج بستی اور دار العلوم جائس کے اساتذہ قابل ذکر ہیں، مجھے سنیچر کی صبح انتقال کی خبر اپنے وطن میں ملی اور نو بجے صبح گھوسی سے چل کر ایک بجے دیوگاؤں پہنچ گیا تھا۔

حضرت مولانا اعظمی ۱۹۳۸ء میں اعظم گڑھ کے قصبہ دیوگاؤں میں ایک باثر متوسط خوشحال دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے، آپ کے والد گرامی عالی جناب منیر خان صاحب ایک شریف نہایت دین دار اور علم دوست شخصیت کے مالک انسان تھے، اسی تقاضے سے علمائے کرام سے قریب رہتے

تھے، خاص طور سے حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان سے گہرے نیاز مندانہ تعلقات تھے۔

ابتدائی اور مڈل کلاس کی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی اور ابتدائی فارسی عربی سے لے کر دورۂ حدیث تک کی تعلیم حافظ ملت کی نگرانی میں مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور میں حافظ ملت ،مولانا حافظ عبدالرؤف بلیاوی، مفتی عبدالمنان اعظمی ،مولانا ظفرادیبی اور مولانا شمس الحق گجہوری وغیرہم سے حاصل کی۔

۱۰ر شعبان ۱۳۸۱ھ/ ۱۷ر جنوری ۱۹۶۲ء کو اشرفیہ مبارک پور کے جلسۂ دستار فضیلت کے موقع پر دستار فضیلت سے نوازے گئے، آپ کے رفقائے درس میں خاص طور سے شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی میاں کچھوچھوی شامل ہیں۔

اسی سال شوال کے مہینے میں اپنے مربی اور خصوصی استاذ حضرت حافظ ملت کے حکم پر مدرسہ انوار العلوم جین پورا اعظم گڑھ میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی۔

پھر ۱۹۶۳ء میں دار العلوم تدریس الاسلام بسڈیلہ آگئے، اور ۱۹۷۳ء تک یہاں پر حضرت مولانا اعجاز احمد ادروی صدر المدرسین کے معاون بن کر بڑی محنت اور لگن کے ساتھ تدریس الاسلام کو تعلیمی وتعمیری ترقی دینے میں اہم اور قابل قدر کردار ادا کیا، مولانا اعظمی نے تنظیم وتعمیر اور تعلیم وتدریس کی اپنی ان ساری صلاحیتوں کا کھل کر مظاہرہ کیا، جو قدرت نے انھیں ودیعت کی تھیں، خاص طور سے تدریس الاسلام کا یہ دس سالہ دور عہد زریں کہلانے کے لائق ہے، ان اساتذہ کی محنت ولگن، خلوص وللہیت اور خدمت دین وعلم دین کے بے پناہ جذبے نے تدریس الاسلام کے تعلیمی معیار کو بلند کر کے اس منزل پر پہونچا دیا کہ ہندوستان کے اکابرین ملت اور اساطین علم ومعرفت کو اس کی بہترین تعلیمی کارکردگی پر پورا پورا اطمینان واعتماد ہوگیا، چنانچہ حضرت مفتی اعظم ہند، حضرت حافظ ملت، حضرت سید العلما اور حضرت شمس العلما مصنف ''قانون شریعت'' نے وقتاً فوقتاً اپنے تعلیمی معاینوں میں گرانقدر خیالات کا اظہار فرمایا، اور بہتر تعلیمی رکارڈ ہی کی وجہ سے اس دور میں دار العلوم اشرفیہ مبارک پور میں تدریس الاسلام سے آئے طلبہ کا داخلہ بغیر امتحان ہی کے لے لیا جاتا تھا، اس دور اور اس کے کچھ بعد کے زمانے میں کئی اہم اور انتہائی باصلاحیت طلبہ یہاں زیر تعلیم رہے، جو بعد میں بہت نامور ہوئے، اور

تدریس کی دنیا کے تاجور کہلائے، جن میں حضرت مفتی محمد شبیر حسن صاحب رضوی کا نام نامی بہت نمایاں ہے۔

۱۹۷۳ء تک دار العلوم تدریس الاسلام بسڈیلہ میں تقریباً دس سالہ تدریسی خدمت انجام دینے کے بعد جامعہ امداد العلوم مٹہنا چلے گئے، پھر ۱۹۷۴ء میں مفکر اسلام علامہ قمر الزماں اعظمی مدظلہ العالی نے اپنے قائم کردہ ادارہ الجامعۃ الاسلامیہ روناہی ضلع فیض آباد میں بحیثیت صدر المدرسین بلالیا، اور آپ نے ۱۹۷۴ء سے سرکاری ریٹائرمنٹ ۳۰ رجون ۲۰۰۳ء تک تقریباً تیس سال کا لمبا عرصہ الجامعۃ الاسلامیہ کی تعمیر وترقی میں گزارا، اور ایک معمولی نو خیز ادارے کو اپنی انتھک محنت سے ملک کا صف اول کا تعلیمی ادارہ بنادیا، آپ نے تربیت یافتہ قابل اساتذہ کی ایک اچھی ٹیم جمع کر کے تعلیم وتربیت کا مثالی ماحول پیدا کیا، مولانا اعظمی اپنی اس ٹیم کے ساتھ الجامعۃ الاسلامیہ کی خدمت کے لیے وقف ہوگئے، اور جامعہ کی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، آپ نے کبھی بھی اپنے کو ملازم نہیں سمجھا، بلکہ دین اور علم کا سچا اور وفادار خادم بن کر رات دن ایک کیے رہے، فرض شناسی اور سختی کے ساتھ اصول ومعمول کی پابندی آپ کی عادت تھی، خود بھی اس میں کوئی کمی کوتاہی اور سستی نہیں کرتے تھے، اور نہ دوسروں کے لیے پسند کرتے تھے۔

حیثیت عرفی کے لحاظ کے ساتھ پوری جرأت اور صاف گوئی سے فرائض میں کوتاہی اور غفلت پر اپنے ماتحتوں کو ٹوک دیا کرتے تھے، اور معزز سے معزز گھرانوں کے طلبہ کو کوتاہی اور قانون شکنی کرنے پر قرار واقعی سزا دیتے تھے، اور کسی بھی سزاوار سزا کو سزا ناگزیر ہونے کی صورت میں معاف نہیں کرتے تھے، اسی اصول پسندی کی وجہ سے اساتذہ وطلبہ پر آپ کا رعب وجلال غالب رہتا تھا، اور چوں کہ آپ خود بھی اصول کے پابند تھے، اور خیر خواہی اور اخلاص وللہیت کے جذبے سے اصلاح کی خاطر ہی یہ سب کچھ کرتے تھے، اس لیے عموماً کم ہی لوگ ناراض ہوتے تھے، یا وقتی طور سے ناراض ہوکر پھر خوش ہوجایا کرتے تھے۔

طلبہ کی اصلاح وتربیت پر خصوصی نگاہ اور نظم وضبط کی پابندی کا خاص خیال رکھتے تھے، اور کسی رورعایت کے قائل نہیں تھے، انھیں خوبیوں کی وجہ سے مدارس کی دنیا میں مولانا اعظمی مثالی صدر مدرس بن کر ابھرے۔

حد درجہ وعدے کے سچے اور بات کے پکے تھے، جو بات کہہ دی، وہ ضرور کرتے تھے، جو وعدہ کرلیا، وہ بہر حال پورا کرتے تھے، چاہے اس کے لیے بظاہر وقتی طور سے کتنا ہی نقصان یا تکلیف اٹھانی پڑے، ان ساری خوبیوں میں مولانا اعظمی ضرب المثل سمجھے جاتے تھے۔

حسب موقع اور حسب حیثیت اپنے اسٹاف اور طلبہ پر شفقت و مہربانی اور نوازش بھی فرماتے تھے، دل میں سخاوت و مہمان نوازی کا جذبہ بھی تھا، طلبہ کی مالی امداد اور مشکل میں ان کے کام آنا بھی آپ کا ایک نمایاں وصف ہے، لالچ اور ہوس سے بہت دور تھے، مادی منفعت کے لیے اپنی حیثیت سے کبھی نیچے نہیں اترے، نہ کسی کی چاپلوسی کی۔ فرق مراتب کا لحاظ بھی بہت کرتے تھے، مگر اپنی حیثیت عرفی کا سودا بھی نہیں کرتے تھے، مولانا اعظمی انتہائی غیور و بے باک انسان تھے۔

چھوٹوں پر شفقت کے ساتھ بڑوں کا احترام کرنا بھی خوب جانتے تھے، اپنے بڑے بزرگوں سے انتہائی عقیدت و محبت رکھتے تھے، بزرگان دین کے عاشق تھے، خاص طور سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے غایت درجہ عقیدت تھی، ہر سال عرس رضوی میں خصوصی بس لے کر اپنے طلبہ کے ساتھ بریلی شریف حاضر ہوتے تھے، حضرت مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ سے شرف بیعت رکھتے تھے، اور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے مخلص پروردہ عزیز شاگرد تھے، ان دونوں بزرگوں کے بھی بے حد معتقد تھے۔

قومی اور جماعتی کاموں سے بھی یک گونہ دلچسپی تھی، بہت سے مدارس کو قانونی و دفتری امور میں تعاون دیتے تھے، بے شمار مدارس کو عربی فارسی بورڈ سے ملحق کرایا، اور گرانٹ لسٹ پر لانے میں مشاورتی اور عملی جدوجہد فرمائی، اور اپنے اثر سے بہت سے اساتذہ کو روزگار اور نوکری دلوائی، اس لیے درجنوں مدارس نے آپ کو اپنا سرپرست اور نگراں بنالیا تھا۔

آج سے تیس سال پہلے جب مدارس کے اساتذہ و ملازمین اور مدارس کی فلاح و بہبود اور ان کے حقوق و مفادات کی لڑائی لڑنے کے لیے حضرت مولانا محمد حنیف قادری علیہ الرحمہ کی قیادت میں ٹیچرس ایسوسی ایشن مدارس عربیہ اتر پردیش کی داغ بیل ڈالی گئی تو آپ نے بھی ان کے شانہ بشانہ قائدانہ رول ادا کیا، اس سلسلے میں بھی آپ کی مخلصانہ اور قائدانہ خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، آپ

اس تنظیم کے بانی ممبر ہیں اور عرصے تک نائب صدر کے عہدے پر فائز رہے، اخیر میں آپ کو سرپرست کا درجہ حاصل ہوگیا تھا، آپ کی بہترین تعلیمی کارکردگی کی وجہ سے حکومت ہند نے چند سال قبل صدر جمہوریہ ایوارڈ سے بھی نوازا تھا۔

۲۹ ربیع الآخر ۱۴۲۴ھ/ ۳۰ جون ۲۰۰۳ء کو الجامعۃ الاسلامیہ روناہی کی سرکاری تدریسی خدمات سے ریٹائر ہوئے، لیکن آپ کی طبع غیور اتنی لمبی مخلصانہ خدمات کے باوجود پرائیویٹ طور سے یہاں رہنے کے لیے آپ کو آمادہ نہ کرسکی اور آپ نے باچشم نم روناہی کو الوداع کہہ دیا، لیکن تعلقات کی خوشگواری میں کوئی فرق نہیں آیا، برابر آتے جاتے تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ دن گھر رہنے کے بعد ضیاء الاسلام ہوڑہ چلے گئے، مگر کلکتہ راس نہیں آیا، پھر سال بھر دارالعلوم جائس میں رہے، اس کے بعد ۲۰۰۶ء میں شہر بستی کے مشہور تعلیمی ادارہ جامعہ حنفیہ رحمت گنج کے سکریٹری عالی جناب امیر اللہ صاحب عزیزی اعزازی پرنسپل اور سرپرست بنا کر اپنے ادارے میں لائے، اور پوری دلجمعی کے ساتھ آپ نے شعبۂ تعلیم وتربیت کے ساتھ انتظام وانصرام، رابطۂ عامہ، تبلیغ اور مالیات کی فراہمی کے شعبے بھی سنبھال لیے، اور مختصری مدت میں تمام شعبوں میں اپنے اخلاص ولگن اور محنت وجانفشانی سے نمایاں کامیابی حاصل کرلی، اور مدرسے اور شہر والوں کو اپنی خدمات سے بہت جلدی خوش اور مطمئن کردیا، آپ کے وصال کے بعد ارباب ادارہ فکرمند ہیں کہ اب کیا ہوگا؟

آپ نے جامعہ حنفیہ کے کیمپس میں زیر تعلیم عظیم الشان حافظ ملت جامع مسجد کے رکے ہوئے تعمیری کام کو بھی پھر سے جاری کرایا، اور مالیات کی فراہمی میں خصوصی دلچسپی لے کر پایۂ تکمیل تک پہونچانے کا عزم مصمم کرلیا تھا، تیزی سے کام جاری تھا، خود ہی مالیات بھی فراہم کرتے تھے اور صبح وشام تعمیری کام کی نگرانی بھی فرماتے تھے، حساب وکتاب بھی خود ہی رکھتے تھے، زندگی کے آخری دن مزدوروں اور مستریوں سے فرمایا کہ اب مرنے کی بھی فرصت نہیں ملے گی، برابر کام جاری رکھنا ہے، جن لوگوں نے رقم دینے کا وعدہ کیا ہے، میں ان سے فون پر کہتا ہوں کہ وہ سب لوگ بلا تاخیر اپنی اپنی رقمیں بھیج دیں، لیکن: ع

کیا پتہ تھا موت کا یوں حادثہ ہو جائے گا

آپ شاعری بھی فرماتے تھے، نازؔ تخلص تھا، ۲۰۰۵ء میں اہلیہ کے ساتھ حرمین شریفین کی زیارت اور حج کی سعادت بھی پائی تھی۔

پسماندگان میں اہلیہ محترمہ اور ۶ رصاحبزادگان جمشید، تبریز، ضوریز، ہنگریز، مولانا نوخیز انوار اور حافظ شمشیر انوار باحیات ہیں، جن میں تین شادی شدہ ہیں۔ آخر الذکر جامعہ حنفیہ میں درجۂ ثانیہ میں زیر تعلیم ہیں۔ [پیامِ حرم اپریل ۲۰۰۸ء]

NISHANE MANZIL

المجمع النورانی کی نئی مطبوعات

برکات زمزم

احادیث وآثار صحابہ اور بزرگان دین کے فرمودات کی روشنی میں آب زمزم کے گوناگوں فضائل وبرکات، اطبا کے تجربات ومشاہدات اور سائنسی انکشافات واکتشافات پر مشتمل ایک نادر ونایاب کتاب، جو علما، طلبہ اور عوام کے لیے یکساں مفید ہے۔ صفحات:88۔ مصنف: مولانا غلام نبی علیمی۔ قیمت:40

بزرگوں کے اخلاق

ماہنامہ پیام حرم ''احسان وسلوک'' کے کالم میں شائع شدہ تحریروں کا حسین گلدستہ، جس کو پڑھ کر ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے، یہ کتاب خطبا اور ائمۂ مساجد اور عام مسلمانوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ صفحات:74۔ مصنف: مولانا محب احمد علیمی۔ قیمت:35

ALMAJMA-UL-NOORANI

Darul Uloom Alimia Jamda Shahi Distt. Basti (U.P.)